باغ و بہار

میر امن دہلوی

باغ و بہار

بابائے اُردو مولوی عبدالحق سیریز : ۲ع

باغ و بہار

میر اَمّن دہلوی

مُرتّب

رشید حسن خاں

انجمن ترقّیِ اُردو (ہند)، نئی دلّی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۵۹۴

سنِ اشاعت : 2015
اشاعت : .... دوم

بہ اہتمام : .... اختر زماں
سرورق : .... محمد ساجد
طباعت : .... ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی

BAGH-O BAHAR
by : Rasheed Hasan Khan
Price : 150.00
2015

ISBN : 81-7160-151-0

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar :Urdu Ghar Marg, 212, Rouse Avenue,
New Delhi-110002

Phone : 0091-11-23237212 - 23237214

اُردو میں تدوین کے مُعلّمِ اوّل

مولانا امتیاز علی خاں عَرشی (مرحوم)

کی یاد میں

جن کی شفقت بھری باتوں، پُرخلوص تنبیہوں اور
مثالی تحریروں سے میں نے تدوین کے آداب سیکھے ہیں۔
ذرّۂ آفتابِ تابانیم

فہرست

○ حرفِ آغاز

○ مقدمۂ مرتب ۱۳-۱۳۶

○ باغ و بہار کا متن :

○ نقل عرضی کی ۲

○ دیباچہ ۳

○ شروع قصے کا ۱۰

○ سیر پہلے درویش کی ۲۰

○ سیر دوسرے درویش کی ۶۸

○ سرگذشت آزاد بخت بادشاہ کی ۱۱۴

○ سیر تیسرے درویش کی ۱۹۴

○ چوتھے درویش کی سیر ۲۱۸

○ اختتام ۲۴۹

حرفِ آغاز

اُردو کی مختصر داستانوں میں جو شہرت اور مقبولیت میر امّن کی باغ و بہار کو حاصل ہوئی، وہ کسی اور داستانی قصّے کو نصیب نہیں ہوئی۔ کم و بیش ایک سو نوّے سال سے یہ کتاب مختلف سطحوں کے تعلیمی نصابات میں شامل رہی ہے، اِس لیے اب تک بلا مبالغہ یہ سیکڑوں بار چھپ چکی ہے اور نقل در نقل کی وجہ سے ہر نئی پرنٹ کے متن میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں، کیوں کہ ہر مشہور اور بار بار چھپنے والی کتاب کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ باغ و بہار کی اہمیت ہر زمانے میں تسلیم کی گئی، اِس کے باوجود کسی متنی نقّاد کو اِس کے متن کا تنقیدی اڈیشن تیّار کرنے کا خیال نہیں آیا۔ ہاں کئی حضرات نے باغ و بہار کو اِس طرح ضرور شائع کیا کہ متن کے بجائے مقدّمے پر زور دیا، قصّے کے مآخذ کی نشان دہی کی یا تنقیدی راے کا اظہار کیا۔

باغ و بہار کا پہلا تنقیدی اڈیشن رشید حسن خاں صاحب نے تیّار کیا تھا، جو مکتبۂ جامعہ دہلی کے سلسلۂ "معیاری ادب" کے تحت ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اِس کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ [ہندستان، پاکستان اور روس کی مختلف یونی ورسٹیوں کے نصابوں میں اِسے شامل کر لیا گیا]۔ اہلِ نظر نے اِس اڈیشن کی بہت تعریف کی؛ لیکن خُدا کا شکر ہے کہ خاں صاحب اپنے اِس کام سے خود مطمئن نہیں تھے، کیوں کہ اِس اڈیشن کی تیّاری کے دوران اُنھیں احساس ہو گیا تھا کہ باغ و بہار کا سائنٹی فک انداز میں تنقیدی اڈیشن تیّار کرنا بہت محنت طلب ہے اور اِس کام کی تکمیل کے لیے کئی سال کی مدّت درکار ہے۔ اُنھوں نے ۱۹۶۴ء ہی سے اِس کام کا ڈول ڈال دیا اور اہم اڈیشنوں کی تلاش شروع کر دی۔ پندرہ بیس سال کی مدّت میں اُنھیں باغ و بہار کی وہ خطّی اور مطبوعہ روایتیں مل گئیں جنھیں ترتیبِ متن کے لحاظ سے بُنیادی حیثیت حاصل تھی۔

باغ و بہار کے ۱۰۲ صفحوں کا متن پہلی بار ۱۸۰۲ء میں ہندی مینول میں شائع ہوا تھا،

مگر وہ ہے کہاں ؛ یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی۔ اِس کا مکمّل اڈیشن ۱۸۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اِن دونوں روایتوں کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے اِس کی اُس پہلی خطّی روایت کو بھی تلاش کر لیا جس پر میر امّن نے نظرِ ثانی کی تھی اور جس کا اُس وقت تک کسی کو علم نہیں تھا۔ اِن کے علاوہ ڈنکن فاربس اور مولوی عبدالحق کے مرتبہ اڈیشن بھی خاں صاحب کے پیشِ نظر رہے۔

رشید حسن خاں صاحب متنی تنقید کے فن کے ماہر ہیں۔ اُنھوں نے اِس فن کے مختلف پہلوؤں پر خاصی تعداد میں مضامین لکھے ہیں، جو کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ خاں صاحب نے کئی کلاسیکی متون مرتب کیے ہیں، لیکن اِس میدان میں اُن کا پہلا معرکہ آرا کارنامہ فسانۂ عجائب کا وہ تنقیدی اڈیشن ہے جسے ۱۹۹۰ء میں انجمن ترقّیِ اُردو (ہند) نے شائع کیا تھا اور اب اُن کا دوسرا اہم کام باغ و بہار کا زیرِ نظر تنقیدی اڈیشن ہے۔ فسانۂ عجائب کی طرح اِس کا متن بھی انتہائی سائنٹی فک انداز میں مرتّب کیا گیا ہے۔ اِس میں متنی تنقید کے طریقۂ کار کے تمام اصولوں اور ضابطوں کی پابندی کی گئی ہے۔ حواشی میں متن سے متعلق تشریحی اور لسانی پہلوؤں سے بحث کی ہے، اشخاص، مقامات وغیرہ پر وضاحتی نوٹ لکھے ہیں۔ بھرپور مقدّمہ لکھا ہے، جس میں زیرِ نظر متن کے تنقیدی اڈیشن کے سلسلے میں اپنے طریقۂ کار کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں "صاحبانِ انگریز" کو اُردو پڑھانے کے لیے جو نصابی کتابیں تیّار کی گئیں، اُن کے متن کے لیے گل کرسٹ نے املا کا ایک باقاعدہ نظام تیّار کیا تھا اور متن میں اعراب، علامات اور رموزِ اوقاف کا اِس انداز سے التزام کیا تھا کہ پڑھنے والا لفظوں کا تلفّظ صحیح طور پر کر سکے اور عبارت کو پڑھنے میں غلطی نہ ہو۔ خاں صاحب نے اِس متن میں اُن تمام التزامات کو ملحوظ رکھا ہے۔ باغ و بہار کے متن میں ایسے الفاظ کی تعداد خاصی ہے جن کی املا ہمارے زمانے میں بدل گئی ہے یا تلفّظ میں تبدیلی آگئی ہے، یا وہ اب نامانوس ہیں؛ ایک مفصّل ضمیمے میں ایسے الفاظ پر وضاحتی حواشی لکھے ہیں۔

ہم کو میر امّن کی زندگی کے حالات کا بہت کم علم ہے، اِس لیے اِس موضوع پر

چند مضامین ہی لکھے گئے اور اُن میں بھی میر امّن کے نام اور تخلص سے لے کر تاریخِ وفات تک بہت سی باتیں درست نہیں۔

خاں صاحب، میر امّن کے سوانحی حالات میں کوئی اہم اضافہ تو نہیں کر سکے، لیکن اب تک جو حالات پیش کیے گئے تھے، خاں صاحب نے اُن کا محقّقانہ جائزہ لے کر، کئی مفروضات کی تردید کی ہے اور صحیح صورتِ حال کی نشان دہی کی ہے۔

غرض خاں صاحب نے غیر معمولی محنت، دیدہ ریزی اور اِس فن میں اپنی مہارت سے کام لے کر باغ و بہار کا ایسا اڈیشن تیار کیا ہے، جو اُردو میں متنی تنقید کا ایک مثالی اور قابلِ تقلید نمونہ بن گیا ہے۔

جنرل سکریٹری
انجمن ترقی اردو (ہند)

مُقدّمہ

باغ و بہار کو جدید اُردو نثر کا پہلا صحیفہ کہا جائے، تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ فورٹ ولیم کالج خواہ کسی مقصد کے تحت قائم کیا گیا ہو؛ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ تصنیف و تالیف کا ایسا مرکز بن گیا تھا جس کے اثرات اُردو زبان کی ترقّی کے سلسلے میں دور رس اور دیرپا ثابت ہوئے۔ فورٹ ولیم کالج کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اُردو میں باضابطہ تصنیف و تالیف کا پہلا ادارہ تھا، جہاں پہلی بار نئے لسانی، ادبی اور نصابی تصوّرات کا نقش درست ہوا تھا۔ یہ تصوّرات عملی صورت میں بڑے پیمانے پر کارفرما ہوئے تھے اور بہت جلد اِن کے نتائج سامنے آنے لگے تھے ـــــــ اِسی طرح اِس ادارے میں اُردو کی کتابیں کسی بھی غرض اور کسی بھی نقطۂ نظر کے تحت لکھوائی گئی ہوں؛ مگر یہ حقیقت ہے کہ جدید اُردو نثر اور نئے لسانی شعور کے فروغ میں اُن کی حیثیت بُنیادی رہی ہے اور یہ حیثیت تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔

اِس ادارے سے اُردو کی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں، جنھوں نے ایک طرف تو جدید نصابی ضرورتوں کے تصوّر کو ذہنوں میں روشن کیا اور دوسری طرف زبان کے نئے انداز اور بیان کے نئے اُسلوب کی نقش گری کی۔ اِن کتابوں نے کم و بیش کی نسبت کے ساتھ شہرت بھی پائی؛ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ میرامّن کی باغ و بہار کو سب سے زیادہ شہرت ملی اور سب سے بڑھ کر قبولِ عام نصیب ہوا۔ اِس میں بہت زیادہ دخل اِس بات کو تھا کہ میرامّن کی نثر نے روزمرّہ اور محاورۂ اہلِ زبان کی قدر و قیمت کو واضح کیا، بیان میں سادگی اور

صفائی کی ناگزیر ضرورت کا احساس دلایا؛ لیکن اِس سے بھی بڑھ کر یہ کہ چلن کی اہمیت کو روشن کیا۔ اِس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اِس کتاب نے زبان اور بیان کے نئے شعور کو سب سے زیادہ فروغ بخشا۔ ضمنی طور پر یہ بات بھی کسی نہ کسی حد تک قابلِ ذکر ہے کہ یہ کتاب شائع ہوتے ہی نصابِ تعلیم کا حصّہ بن گئی تھی اور آج کے دن تک اِس شرف سے محروم نہیں ہو پائی ہے۔

باغ و بہار مکمل صورت میں پہلی بار ۱۸۰۴ء میں کلکتے کے "ہندوستانی چھاپا خانہ" میں طبع ہوئی تھی۔ اِس نسخے کا مفصّل تعارف تو آگے آئے گا، یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ اُس پہلی اشاعت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں، گِل کرسٹ کے مجوّزہ طریقۂ کار کے مطابق، اکثر الفاظ پر اعراب لگائے گئے ہیں، نیز رُموزِ اوقاف اور علامات کو بھی شاملِ عبارت رکھا گیا ہے۔ بعد کی اشاعتوں میں یہ التزامات کم ہوتے گئے، یہاں تک کہ کُلّیتاً ختم ہو گئے۔ ہمارے زمانے میں اِس کتاب کے جس قدر اڈیشن سامنے آئے ہیں، اُن میں ایسا کوئی التزام نظر نہیں آتا۔

گِل کرسٹ نے اعراب اور علامات کو فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں اِس لیے شامل کیا تھا کہ اُس کو خوب معلوم تھا کہ اِن التزامات کے بغیر اُس کے طالبِ علم کسی بھی متن کو صحیح طور پر نہیں پڑھ پائیں گے ــــــــ اُنیسویں صدی کے آغاز میں گِل کرسٹ کے سامنے جو صورتِ حال تھی، بیسویں صدی کے اختتام کے قریب ہمارے زمانے میں ویسی ہی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کا نتیجہ کہیے یا اِسے حالات کے جبر سے تعبیر کیجیے، اب ہمارے طالبِ علم (اور بہت سے اساتذہ بھی) اُن التزامات کے بغیر بہت سے کلاسکی نصابی متنوں کو صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتے۔ دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں کچھ فاصلہ نہیں رہا ہے۔ اِس لیے بھی یہ ضروری تھا کہ اِس کلاسکی نصابی متن کو اِس طرح مرتّب کیا جائے کہ اشاعتِ اوّل کے انداز پر وہ سب التزامات شاملِ متن ہوں ــــــــ ہماری ضرورت کے علاوہ، اصولِ تدوین کے لحاظ سے بھی یہ عمل یوں ضروری ہے کہ اِس کے بغیر اِس کتاب کے متن کو منشائے مصنّف

کے مطابق پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اشاعتِ اوّل کا متن ہمارے سامنے ہے؛ اب اگر اِس کتاب کو اِس طرح چھاپ دیا جائے کہ اشاعتِ اوّل کی اہم خصوصیات شاملِ متن نہ ہوں، تو اِس طریقۂ کار کو واضح طور پر اصولِ تدوین کی خلاف ورزی کہا جائے گا۔

میر امّن کی دوسری کتاب گنجِ خوبی کا مکمّل خطّی نسخہ، میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے؛ اِس نسخے میں بھی میر امّن نے گل کرسٹ کے مقرّر کردہ نظامِ املا کو ملحوظ رکھا ہے اور اکثر و بیش تر معروف و مجہول آوازوں کے لیے علامات کی پابندی بھی کی ہے، اور اِس سے مصنّف کا اختیار کیا ہوا طریقۂ کار ہمارے سامنے آجاتا ہے اور یوں اُس طریقۂ کار سے صرفِ نظر کو کسی طرح مناسب نہیں کہا جاسکتا؛ بل کہ اُس طریقۂ کار کی پابندی کو لازم قرار دیا جائے گا۔

○

حکومتِ جموّں کشمیر کے مالی تعاون سے مکتبۂ جامعہ (نئی دہلی) نے "معیاری ادب" کے نام سے مشہور کلاسکی متنوں کو چھاپنے کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ صحیح متن، کم سے کم قیمت پر، بہتر طباعت کے ساتھ طالب علموں کے لیے مہیّا کیے جاسکیں۔ اِس سلسلے کی کتابیں محدود مقاصد کے تحت تیّار کرائی گئی تھیں۔ ضخامت کو کم سے کم رکھنے کے لیے یہ طریقہ بھی اپنایا گیا تھا کہ مرتّبِ متن کا مقدّمہ دو چار صفحوں سے زیادہ نہ ہو۔ باغ و بہار بھی اِس سلسلے کی کتابوں کی فہرست میں شامل تھی۔ ۱۹۶۳ء کے اوائل میں اُس کو مرتّب کرنے کی ذمّے داری مجھے سونپی گئی تھی۔ ۱۹۶۴ء میں یہ اڈیشن پہلی بار شائع ہوا تھا۔ اُسی وقت یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی تھی کہ یہ ناتمام کام ہے اور یہ کہ اِس کتاب کی تدوین آسان کام نہیں۔ یہ بہت بڑی ذمّے داری ہے اور بہت صبر آزما کام ہے۔ اِس میں کئی مہینے نہیں، کئی سال صرف ہوں گے۔ یہ بات بھی اُنھی دنوں سمجھ میں آگئی تھی کہ اِس کتاب کی اشاعتِ اوّل [ہندوستانی چھاپاخانہ، کلکتہ، سالِ طبع: ۱۸۰۴ء] سے پہلے کی ایک مطبوعہ روایت [مشمولۂ ہندی مینول، سالِ طبع: ۱۸۰۲ء] کو تلاش کرنا ازبس ضروری ہے۔ اُس کی بازیافت کے بغیر تدوین کا کام ادھورا رہے گا۔

یہ بات تو مجھے معلوم تھی کہ باغ و بہار کے ایک سَو دو صفحے ایک انتخابی مجموعے بندی مینول میں شائع ہوئے تھے؛ مگر مشکل یہ تھی کہ یہ بات، میری معلومات کے مطابق، کسی کو نہیں معلوم تھی کہ ہندی مینول ہے کہاں۔ عتیق صدیقی مرحوم نے اپنی عمر کا خاصا بڑا حصہ فورٹ ولیم کالج اور گل کرسٹ سے متعلق کاغذات کی چھان بین میں گزار دیا تھا۔ دہلی سے لے کر کلکتے تک وہ بڑے بڑے کتاب خانے دیکھ چکے تھے اور نیشنل آرکائوز، سنٹرل سکریٹیریٹ اور نیشنل میوزیم جیسے مقامات پر محفوظ ذخیروں کو بھی کھنگال چکے تھے؛ لیکن وہ مرحوم بھی اِس انتخابی مجموعے کی تلاش میں کام یاب نہیں ہو سکے تھے۔ اِس مجموعے سے متعلق کچھ تفصیلات اُنھوں نے اپنی قابلِ قدر کتاب گل کرسٹ اور اُس کا عہد میں بعض دوسرے مآخذ کی مدد سے فراہم کر دی تھیں، مجھے بھی مرحوم کی اِسی کتاب سے اِس مجموعے کے وجود کا علم ہوا تھا؛ مگر یہ دل چسپ بات تھی کہ خود وہ مجموعہ "دختِ افراسیاب" بن کر رہ گیا تھا۔ عتیق صدیقی مرحوم کے بعد اِس سلسلے میں جن لوگوں نے (مضامین یا کتابوں کی صورت میں) کچھ لکھا، وہ سب مرحوم کی تحریر پر کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں کر سکے، یوں کہ پچھلے حوالوں کو دُہرا دینے کے عمل کی تکرار ہوتی رہی۔ یہاں یہ وضاحت کر دی جائے کہ پچھلے حوالوں کو دُہرانا بجائے خود کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ بہت سے مآخذ کے سلسلے میں ہم سب مجبور ہوتے ہیں کہ پچھلے حوالے یا حوالوں پر اکتفا کریں، اِس بنا پر کہ وہ مآخذ دست یاب نہیں ہوتے؛ لیکن یہ ضروری ہوتا ہے کہ اِس کی صراحت کر دی جائے۔ ہندی مینول کے سلسلے میں عموماً یہ ہوا کہ اِس کا حوالہ دینے والوں نے اِس صراحت کی ضرورت نہیں سمجھی کہ یہ کتاب دست یاب نہیں اور اِس سے متعلق جو کچھ لکھا جا رہا ہے، اُس کا علم دوسرے ذرائع سے ہوا ہے۔

۱۹۶۴ء سے ۱۹۸۴ء تک مسلسل میں اِس فکر میں رہا کہ ہندی مینول کا پتا نشان معلوم کیا جائے؛ کیوں کہ یہ بات میرے نزدیک طے شدہ تھی کہ ایک سَو دو صفحات پر مشتمل اُس روایتِ اوّل کو سامنے رکھے بغیر اِس متن کی تدوین صحیح طور پر ہو ہی نہیں سکتی۔ حُسنِ اتفاق سے ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی [اُستادِ شعبۂ اُردو، جواہر لال نہرو

یونی ورسٹی، نئی دہلی] ایک بہ ظاہر غیر ادبی سلسلے میں لندن جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ میں نے اُن سے تاکید کر دی تھی کہ وہاں کے معروف اور کم معروف کتابی ذخیروں میں اِس مجموعے کو ضرور تلاش کریں۔ قدوائی صاحب نے خود بھی گل کرسٹ کی ادبی خدمات پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے مقالہ لکھا تھا، یوں اُنھیں بہت سی تفصیلات کا علم تھا اور وہ خود بھی اِس مجموعے کو دیکھنا چاہتے تھے۔ واپس آکر اُنھوں نے یہ خوش خبری سُنائی کہ ہندی مینول مل گیا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کس قدر مسرت ہوئی تھی۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ بعض مجبوریوں کی بنا پر اُس کا عکس اپنے ساتھ نہیں لا سکے ہیں، مگر اِس کا انتظام کر آئے ہیں کہ وہ عکس یہاں آجائے۔ سال بھر سے زیادہ مدت گزر گئی اور عکس نہیں آیا۔ قدوائی صاحب اچھے دوست ہیں، مخلص اور غم گسار ہیں؛ لیکن پرانے شرفاے کرام کی طرح کاہلی اور بے پروائی میں بھی کسی سے کم نہیں۔ سونے میں سہاگا یہ کہ اُنھوں نے لندن میں جن صاحب سے عکس بھیجنے کی فرمایش کی تھی، وہ صاحب اِن لوازمِ تہذیبِ اشرافیہ میں موصوف کے شریکِ غالب نکلے اور میں نے یہ خیال کیا کہ "آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا" والی مثل صادق آنے لگی ہے۔

اب خدا کا کرنا یہ ہوا کہ بمبئی یونی ورسٹی کے ایک سمینار میں شرکت کرنا پڑی اور وہاں ڈاکٹر عبدالستار دلوی (صدرِ شعبۂ اُردو، بمبئی یونی ورسٹی) کے گھر پر اُن کے برادرِ بزرگ محمد قاسم دلوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بات چیت سے اندازہ یہ ہوا کہ آدمی مہذب بھی ہیں اور معقول بھی، یہ بھی معلوم ہوا کہ لندن میں رہتے ہیں۔ مجھے تو اُسی کتاب کی لو لگی ہوئی تھی، سارے تکلفات کو بالاے طاق رکھ کر میں نے اُن سے کہا کہ مجھے فلاں کتاب کے عکس کی ضرورت ہے۔ قاسم صاحب نے فوری طور پر وعدہ کر لیا۔ جی تو بہت خوش ہوا، مگر ساتھ ہی یہ وسوسہ بھی دل میں پیدا ہوا کہ جو وعدہ فوراً کر لیا جاتا ہے، یوں دیکھا گیا ہے کہ اکثر وہ پورا نہیں ہوتا۔ مہینا بھر کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ لندن سے ایک پارسل چلا آرہا ہے جس میں ہندی مینول میں شائع شدہ باغ و بہار کے ایک نسخے دو صفحات کا عکس لپٹا ہوا ہے۔ جیسی حیرت آمیز مسرت مجھے اُس وقت

ہوئی تھی، ویسی مسرّت سے زندگی میں بہت کم دوچار ہوا ہوں۔ بیس اکیس سال کے انتظار اور تلاش کے بعد یہ عکس آنکھوں کے سامنے آیا تھا۔

اب جو ہندی مینول میں شامل ۱۰۲ صفحات کا طبعِ اوّل کے صفحات سے مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ جگہ جگہ جملے بدلے ہوئے ہیں، لفظ بدلے ہوئے ہیں اور بعض مقامات پر عبارتیں بھی بدلی ہوئی ہیں۔ اِس کا سیدھا سا مطلب یہ تھا کہ میر امّن نے جب پہلی بار اِس کتاب کو لکھا ہے، تو عبارت کا انداز بہت سے مقامات پر طبعِ اوّل (یعنی موخّر روایت) سے مختلف تھا۔ اِس بات کو زیادہ مناسب طور پر اور صحیح طور پر اِس طرح کہنا چاہیے کہ دوسری بار جب یہ کتاب چھپنے کے لیے گئی ہے (۱۸۰۴ء میں جس کی طباعت مکمل ہوئی تھی) تو اُس وقت اُس روایتِ اوّل پر، جس کے ۱۰۲ صفحے ہندی مینول میں شامل ہیں، میر امّن نے پورے طور پر نظرِ ثانی کی تھی۔

اِس مرحلے پر یہ بات ذہن میں آئی کہ ہندی مینول میں اگرچہ باغ و بہار کے ۱۰۲ صفحے چھپے تھے، لیکن سارے قرائن اِس پر دلالت کرتے ہیں کہ میر امّن نے ۱۸۰۱ء کے اواخر میں، یعنی ہندی مینول کی ترتیب سے پہلے اِس کتاب کو مکمل کر لیا تھا، یہ الگ بات ہے کہ ایک مجبوری کی بنا پر، جس کی تفصیل عتیق صدیقی کی محوّلہ بالا کتاب میں موجود ہے، چھپے صرف ۱۰۲ صفحے؛ اِس صورت میں اِس کتاب کی اُس روایت کو مکمل صورت میں کہیں تو ہونا ہی چاہیے۔ میری تلاش سے زیادہ اِس میں محض اتّفاق کو دخل تھا (بل کہ حُسنِ اتّفاق کو) کہ یہ معلوم ہوا کہ لندن ہی میں باغ و بہار کی اُس روایتِ اوّل کا مکمل خطّی نسخہ محفوظ ہے۔ نیت درست تھی تو منزل یوں آسان ہوئی کہ اُس خطّی نسخے کا عکس بھی فوری طور پر مل گیا۔ ہندی مینول کے مطبوعہ صفحات سے جب اِس خطّی نسخے کے صفحات کا مقابلہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ واقعتاً یہ وہی روایتِ اوّل ہے جس کی تلاش تھی۔

اِس کے بعد مشہور مستشرق ڈنکن فاربس کے مرتّب کیے ہوئے نسخۂ باغ و بہار کے پہلے اڈیشن کی تلاش شروع ہوئی۔ یہ ۱۸۴۶ء میں لندن میں چھپا تھا۔ اِس نسخے

کا چوتھا اڈیشن (مطبوعۂ ۱۸۶۰ء، لندن) میری نظر سے گزر چکا تھا۔ "معیاری ادب" کے سلسلے میں باغ و بہار کا جو متن مرتب کیا تھا، اُس وقت اِس چوتھے اڈیشن سے استفادہ کیا تھا؛ مگر پہلا اڈیشن اُس وقت مجھے نہیں مل سکا تھا، جب کہ بُنیادی اہمیت اُسی پہلے اڈیشن کی ہے۔ ذرا سی کوشش سے یہ پہلا اڈیشن بھی ہاتھ آگیا۔ ۱۸۰۴ء کا چھپا ہوا نسخہ (جو باغ و بہار کا پہلا مطبوعہ اڈیشن ہے) پہلے ہی سے موجود تھا۔ اِس طرح سب ضروری نسخے جمع ہو گئے اور ۱۹۶۴ء میں جس کام کو مکمل کرنے کی خواہش دل میں پیدا ہوئی تھی اور ارادہ کیا تھا، اب جاکر اُس کی تکمیل کا سر و ساماں مہیّا ہوا۔ اِس طویل مدت میں اِس کام کو مکمل کرنے کا جذبہ کبھی مدھم نہیں پڑا؛ مگر آدابِ تدوین کے احترام نے ناروا عجلت کے احساس کو کبھی کارفرما نہیں ہونے دیا، اصولِ تحقیق پر ایمان نے بے ایمانی کی پیدا کی ہوئی قناعت پسندی کو ذہن پر اثر نہیں ڈالنے دیا اور نشاطِ کار کا ایسا احساس کبھی ذہن پر حاوی نہیں ہو سکا جس سے ہوس کے تقاضوں کو آب و رنگ ملتا ہے۔ احباب نے بے جا مشکل پسندی کے بہت طعنے دیے، لیکن ایسا کوئی جملہ بھی کارگر نہیں ہو سکا۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل (۱۸۰۴ء) کا متن اعراب، علامات اور رموزِ اوقاف کی شمولیت کے ساتھ چھپا ہے۔ یہی صورت ہندی مینول میں شامل ۲۰۱ صفحات کی ہے۔ اِس طرح یہ لازم ٹھہرا کہ اِس متن کو اب جو مرتب کیا جائے، تو اُس میں بھی بُنیادی نسخے کے التزامات کو برقرار رکھا جائے؛ یعنی ضروری الفاظ کو اعراب سے خالی نہ رکھا جائے۔ معروف و مجہول اور غنّہ آوازوں کے لیے علامات کو بھی شامل کیا جائے اور رموزِ اوقاف کو بھی شامل رکھا جائے۔ جب اِن پابندیوں کی رعایت کے ساتھ تدوین کا کام شروع کیا گیا تو معلوم ہوا کہ بیسیوں لفظ ایسے ہیں جن پر مصنّف کی تحریر کے مطابق اعراب لگائے جائیں تو آج بہت سے طالبِ علم اور بہت سے اساتذہ بھی اُلجھ سکتے ہیں۔ میں صرف ایک مثال سے اِس کی وضاحت کروں گا: اشاعتِ اوّل میں اور ہندی مینول میں بھی مصدر "چِھپنا" اور اُس کے مشتقات میں پہلے حرف کے نیچے ہر جگہ زیر ملتا ہے [یعنی: چِھپنا، چِھپتا ہے وغیرہ]۔ گنج خوبی کا جو مخطوطہ میرا متن کے

ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اُس میں بھی ہر جگہ التزام کے ساتھ میر امّن نے پہلے حرف کے نیچے زیر لگایا ہے۔ آج کل دِلّی والے "چھُپنا" کہتے ہیں [ہاں اہلِ لکھنؤ "چھپنا" کہتے ہیں] ۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال بہت سے لفظوں کے املا کے سلسلے میں سامنے آئی۔ مثلاً اشاعتِ اوّل اور ہندی مینول، دونوں میں بیش تر "اعلا" اور "ادنا" ملتے ہیں، اِسی طرح "مُعلاّ"۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی میر امّن نے اپنے قلم سے ہر جگہ اِن لفظوں کو اِسی طرح لکھا ہے۔ اِسی طرح مثلاً "جمیرات" (جمعرات)، "مزاخ" (مذاق) اور اِس کی جمع "مزاخیں"۔ اِس لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ایسے سب مقامات پر تلفّظ اور املا سے متعلق وضاحتی حواشی لکھے جائیں، جن میں ضروری تفصیل کے ساتھ یہ بتایا جائے کہ فُلاں لفظ پر جو اعراب لگائے گئے ہیں، یا جو املا اختیار کیا گیا ہے، اُس کی وجہ کیا ہے۔ اِس طرح تلفّظ اور املا سے متعلق پورا ایک ضمیمہ مرتّب ہو گیا۔ یہ بیان تفصیل طلب ہے، "طریقِ کار" کے عنوان کے تحت اِس پر مفصّل گفتگو کی جائے گی۔

حدود کا تعیّن :

اِس کتاب کو کس طرح مرتّب کیا گیا ہے، یہاں اِس کی وضاحت کرنا مقصود نہیں، اِس کی تفصیل "طریقِ کار" کے عنوان کے تحت آگے آئے گی؛ مقصد یہ ہے کہ اِس کام کی حدود کا تعیّن کر لیا جائے۔ اِس سلسلے کی پہلی کتاب فسانۂ عجائب تھی، اُس کے مقدّمے میں اِس سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا تھا، مناسب یہ ہو گا کہ اُن مطالب کو یہاں دُہرا دیا جائے۔

تدوین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی متن کو منشاے مصنّف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اِس میں اصل حیثیت صحتِ متن کی ہوتی ہے۔ مصنّف نے آخری بار عبارت کس طرح لکھی تھی، یہ سب سے اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ اِس سلسلے میں یہ بُنیادی بات ضرور ذہن میں رہنا چاہیے کہ عبارت ہو، جملہ ہو یا جملے کا ٹکڑا؛ یہ سب الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ اِس اعتبار سے ہر لفظ کا تعیّن مرتّب کی ذمّے داری میں شامل ہے۔ لفظ مجموعہ ہوتا ہے حرفوں کا، یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر حرف کا تعیّن اِس ذمّے داری میں شامل ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ الفاظ کے تعیّن اور اُن کی صورت نگاری کی صحّتِ متن

میں اصل حیثیت ہوتی ہے۔

کسی کتاب کے مختلف اہم نسخوں کو (اگر وہ موجود ہوں) سامنے رکھنا ازبس ضروری، بل کہ لازم ہے۔ جب بھی مختلف نسخوں کو پیشِ نظر رکھ کر عبارت کی تصحیح کی جائے گی تو بہت سے مسائل پیدا ہوں گے۔ یوں یہ ضروری ہوگا کہ حواشی میں ایسے الفاظ سے متعلق ضروری تفصیلات درج کی جائیں جو کسی بھی لحاظ سے وضاحت طلب ہوں؛ خواہ بہ لحاظِ معنی و مطلب، خواہ بہ لحاظِ املا اور خواہ بہ لحاظِ قواعد۔ بہت سے جملوں کی ترتیب اور معنویت بھی تشریح کی محتاج نظر آئے گی؛ حواشی میں ایسی تشریحات کا شامل کرنا بھی ضروری قرار پائے گا۔

ایسے مفصل حواشی کی ضرورت ایک اور وجہ سے بھی ہوتی ہے۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ بہت سے لفظ متروک ہو جاتے ہیں، یا اُن کی شکل صورت میں کسی طرح کی تبدیلی راہ پالیتی ہے۔ میں صرف ایک مثال سے اِس کی وضاحت کروں گا: باغ و بہار کے قدیم نسخوں میں "گنبذ"[1] (مع ذالِ منقوطہ) ہے اور جدید نسخوں میں "گنبد" (مع دالِ مہملہ) ملتا ہے؛ اب "گنبذ" مستعمل نہیں رہا، اِس وجہ سے نئے مرتبین کی نظر نے کوتاہی کی۔

افعال کی کچھ شکلیں بھی اِسی ذیل میں آتی ہیں۔ اِس کی بھی یہاں میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ اِس کتاب میں ص ۱۳۷ پر ایک جملہ یوں ہے: "سب سرکاروں میں جو تحفہ چاہیتا، میری ہی دکان سے جاتا۔" طبعِ اوّل (۱۸۰۴ء) میں یہ جملہ اِسی طرح ہے، لیکن بعد کے نسخوں میں "چاہیتا"، "چاہتا" بن گیا ہے، اِس لیے کہ "چاہیتا" اب غیر مانوس شکل ہے اور "چاہتا" مستعمل اور متعارف صورت[2] ہے۔

کچھ جملوں کی ترتیب میں بھی اب اجنبی پن محسوس ہوتا ہے، اور نقل در نقل کے نتیجے میں یا کسی اور وجہ سے بعض قدیم جملے، جدید شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ محض وضاحت کے خیال سے

---

[1] اِس کتاب میں یہ لفظ ص ۱۰۳ پر آیا ہے۔ ضمیمۂ تلفظ و املا میں (ص ۵۶۰ پر) اِس پر گفتگو کی گئی ہے۔

[2] اِس لفظ سے متعلق دیکھیے ضمیمۂ تشریحات، ص ۴۴۱، حاشیہ ۷۔ فعل کی یہ شکل میرامّن کی دوسری کتاب گنجِ خوبی میں بھی ملتی ہے، اُس کے مخطوطے میں میرامّن نے اپنے قلم سے "چاہیتے" لکھا ہے: "جس تربیت اور تعلیم کو بارہ برس چاہیتے، سو تین برس کے عرصے میں بہ خوبی ہو جاتی ہے۔"
(مخطوطۂ گنجِ خوبی، ص ۳۔)

ایک مثال پیش کروں گا۔ اِس کتاب میں ص ۱۹۰ کی آخری سطر میں ایک جملہ ہے: "یہ طلسم کیوں بنایا ہے اور تو نے بستی کو چھوڑ کر جنگل پہاڑ کیوں بستا ہے"۔ طبعِ اوّل میں جملہ اِسی طرح ہے، لیکن ڈنکن فاربس کے مرتّب کیے ہوئے نسخے میں یہ اِس شکل میں ملتا ہے: "...... اور تو نے بستی کو چھوڑ کر جنگل پہاڑ کیوں بستا ہے"۔ ظاہر ہے کہ اب جملہ بگڑ گیا۔ مولوی عبدالحق صاحب کے مرتّب کیے ہوئے نسخے میں اِس کی شکل یہ بن گئی ہے: "..... اور تو نے بستی کو چھوڑ کر جنگل پہاڑ کیوں بسایا ہے"۔ یعنی ایک قدیم انداز کے جملے نے (جس میں "نے" اُس عہد کے اور میر امّن کے اندازِ بیان کے مطابق آیا ہے) جدید شکل صورت اختیار کرلی۔ "بستا ہے"[1] نے پہلے "بستا ہے" کی شکل اختیار کی اور پھر وہ "بسایا ہے" بن گیا، اِس طرح پورے جملے کی ساخت بدل گئی۔

تذکیر و تانیث میں بھی تغیّرات ہوتے رہتے ہیں اور پھر مصنّف کے اپنے مختارات بھی ہوتے ہیں، مثلاً میر امّن نے "خلعت" کو مونّث لکھا ہے، اِسی طرح "ناوک" کو بھی تانیث کے ساتھ لائے ہیں؛ جب کہ یہ دونوں لفظ، خاص کر "خلعت" بہ طورِ عموم مذکر ملتے ہیں۔ مصنّفین کے ایسے مختارات شاید سب سے زیادہ پریشان کُن ہوتے ہیں۔ مرتّب کی یہ ذمّے داری ہے کہ وہ (ممکن حد تک) مصنّف کے مختارات سے بہ خوبی واقف ہو، ساتھ ہی وہ اُس عہد کی زبان اور بیان سے بھی خوب واقفیت رکھتا ہو اور اُس واقفیت کے بل پر، اُس خاص متن میں امکان بھر صحیح صورتوں کا تعیّن کرے اور وضاحت کے لیے حواشی میں تفصیلات درج کرے۔

متن کی تصحیح اور متعلّقاتِ متن کی کماحقہٗ ترتیب کے لیے یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ مفصّل تنقیدی مباحث کو شاملِ کتاب نہ کیا جائے۔ ویسے بھی تنقید اور تدوین دو الگ موضوع ہیں؛ متضاد تو نہیں، لیکن مختلف ضرور ہیں۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں اور دونوں کے مباحث بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ایسا کم اور بہت کم ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اِن دونوں مختلف الاحوال موضوعات کا صحیح معنی میں حق ادا کر سکے اور اِس کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ دونوں موضوعات

---

[1] یہ فعل اِس سے پہلے آچکا ہے: "جو مرد نکمّا ہو کر گھر بستا ہے، اُس کو دُنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں" (ص ۲۴)۔

دو مختلف اندازِ نظر، طریقِ کار اور طرزِ فکر کے متقاضی ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اِس خلطِ بحث سے، یعنی مقدّمۂ کتاب میں طویل تنقیدی مباحث کو شامل کرنے سے یہ نقصان ضرور ہوتا ہے کہ دونوں کا حق ادا نہیں ہو پاتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ متعلقاتِ متن کی ضروری تفصیلات زیرِ بحث نہیں آپاتیں ـــــ مرتّب کا اصل کام یہ ہے کہ وہ متن کو صحیح طور پر پیش کرے اور اُس متن سے متعلق بحثوں کو مناسب تفصیل کے ساتھ لکھے، جس میں قابلِ ذکر حصہ لسانی مباحث کا ہوگا؛ اُس کے فرائض میں یہ شامل نہیں کہ وہ تنقیدی راے بھی دے؛ اِسی لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ اِس سلسلے کی زیرِ ترتیب کتابوں کے مقدمے میں مفصّل تنقیدی مباحث کو شامل نہ کیا جائے۔

تحقیق اور تدوین کا چولی دامن کا ساتھ ہے؛ مگر اِس سلسلے میں ایک بات خاص کر پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ کسی متن کی تدوین کے سلسلے میں اور کسی مصنّف یا مترجم پر مستقل طور سے تحقیقی مقالہ لکھنے کے سلسلے میں جو بحثیں کی جائیں گی؛ اُن کی وسعت کے دائرے مختلف ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں، اِس کا ضرور لحاظ رکھا جانا چاہیے۔ اِسی طرح جو تحقیقی بحثیں اُس سے پہلے کی جا چکی ہوں اور وہ قابلِ قبول بھی ہوں اور اُن پر اضافہ بھی نہ کیا جا سکتا ہو؛ تو یہ ضروری نہیں، بل کہ مناسب بھی نہیں کہ اُن سب بحثوں کو شاملِ مقدّمۂ مرتّب کیا جائے۔ اُن کا حوالہ دینا کافی ہو سکتا ہے۔ اگر یہ طریقۂ کار اختیار کیا جائے کہ صرف ضروری اور بحث طلب باتوں کو مناسب اختصار کے ساتھ لکھا جائے اور تفصیلات کے لیے اصل ماخذ یا مآخذ کا حوالہ دے دیا جائے، تو یہ طریقۂ کار بالکل درست ہوگا۔ ہاں، کسی غلطی کی یا غلطیوں کی تصحیح اگر ضروری ہو، تو پھر وہاں مناسب تفصیل کے ساتھ صحیح صورتِ حال کی وضاحت ضرور کی جائے۔ اِسی طرح اگر کچھ اضافے کیے جا سکتے ہوں، تو اُن کو بھی ضروری صراحتوں کے ساتھ لازماً شامل کیا جائے۔ اِس کتاب کے مقدّمے میں یہی طریقۂ کار اختیار کیا گیا ہے۔ [اِس سلسلے کی پہلی کتاب فسانۂ عجائب ہے، اُس کے مقدّمے میں بھی اِسی اندازِ نظر اور طریقِ کار کو ملحوظ رکھا گیا ہے]۔

حالاتِ زندگی

میر امّن کے مفصّل حالات معلوم نہیں۔ اِس سلسلے کی ایسی معلومات، جس پر اعتماد کیا جاسکے (میرے علم کی حد تک) تین جگہ ملتی ہے: ① باغ و بہار کے دیباچے میں اُنھوں نے اپنے خاندان، اہلِ خانہ اور اپنے متعلّق چند باتیں لکھی ہیں۔ ② گنجِ خوبی کے شروع میں اپنی شاعری کے متعلّق چند جُملے لکھے ہیں۔ ③ فورٹ ولیم کالج میں اُن کی ملازمت اور تصانیف سے متعلّق کچھ دستاویزی بیانات ملتے ہیں، جنھیں عتیق صدیقی (مرحوم) نے اپنی تحریروں میں، خاص کر اپنی کتاب گِل کرسٹ اور اُس کا عہد میں یک جا کر دیا ہے۔ اِن کے سوا اب تک ایسا کوئی ماخذ سامنے نہیں آیا ہے جس کی مدد سے حالاتِ زندگی کی حد تک معلومات میں قابلِ قبول اضافہ ہوسکے۔ انتہا یہ ہے کہ اُن کی ولادت و وفات کے سنین کا بھی علم نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ اُن کا مدفن کہاں ہے۔

یہ درست ہے کہ اُن کی وفات کا سنہ لکھا گیا ہے اور اُن کی ولادت کے سنہ کے تعیّن کی بھی کوشش کی گئی ہے، نیز اُن کی زندگی سے متعلّق بعض اور باتیں بھی لکھی گئی ہیں؛ مگر یہ سب کچھ ایسے قیاسات پر مبنی ہے جن کی بِنا مفروضات پر ہے، یا محض واقعہ تراشی سے کام لیا گیا ہے۔ میرا نقطۂ نظر اِس سلسلے میں یہ ہے کہ ایسے ڈھیلے ڈھالے اور بعید تعبیرات پر مبنی قیاسات اور مفروضات قابلِ قبول ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ [میں یہ نہیں کہتا کہ قیاس کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں، میں یہ کہہ بھی نہیں سکتا، ہم سب بہت سے مقامات پر قیاس سے کام لیتے ہیں؛ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ قیاس اور مفروضات میں جو فرق ہوتا ہے، اُسے پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور قیاس کی بُنیاد قوی اور واضح قرائن پر ہونا چاہیے۔ یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ قیاس کو کسی بھی صورت میں دلیل، سند یا شہادت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا اور اُس پر کسی واقعے کے وجود یا عدمِ وجود کی بُنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ قیاس کا تعلّق امکان سے ہے؛ امکان اور وجود میں جو فرق ہے اُسے پیشِ نظر رہنا چاہیے]۔

کوئی واقعہ ہو یا کوئی سنہ، اِن کے تعیّن کے سلسلے میں "شہادت" (یعنی معتبر شہادت)

پر میں جو اصرار کرتا ہوں؛ اصولی طریقۂ کار کے علاوہ اِس کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ جن مشہور لوگوں کے متعلّق ہمیں کم یا بہت کم باتیں معلوم ہوتی ہیں؛ یہ دیکھا گیا ہے کہ اُن کے متعلّق کہیں سے کچھ مل جائے، تو ذوقِ طلب اُس کو قبول کرلینے کے لیے ذہن کو بہت جلد آمادہ کرلیا کرتا ہے اور چھان بِنان کو ضروری قرار نہیں دیتا؛ بل کہ بعض اوقات اِس وہم کو دل نشیں کردیا کرتا ہے کہ ہر وقت چھان بین پر اصرار، دراصل بے جا مشکل پسندی کا دوسرا نام ہے اور چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانے کے مرادف ہے۔

یہ بھی اِسی سلسلے کی کڑی ہے کہ بعض اوقات قیاس آرائی یا واقعہ فروشی کا شوقِ بے نہایت بہت آسانی کے ساتھ واقعہ تراشی کے دائرے میں گردش کرنے لگتا ہے۔ میر اَمّن کے حالاتِ زندگی کم سے کم معلوم ہیں، اِس لیے یہاں بھی یہ سب کچھ ہوا۔ اِس سلسلے میں دو مختلف مثالیں پیش کرنا کافی ہوگا۔

(۱) ممتاز حسین صاحب کا مرتّب کیا ہوا نسخۂ باغ و بہار پہلی بار ۱۹۵۸ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا؛ اُس کے مقدمے میں مرتّب نے میر اَمّن کا سالِ وفات بھی لکھا تھا، جو بہ قول اُن کے ایک "نادر اطّلاع" تھی اور مفتی انتظام اللہ شہابی نے یہ "نادر اطّلاع" بہم پہنچائی تھی۔ اطّلاع یہ تھی کہ نصر اللہ خاں خورجوی کے تذکرے "ہمیشہ بہار" (کذا) میں احسن کے حالات کے ذیل میں یہ مندرج ہے کہ میر اَمّن کا انتقال ۱۲۱۷ھ میں ہوا تھا۔ مفتی صاحب نے بہ قولِ خود دو اور کتابوں سے اِس کی تصدیق کرلی تھی، جن میں سے ایک کتاب کا نام "مواقیتُ الفواتح" لکھا تھا۔ یہی نہیں، مفتی صاحب نے مذکورہ تذکرے کی فارسی عبارت بھی پیش کردی تھی، جس میں صاف صاف مرقوم تھا کہ میر اَمّن کا انتقال ۱۲۱۷ھ میں ہوا تھا۔

اُس وقت تک نصر اللہ خاں خورجوی کا تذکرہ [جس کا صحیح نام "گلشنِ ہمیشہ بہار" ہے] بس ایک ہی بار شائع ہوا تھا اور کم یاب تھا۔ مجھے یہ بات معلوم تھی کہ اِس تذکرے کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ ۱۹۶۳ء میں میرا رام پور جانا ہوا اور میں نے پہلا کام یہ کیا کہ وہاں اُس تذکرے کو دیکھا۔ پورا تذکرہ دو بار پڑھ گیا، میر اَمّن کا اُس میں

کہیں بھی نام نہیں تھا۔ وہ عبارت ہی نہیں تھی جسے مفتی صاحب نے پیش کیا تھا۔ میں بہت حیران ہوا۔ اُس وقت تک میں مفتی صاحب کے "کمالات" سے ناواقف تھا۔ پھر میں نے "مواقیت الفواتح" کو تلاش کیا، اِس کتاب کا بھی کہیں نام نشان نہیں ملا۔ مزید دریافت پر مفتی صاحب کی خوے واقعہ تراشی سے واقف ہوا۔ اب معلوم ہوا کہ مفتی صاحب نے تذکرے کی فارسی عبارت سے لے کر کتابوں کے نام تک پورا جعل بنایا تھا؛ اصل عبارت میں اپنی طرف سے پیوند لگایا تھا اور نام تراشے تھے ——— مفتی صاحب نے خیال کیا ہوگا کہ ممتاز صاحب آج کل میر امّن کے حالاتِ زندگی معلوم کرنے کے لیے کوشاں ہیں اور حالات ہیں کہ ملتے ہی نہیں؛ ایسے میں اگر یہ اطّلاع بہم پہنچائی جائے اور ساتھ ہی فارسی کی ایک عبارت بھی پیش کر دی جائے، تو وہ بلاتکلف اور بلا تامّل اُسے قبول کر لیں گے۔ مفتی صاحب کا خیال صحیح نکلا اور ممتاز صاحب نے اُس "نادر اطلاع" کو بہ آسانی قبول کر لیا اور درجِ کتاب کر دیا۔ یہ وہی "نشاطِ کار" کا تقاضا تھا جو بعض اوقات احتیاط کے تقاضوں کو نظر انداز کر دینے پر مجبور کر دیا کرتا ہے۔ میں نے اُسی زمانے میں رسالۂ نیا دور (لکھنؤ) میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا "گل کرسٹ کی ایک کتاب کے چند اقتباسات" اُس مضمون میں مفتی صاحب کی اِس جعل سازی کی ضروری تفصیل لکھ دی تھی۔ یہ مضمون ستمبر ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔ رسالۂ نقوش (لاہور) کے "آپ بیتی نمبر" میں جن صاحب نے میر امّن کی "آپ بیتی" نقل کی ہے، اُنھوں نے ممتاز صاحب کے حوالے سے میر امّن کے اُس جعلی سالِ وفات کو بھی درج کر دیا ہے۔ ممتاز صاحب نے تو صورتِ حال سے واقف ہونے کے بعد مفتی صاحب کے پیش کیے ہوئے اُس حوالے کو رد کر دیا تھا، لیکن اِس "آپ بیتی" میں وہ سنہ موجود ہے اور موجود رہے گا۔

---

(۲) رسالۂ نقوش (لاہور) کے خاص نمبر (دسمبر ۱۹۸۶ء) میں مرزا احمد بیگ صاحب نے "میر امّن دلّی والے" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا ہے، جس میں بے بُنیاد قیاسات پر درجِ مضمون تفصیلات کی بُنیاد رکھی ہے؛ اِس کے نتیجے میں وہ بہت آسانی اور روانی کے ساتھ بہت سی باتیں لکھتے چلے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ میر امّن جب دہلی

سے نکلے ہیں" اُس وقت اُن کی عمر تیرہ برس رہی ہوگی، یوں ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ میر امّن پیدا ہوئے ہوں گے۔" اِس تعیّن کی ضرورت مقالہ نگار کو یوں پیش آئی کہ اُنھوں نے یہ لکھا ہے کہ میر امّن بڑھاپے کے سبب سے فورٹ ولیم کالج سے ریٹائر نہیں کیے گئے تھے [جیسا کہ عتیق صدیقی نے معتبر حوالے سے لکھا ہے] بل کہ "گمانِ غالب ہے کہ میر امّن نے کالج کے بگڑتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر بروقت حیدر آباد کا رُخ کیا ہو" اور یوں مقالہ نگار نے نہایت آسانی کے ساتھ میر امّن کو نواب شمس الامراء کے قائم کردہ "دارُالترجمہ" میں پہنچا دیا، جہاں وہ مختلف سائنسی کتابوں کے ترجمے میں شریک رہے۔ اِن سب بے بُنیاد اور قطعی طور پر ناقابلِ قبول قیاسات کی بُنیاد دارُالترجمہ کی ایک کتاب "ستّۂ شمسیہ" پر رکّھی گئی ہے، جس کے مقدّمے میں نوّاب شمس الامراء نے لکھا ہے کہ "میر امان علی دہلوی اور غلام محی الدّین حیدر آبادی ..... جو ملازمانِ سرکار ہیں، حکم کرنے میں آیا کہ اِن علومِ مذکورہ کو زبانِ انگریزی سے اُردو زبان میں ہمارے روبرو ترجمہ کریں۔" مقالہ نگار نے یہ فرض کر لیا کہ "میر امان علی دہلوی" کوئی اور نہیں، میر امّن دلّی والے تھے: "زمانی اعتبار سے بھی میر امان علی، میر امّن ہی ہو سکتے ہیں۔ نیز امّن مکمل نام نہیں، تخلص معلوم ہوتا ہے، اور یہ تخلص میر امان علی ہی کا موزوں تر ہے" (نقوش، ص ۲۳۶)۔ اِس لیے ضروری تھا کہ کم از کم ۱۸۴۰ء تک میر امّن کو زندہ رکّھا جائے، ["ستّۂ شمسیہ کا دیباچہ میر امّن کو ۱۸۴۰ء تک حیات ثابت کرتا ہے" (ایضاً ص ۲۴۰)] اُس کی صورت اُنھیں یہ نظر آئی کہ فرض کر لیا جائے کہ وہ "۱۷۵۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔" مقالہ نگار نے اپنے طویل مقالے میں میر امّن سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اُس میں سے کوئی ایک بات بھی قابلِ قبول نہیں اور اِس کی اصل وجہ وہی ہے کہ قیاسات کی بُنیاد مفروضات پر رکّھی گئی ہے۔

نام

باغ و بہار اور گنجِ خوبی، دونوں کتابوں کے دیباچوں میں اُنھوں نے اپنا نام

"میر امّن" لکھا ہے۔ باغ و بہار طبعِ اوّل کے سرورق پر اور اُس کے آخری صفحے پر بھی "میر امّن" ملتا ہے اور ہندی مینوں میں بھی یہی ہے۔ اُس عہد کی کسی اور کتاب میں یا کسی اور جگہ "میر امّن" کے سوا اور کوئی دوسرا لفظ نہیں ملتا، جس سے یہ گمان بھی کیا جاسکے کہ اُن کا نام کچھ اور ہوگا۔ اور ہاں، گنجِ خوبی کا جو خطّی نسخہ میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اُس کے آخری صفحے پر قطعۂ تاریخ "تاریخ گنج خوبی" کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے اور اِس قطعے کے آخر میں میر امّن نے اپنے قلم سے "میر امن لطف" لکھا ہے۔ اِس کے بعد اِس میں کسی شبہے کی گنجایش نہیں رہتی کہ اُن کا نام "میر امّن" تھا اور "لطف" تخلّص تھا۔

کریم الدّین نے اپنے اُردو تذکرے طبقاتِ شعراءِ ہند میں "امان و لطف" کے تحت لکھا ہے :

"تخلّص میر امان دہلوی جو کہ مشہور بہ تخلّص امن ہے۔ یہ تخلّص اُس نے اپنے اشعارِ متفرقہ میں اختیار کیا ہے" [طبعِ اوّل کی عکسی اشاعت، اترپردیش اُردو اکیڈمی، لکھنؤ، ص ۲۳۶]۔

یعنی اِس تذکرے میں اُن کا نام "میر امان" ملتا ہے اور تذکرہ نگار نے "امّن" کو تخلّص بتایا ہے؛ مگر اِن میں سے کوئی بات درست نہیں۔ کریم الدّین نے اپنے ماخذ کا حوالہ دیا نہیں، اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ چوں کہ اُنھوں نے یہ فرض کرلیا ہے کہ تخلّص "امّن" تھا، اِس لیے یہ بھی قیاساً مان لیا کہ پھر اُن کا نام "میر امان" ہوگا۔ لیکن یہ وہی بات ہے جس کے لیے کہا گیا ہے کہ بِناءِ الفاسد علی الفاسد۔ اُنھوں نے یہ جو لکھا ہے کہ "یہ تخلّص اُس نے اپنے اشعارِ متفرقہ میں اختیار کیا ہے" تو یہ قطعی طور پر درست نہیں۔ میر امّن نے اپنے کسی بھی شعر میں اپنا تخلّص "امّن" نظم نہیں کیا ہے (اور نہ کہیں اور یہ بات لکھی ہے) البتّہ اُنھوں نے اپنا تخلّص "لطف" ضرور نظم کیا ہے۔ اِس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کریم الدّین نے نام اور تخلّص کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ اُن کا اپنا ایسا گمان اور قیاس ہے جو قابلِ قبول نہیں، مگر بعد کے لوگوں نے اِس کی تکرار کی ہے۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا نے اپنی کتاب میں لکھا ہے : "آپ کا اصلی نام میر امان ہے اور امّن تخلّص ہے۔ اگرچہ

کہیں کہیں اشعار میں اپنا تخلّص لطف بھی ظاہر کیا ہے" [سیر المصنّفین، مرتبۂ ڈاکٹر امیر اللہ شاہین، ص ۳۷] - مولوی صاحب نے حوالہ نہیں دیا، مگر خیال یہ ہے کہ کریم الدّین کا تذکرہ اُن کے پیشِ نظر رہا ہے، اِس بنا پر کہ (میری معلومات کی حد تک) کریم الدّین سے پہلے کسی اور نے "میر امّن" کا نام "میر امان" اور اُن کا تخلّص "امّن" نہیں لکھا ہے۔ ہاں آخری ٹکڑا مولوی صاحب کا اپنا اضافہ ہے۔

مولوی سید محمّد نے اپنی کتاب اربابِ نثرِ اُردو میں لکھا ہے: "بیان کیا جاتا ہے کہ اُن کا اصلی نام میر امان تھا اور امّن تخلّص، مگر وہ میر امّن ہی کے نام سے مشہور ہیں.... اُن کا تخلّص امّن تھا۔ سیر المصنّفین کے مولّف نے لکھا ہے کہ وہ کبھی اپنا تخلّص لطف بھی کرتے تھے، مگر کوئی سند یا حوالہ نہیں بیان کیا، البتّہ باغ و بہار کے خاتمے پر میر امّن نے جوابیات لکھی ہیں، اُن کی آخری بیت یہ ہے:

تو کونین میں لطف پر لطف رکھ
خدایا بحقِ رسولِ کبار

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لطف بھی تخلّص کرتے تھے" (ص ۵۸)۔

یعنی "میر امان" نام اور "امّن" تخلّص کے اِس مفروضے کا سلسلہ کریم الدّین کے تذکرے تک پہنچتا ہے، اِس اضافے کے ساتھ کہ اُن کے دو تخلّص تھے: "امّن" اور "لطف"۔

مجھے خاص کر تعجب اِس پر ہے کہ اِس زمانے کے ایک معروف اہلِ قلم ڈاکٹر سہیل بخاری نے بھی اپنے تحقیقی مقالے میں اِسی کو دہرایا ہے: "میر امّن کا نام میر امان تھا اور امّن اور لطف دونوں تخلّص کرتے تھے" [اُردو داستان تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ص ۱۱۶، شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔ سالِ طبع مارچ ۱۹۸۷ء] مقالہ نگار نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، مگر صاف ظاہر ہے کہ اُنھوں نے سیر المصنّفین اور اربابِ نثرِ اُردو میں سے کسی ایک کتاب کو یا دونوں کتابوں کو سامنے رکھا ہے اور اِس سلسلے میں تحقیق کو ضروری نہیں سمجھا۔

تخلّص

میر امّن شاعر بھی تھے، اُن کا تخلّص لطفؔ تھا۔ اُنھوں نے اپنی دوسری کتاب گنجِ خوبی کے دیباچے میں [جو فارسی کی معروف کتاب اخلاقِ محسنی کا ترجمہ ہے] لکھا ہے:

"اور قریب ہزار بیت اُستادوں کی، جو مصنّف نے تمام کتابوں سے چُن چُن کر، ہر ایک مضمون کی ہر موقع پر ٹانک ڈالیں ہیں، اُن کو بھی اپنی سمجھ کے موافق جوں کا توں ہندی میں نظم کیا۔ اگرچہ فکرِ سخن کہنے کی ساری عمر نہیں کی، ہاں مگر خود بہ خود جو کوئی مضمون دل میں آیا، تو اُسے باندھ ڈالا۔ نہ کسو کا اُستاد، نہ کسو کا شاگرد۔

نہ شاعر ہوں میں اور نہ شاعر کا بھائی　　　فقط میں نے کی اپنی طبع آزمائی"

[گنجِ خوبی، ص ۵، شائع کردہ شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی، سالِ طبع ۱۹۶۶ء]

(مطبوعہ نسخے کی اِس عبارت کا خطّی نسخے سے مقابلہ کر لیا گیا ہے)۔ گنجِ خوبی کے خطّی نسخے کے آخری صفحے کی آخری سطر میں میر امّن نے اپنے قلم سے "میر امّن لطف" لکھا ہے اور باغ و بہار کے آخر میں جو قطعۂ تاریخ ہے، اُس کے آخری شعر میں بھی یہ تخلّص آیا ہے:

خدایا بہ حقِ رسولِ کبار　　　تو کونین میں لطفؔ پر لطف رکھ

گنجِ خوبی میں جس قدر اُردو اشعار آئے ہیں، وہ اُن کی اپنی صراحت کے مطابق، میر امّن ہی کے نظم کیے ہوئے ہیں۔ باغ و بہار کے آخر میں جو قطعۂ تاریخ ہے، وہ بھی اُنھی کا کہا ہوا ہے۔ اِن کے علاوہ گل کرسٹ کی مرتّب کی ہوئی ایک کتاب THE STRANGERS INFALLIBLE EAST INDIAN GUIDE[1] میں اُن کی ترجمہ کی ہوئی ایک غزل ملتی ہے۔ اِس کتاب میں پہلے حافظؔ کی وہ غزل درج کی

---

[1] میرے پیشِ نظر اِس کتاب کا تیسرا اڈیشن ہے جو لندن سے ۱۸۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ نسخہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی میں محفوظ ہے۔ اِس کا نمبر ہے: 421-93 / G 303 ST ۔ اِس کا پہلا اڈیشن ۱۸۰۲ء میں کلکتے سے شائع ہوا تھا۔

گئی ہے جس کا مطلع یہ ہے :

" حجابِ چہرۂ جاں می شود غبارِ تنم   خوش آں دمیکہ ازیں چہرہ پردہ بر فگنم "

پہلے اِس فارسی غزل کا انگریزی نثر میں آزاد ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ اُس کے بعد "غزل میر امّن لطف" کی لکھی گئی ہے جو اسی فارسی غزل کا ترجمہ ہے۔ گل کرسٹ نے میر امّن کے ترجمے کے متعلق لکھا ہے کہ اِس ترجمے میں فارسی کا حسن تو نہیں، پھر بھی غنیمت ہے۔ اِس کا مطلع و مقطع یہ ہے :

ہے اوٹ جلوۂ جاں کی گلی بدن میرا   خدا کرے کہ اُڑے خاک ہو یہ تن میرا
اُٹھا تو ہستی کو حافظ کی آ کے از رہِ لطف   کہ کوئی سُنے نہ ترے سامھنے سخن میرا[1]

اِن تفصیلات سے یہ قطعی طور پر متعین ہو جاتا ہے کہ "میر امّن" نام تھا اور "لطف" تخلّص تھا۔ اِس کے علاوہ جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس کی کوئی سند اور کوئی ثبوت موجود نہیں اور یوں ایسی کوئی بات قابلِ قبول نہیں۔

مجھے صحیح معنی میں تعجب اِس پر ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے :

" بعض متاخر کتب میں ان کے دو تخلّص بیان کیے گئے ہیں، امّن اور لطف۔ لطف تخلّص کا استدلال باغ و بہار کے اِس شعر سے کیا گیا ہے :

تو کو مِن میں لطف پر لطف رکھ   خدایا بحقِ رسولِ کبار

لیکن شعر میں کوئی قرینہ نہیں کہ میر امّن کا تخلّص " لطف " قرار دیا جائے۔ مرزا علی لطف مولّفِ تذکرۂ گلشنِ ہند شاعر تھے اور لطف تخلّص کرتے تھے ..... یہ کلکتے ہی میں مقیم تھے۔ میر امّن نے گنجِ خوبی کے دیباچے میں اِن کے دو شعر دیے ہیں :

---

[1] اِس کے بعد گل کرسٹ نے اِس فارسی غزل کو انگریزی نظم میں منتقل کیا ہے اور پھر اُس منظوم ترجمے کا میر شیر علی افسوس سے اُردو غزل کی صورت میں ترجمہ کرایا ہے اور اِس کی صراحت کر دی ہے کہ افسوس کا ترجمہ منظوم انگریزی ترجمے پر مبنی ہے۔ افسوس کا ترجمہ اچھی خاصی نظم بن گیا ہے، جو نادر کاکوروی کی بعض نظموں کی یاد دلاتا ہے۔ ترجمہ در ترجمہ کا یہ عمل بہت دل چسپ ہے اور قابلِ مطالعہ۔

"..... اور عین مقابلے کے وقت کا یہ قطعہ لطف کا ہے :

پلٹنیں اور توپیں جب سنمکھ ہوئیں
مرہٹے مصیبت کے مارے (کذا) مرگئے
فیر سنتے ہی ففر و ہو چلے
چھوٹی جب بندوق کوّے اُڑ گئے

قیاس یہ ہے کہ امّن نے باغ و بہار میں اِسی لطف کا شعر دیا ہے اور لطف میر امّن کا اپنا تخلص نہیں تھا۔" [باغ و بہار ایک تجزیہ ، نصرت پبلشرز لکھنؤ ، ص ۱۸]

اِس بیان سے صاف طور پر یہ مطلب نکلتا ہے کہ میر امّن کا تخلص " امّن " تھا "لطف" نہیں تھا۔ جب ایک بار یہ فرض کر لیا گیا کہ " لطف " میر امّن کا تخلص نہیں تھا ، تو پھر یہ بھی فرض کرنا پڑا کہ " لطف " بہ طور تخلص جن اشعار میں آیا ہے ، وہ میر امّن کے نہیں ہو سکتے۔ چوں کہ مرزا علی لطف کا نام سامنے تھا ، یوں فرض کر لیا گیا کہ یہ اشعار انھی " لطف " کے ہیں۔ یہ سب مفروضات ہیں۔ میر امّن کا تخلص " لطف " نہیں تھا ، یہ بات قطعی طور پر درست نہیں۔ صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ میر امّن کا صرف ایک تخلص " لطف " تھا اور جن اشعار کو مرزا علی لطف سے منسوب کیا گیا ہے ، وہ سب میر امّن لطف کے ہیں۔

مرزا حامد بیگ نے اپنے محوّلۂ بالا مقالے میں اِسی سلسلے میں وحید قریشی صاحب کی طویل عبارت نقل کر کے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ " میر امّن کے لطف تخلص کرنے سے متعلق ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق پر کوئی اضافہ ممکن نہیں "۔ البتہ موصوف نے اِس رائے کا اضافہ کیا ہے کہ " باغ و بہار کے خاتمۂ کتاب میں مرزا علی لطف کے اشعار کی شمولیت کا ایک سبب یہ بھی رہا ہوگا کہ لطف ، ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے بہت قریب تھے "۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ، نہ ڈاکٹر صاحب کا خیال درست ہے اور نہ مرزا صاحب کی قیاس آرائی قابلِ قبول ہے۔

وطن ، علاقہ اور محلّہ :

اُنھوں نے باغ و بہار اور گنجِ خوبی میں کئی جگہ اپنے آپ کو " میر امّن دلّی والا " لکھا

ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ دلّی "وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے" [دیباچۂ باغ و بہار، ص ۶]۔ اِس سے واضح طور پر اور قطعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح معنی میں "دلّی والے" تھے؛ یعنی یہیں پیدا ہوئے تھے اور یہیں نشو و نما پائی تھی۔

اِس سلسلے میں یہ بات ضرور ذہن میں رہے کہ میر امّن نے شاہ جہاں آباد کو نہیں، بل کہ شاہ جہانی فصیل سے باہر کی قدیم آبادی یعنی "پُرانے شہر" کو "دلّی" کہا ہے۔ شاہ جہاں کی دہلی کی تعمیر کے سلسلے میں اُنھوں نے یہ صراحت کی ہے کہ:

"تب بادشاہ نے ..... شہر کو دارُالخلافت بنایا؛ تب سے شاہ جہان آباد مشہور ہوا۔ اگرچہ دلّی جُدی ہے۔ وہ "پُرانا شہر" اور یہ "نیا شہر" کہلاتا ہے" (ایضاً ص ۸)۔

یعنی فصیل کے اندر جو شہر بسایا گیا، وہ "نیا شہر"[1] کہلاتا تھا؛ مگر "دلّی" اُس سے الگ تھی۔ اِس طرح میر امّن نے واضح طور پر "پُرانے شہر"[2] کو "دلّی" مانا ہے۔ اِس بیان کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو یہی نظر آئے گا کہ اُنھوں نے اپنے آپ کو جو بار بار "دلّی والا" کہا ہے، تو اُس سے ایک یہ بات بھی صریحی طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ "پُرانے شہر" میں رہتے تھے۔

اُنھوں نے یہ صراحت نہیں کی کہ وہ "دلّی" (یعنی پُرانے شہر) کے کس محلّے میں رہتے تھے۔ پُرانے شہر کی حدود بہت وسیع تھیں، محلّے کا قطعی طور پر تعیّن ممکن نظر نہیں آتا۔

پُرانے شہر میں ایک محلّہ "سیّد واڑہ" بھی تھا۔ ملفوظات و حالاتِ شاہ فخر الدّین میں اِس محلّے کے متعلّق مرقوم ہے: "سیّد واڑہ، پُرانی دہلی کا ایک محلّہ ہے، جہاں میر بدیع رہا کرتے تھے۔ اِس محلّے کے سادات معتبر نسب[3] والے ہیں" [ص ۵۱]۔

---

[1] میر شیر علی افسوس نے لکھا ہے: "اِس عاصی کا مولد نیا شہر ہے" [دیباچۂ باغِ اُردو، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۲۱]۔ [2] سیّد انشا نے پُرانی دہلی کی خصوصیات کے ذیل میں لکھا ہے: "اور شہرِ قدیم کے رہنے والے، جس کا نام "پُرانا شہر" ہے، "اِدھر" کو "ایدھر" ..... کہتے ہیں۔ یہ لفظ اُن کی صحبت سے نئے شہر والے بھی بولتے ہیں" [ترجمۂ دریائے لطافت، ص ۲۶]۔ [3] یہ اقتباس عزیزِ مکرّم ڈاکٹر شریف حسین قاسمی (مرتّبِ سیر المنازل،

میر حسن (صاحبِ مثنوی سحر البیان) بھی اِسی محلّے سے تعلّق رکھتے تھے: "در سیدواڑہ دہلی کہنہ تولّدش واقع شدہ" [مجموعۂ نغز، ص ۲۰۳]۔ میر امّن سیّد تھے (یہ اُن کے نام سے ظاہر ہے) ممکن ہے وہ بھی اِسی محلّے سیّد واڑہ میں رہتے ہوں۔ بہ ہر صورت، یہ محض ایک گمان اور خیال ہے (اور اِسے قیاس کا درجہ بھی حاصل نہیں) مگر بہ ظاہر یہ بعید از امکان نہیں معلوم ہوتا۔

تعلیم:

اُنھوں نے اپنی تعلیم کا احوال بھی نہیں لکھا؛ مگر یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ فارسی سے خوب واقف تھے۔ اِس کا واضح ثبوت اُن کی کتاب گنجِ خوبی ہے، جو اخلاقِ محسنی کا اُردو ترجمہ ہے۔ اخلاقِ محسنی فارسی کی مشہور کتاب ہے۔ ایک زمانے میں یہ بہت سے مدرسوں میں پڑھائی جاتی تھی (میں نے بھی اِسے مدرسے ہی میں پڑھا تھا)۔ اُس کی زبان بہت مشکل نہ سہی، مگر آسان بھی نہیں؛ بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ خاصی مشکل ہے۔ ایسی کتاب کا کام یاب ترجمہ وہی کر سکتا ہے جو فارسی زبان سے اچھّی طرح واقف ہو۔ عربی کی تعلیم کے متعلّق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

جاگیر اور منصب:

اُنھوں نے اپنے بزرگوں کے متعلّق جو کچھ لکھا ہے، اُس سے یہ پتا نہیں چلتا کہ اُن کا سلسلۂ نسب کہاں تک پہنچتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے بزرگوں میں سے کسی کا نام بھی نہیں لکھا۔ کہیں اور بھی اب تک اِس سلسلے کی کوئی بات دیکھنے میں نہیں آ سکی ہے۔

نے بھیجا ہے، اِس نوٹ کے ساتھ: "ملفوظات و حالاتِ شاہ فخر الدین، فخر الطّالبین و مناقبِ فخریہ کا اُردو ترجمہ ہے۔ اِس کے مترجم میر نذر علی درؔد کاکوروی ہیں۔ یہ سلمان اکیڈمی کراچی سے شائع ہوا ہے۔" میری نظر سے یہ کتاب نہیں گزری۔

اُن کے والد کا نام بھی معلوم نہیں۔ اُن کی تحریر سے بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بزرگ مغل دربار میں صاحبِ منصب و جاگیر تھے:

"میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے، ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں، پُشت بہ پُشت جاں فشانی بجالاتے رہے۔ اور وہ بھی پرورش کی نظر سے، قدردانی جتنی چاہیے، فرماتے رہے۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز فرماکر مالامال و نہال کر دیا اور "خانہ زادِ موروثی" اور "منصب دارِ قدیمی" زبانِ مبارک سے فرمایا؛ چناں چہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا" [دیباچۂ باغ و بہار، ص ٦]

اُنھوں نے ایسی کوئی صراحت نہیں کی جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ وہ لوگ کس پایے اور کس درجے کے تھے؛ یعنی اُن کا منصب کیا تھا اور جاگیر کتنی تھی اور کہاں تھی۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کس مغل بادشاہ نے منصب دیا تھا یا جاگیر عطا کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا" لیکن اُنھوں نے اپنے بزرگوں میں سے کسی کا نام لکھا نہیں، اِس لیے بہ ظاہر حالات اُن کے بزرگوں کے منصب و خطاب کے متعلق تفصیلات معلوم کرنے کی صورت نظر نہیں آتی۔

ہاں اُن کے اندازِ نگارش سے بہ ظاہر یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ وہ خود کسی بادشاہی خدمت پر مامور نہیں تھے [یہ محض قیاس ہے]۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ بہ صورتِ دیگر وہ اپنی "خدمت" کا ذکر ضرور کرتے۔ اُنھوں نے یہ جو لکھا ہے کہ "سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کرلیا" (ایضاً ص ٦) اِس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ("خانہ زادِ موروثی" ہونے کی بنا پر) بزرگوں کی جاگیر اُن کے حصّے میں بھی آئی تھی [مغلوں کے دستور کے مطابق "بہ حقِ سرکار" ضبط نہیں ہوئی تھی]۔ ہاں آخر میں وہ جاگیر اُن کے پاس رہی نہیں، نہ گھر بار رہا۔ اُن کی اپنی صراحت کے مطابق سورج مل جاٹ نے جاگیر ضبط کرلی اور ابدالی کی فوجوں نے گھر بار لوٹ لیا۔

اُن کی جاگیر سے متعلق محض قیاساً میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اُنھوں نے یہ جو لکھا ہے کہ "جب ایسے گھر کی..... یہ نوبت پہنچی" یعنی دلّی میں بادشاہت پر تباہی آئی "تب

سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا" ؛ اِس جملے میں لفظ "تب" بہ ظاہر اِس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے جب "احمد شاہ ابدالی" کی واپسی (۱۷۶۱ء) کے بعد سورج مل نے آگرے اور اُس کے اطراف پر قبضہ کر لیا تھا۔ [دہلی پر کبھی اُس کا قبضہ نہیں ہوا، اگرچہ پُرانے شہر کے علاقے تک اُس کی فوجوں نے لوٹ مار ضرور کی تھی] آگرے پر سورج مل جاٹ کا قبضہ ابدالی کی واپسی کے بعد کا واقعہ ہے۔ اِن سب اُمور کی بنا پر میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ اُن کے بزرگوں کو جو جاگیر ملی تھی، وہ آگرے میں یا اُس کے اطراف میں (بلند شہر اور علی گڑھ تک) کہیں ہوگی؛ جبھی تو سورج مل نے اُس کو ضبط کر لیا تھا [ضمنی طور پر یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ شاہ جہاں آباد کی نقش بندی سے پہلے پایۂ تخت کی حیثیت اکبر آباد کو حاصل تھی، یعنی بادشاہ وہیں رہتا تھا]۔

مذہب :

اُنھوں نے واضح الفاظ میں کہیں بھی اپنے مسلک کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے، البتہ باغ و بہار کے آغاز میں اُنھوں نے ایک جگہ لکھا ہے : "اور اُس کی آل پر صلوٰۃ و سلام، جو ہیں بارہ امام" (ص ۴) اور اِسی کتاب کے آخر میں لکھا ہے : "ہر ایک نامراد کا مقصدِ دلی اپنے کرم اور فضل سے برلا، بہ طفیل پنجتنِ پاک، دُوازدہ امام، چہاردہ معصوم علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کے" (ص ۲۴۹)؛ اِن عبارتوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعہ تھے۔

اولاد اور اہلِ خانہ :

باغ و بہار کے دیباچے میں اُنھوں نے گِل کرسٹ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے : "نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر، پانو پھیلا کر سو رہتا ہوں؛ اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دُعا اُس قدر دان کو کرتے ہیں" (ص ۷)۔ جب وہ عظیم آباد سے کلکتے کے لیے روانہ ہوئے تھے، اُس کا ذکر کرتے ہوئے یہ صراحت بھی کی ہے کہ "عیال و اطفال کو چھوڑ کر، تنِ تنہا کشتی پر سوار ہو ....." (ص ۶)۔ اِس سے بس اِس قدر معلوم

ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ عیال و اطفال تھے اور گھر میں چھوٹے بڑے دس آدمی تھے۔ اِس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا ہے۔

مرزا حامد بیگ نے اپنے محوّلۂ بالا مقالے میں لکھنؤ کے مشہور ریختی گو جانصاحب کو میر امّن کا بیٹا بتایا ہے، لکھا ہے: "قیاسِ غالب ہے کہ جانصاحب، میر امّن کے بیٹے تھے۔ میر امّن کے اصل نام میر امان علی کی مناسبت سے بیٹے کا نام میر یار علی (عرف جانصاحب) بھی اِس قیاس کو تقویت پہنچاتا ہے۔" مقالہ نگار نے اپنے قیاس کی بنیاد تذکرۂ سخنِ شعرا (تالیفِ عبدالغفور نسّاخ) کے اندراج پر رکھی ہے، نسّاخ نے "جانصاحب" کے لیے لکھا ہے:

"جانصاحب، میر یار علی، خلفِ میر امّن لکھنوی، شاگردِ عاشور علی خاں بہادر۔ ریختی اپنے طرز پر خوب کہتے تھے۔"

اِس کے بعد اُنھوں نے سیّد محمّد مبین نقوی "مرتّبِ تاریخِ ریختی مع دیوانِ جانصاحب" کی عبارت کا اقتباس اِس طرح دیا ہے:

"جانصاحب کی ولادت فرخ آباد میں غالباً ۱۲۳۴ھ (۱۹-۱۸۱۸ء) میں ہوئی تھی۔ نام تو ان کا میر یار علی تھا، مگر والدین پیار سے جان صاحب کہتے تھے۔.... ان کے والد میر امّن تو فرخ آباد کے رہنے والے تھے، لیکن یہ بچپن ہی میں لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔"

نسّاخ اور مبین نقوی کے بیانات میں میر امّن کے لکھنوی اور فرّخ آبادی ہونے کے اختلاف کی مقالہ نگار نے تاویل اِس طرح کی ہے: "کہا جا سکتا ہے کہ میر امّن فورٹ ولیم کالج سے مستعفی ہونے کے بعد کچھ عرصہ فرخ آباد میں مقیم رہے، اور اُس کے بعد بہ طورِ مترجم دارالترجمۂ شمس الامرا، حیدر آباد دکن سے منسلک ہو گئے۔ اُنھوں نے اہل و عیال کو لکھنؤ میں چھوڑا اور خود دارالترجمہ کا کام کرتے رہے۔ بہت ممکن ہے میر امّن کے لکھنؤ سے اس تعلق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عبدالغفور نسّاخ نے سخنِ شعرا میں .... میر امّن کو لکھنوی لکھا ہو۔"

مقالہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے، وہ سب ایسے مفروضات کا سلسلہ ہے جس کی ایک کڑی بھی درست

نہیں۔ اِن میں سے کوئی ایک بات بھی قابلِ قبول نہیں۔ اُن کو ایک جگہ "میر امان علی" کے نام نے مغالطے میں مبتلا کیا، اور دوسری جگہ "میر امّن" نے۔ جو کچھ اُنھوں نے لکھا، اُس میں سے کسی ایک بات کا بھی ثبوت نہ اُن کے پاس ہے اور نہ کہیں اور موجود ہے۔ محض مفروضات، جو "کہا جاسکتا ہے" جیسے فقروں کے تحت معرضِ اظہار میں آئے ہیں۔

میر امّن کے ایک اور بیٹے کا بھی ضمنی طور پر نام آیا ہے، جن کا تخلّص "احسن" لکھا گیا تھا۔ مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب نے میر امّن کے سالِ وفات کے سلسلے میں جو عبارت پیش کی تھی، اُس کا آغاز اِس طرح ہوا تھا: "احسن، میر احسن نام داشت، پسرِ میر امّن ....."۔ لیکن "پسرِ میر امّن" مفتی صاحب کا گڑھا ہوا فقرہ ہے، اصل تذکرے میں موجود نہیں۔ گلشنِ ہمیشہ بہار میں (جس کے حوالے سے مفتی صاحب نے یہ عبارت پیش کی تھی) صرف ایک مرزا احسن علی احسن کا ذکر ہے، جن کا میر امّن سے کچھ واسطہ نہیں۔ مفتی صاحب نے "مرزا احسن علی" کو پہلے "میر احسن" بنایا اور پھر اُنھیں "پسرِ میر امّن" بنا دیا۔

دہلی سے روانگی:

"جب احمد شاہ ابدالی[1] کابل سے آیا اور شہر کو لُٹوایا؛ شاہِ عالم پورب کی طرف تھے، کوئی وارث اور مالک ملک کا نہ رہا..... ایک بارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے، میں کہیں تم کہیں ہو کر؛ جہاں جس کے سینگ سمائے، وہاں نکل گئے۔"
[دیباچۂ باغ و بہار، ص ۹]۔

اِس عبارت میں یہ صراحت تو موجود نہیں کہ میں بھی اُسی زمانے میں دہلی سے نکلا تھا؛

---

[1] میر امّن نے اِس سے پہلے "احمد شاہ درّانی" لکھا ہے (ص ۶)۔ "احمد شاہ" کے ساتھ "درّانی" اور "ابدالی" دونوں لفظ ملتے ہیں۔ بیانِ واقع میں (جو احمد شاہ کے سلسلے میں ایک معتبر کتاب ہے) "ابدالی" ہے اور اسی اندراج کی بنیاد پر میری رائے میں "ابدالی" مرجّح ہے۔ اِس اندراج کے لیے دیکھیے ضمیمۂ تشریحات، ص ۲۶۴، حاشیہ ۱۰۔

مگر سارے قرائن دلالت اِسی پر کرتے ہیں کہ یہی زمانہ اُن کے ترکِ وطن کا بھی ہے۔ [اُن کی اپنی صراحت کے مطابق، اُن کی جاگیر ضبط ہو چکی تھی اور گھر لُٹ چکا تھا] - ممتاز حسین صاحب نے اپنے مرتب کیے ہوئے نسخۂ باغ و بہار کے مقدمے میں یہی رائے ظاہر کی ہے کہ میر امّن کی مراد ۶۱-۱۷۶۰ء کے واقعات سے ہے، جب "شاہِ عالم پورب کی طرف تھے" اور ابدالی [پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو فیصلہ کُن شکست دے کر] دہلی میں داخل ہوا تھا۔ [ضروری تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمۂ تشریحات، ص ۲۶۴، حاشیہ ۱] اور اُس کی فوجوں نے تین دن تک دہلی کو بُری طرح لوٹا تھا۔ بعض اور لکھنے والوں نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے ــــ یہ سنہ اگرچہ قطعی نہیں، لیکن قرینِ قیاس ضرور ہے اور اِس کو تسلیم کرنے میں بہ ظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ [شاہ عالم کے سلسلے میں دیکھیے اِسی کتاب میں ضمیمۂ تشریحات، ص ۲۷۲، حاشیہ ۳۳]۔

(۱۷۶۱ء میں) دہلی سے نکلنے کے بعد وہ اپنے بیان کے مطابق عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے اور "کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی، کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پانو اُکھڑے، رُوزگار نے موافقت نہ کی" (ایضاً ص ۶)۔ "کتنے برس" سے کتنی مدت مراد لی گئی ہے، اِس کا تعین فی الوقت ممکن نظر نہیں آتا؛ لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ مدت خاصی طویل ہوگی۔

ڈاکٹر اختر اُرینوی نے اپنی کتاب بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقا میں لکھا ہے کہ "میر شیر علی افسوس اور میر امّن دہلوی بھی عظیم آباد آئے اور (مہاراجا) شتاب رائے کے صاحب زادے کے کرم وجود سے فیض یاب ہوتے رہے" (ص ۳۴۱)۔ جیسا کہ قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے: "افسوس اور میر امّن کا اُن سے کسی قسم کا تعلق محتاجِ ثبوت ہے" [مقالاتِ قاضی عبدالودود، جلدِ اوّل، ص ۶۸]۔ اب تک ایسا کوئی معتبر حوالہ سامنے نہیں آیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ عظیم آباد میں میر امّن، مہاراجا شتاب رائے یا اُن کے صاحب زادے کے کرم وجود سے فیض یاب ہوئے۔ غرض کہ عظیم آباد میں میر امّن کے (طویل) قیام کے زمانے کے حالات قطعی طور پر معلوم نہیں۔ بس یہ معلوم ہے کہ آخرکار "روزگار نے موافقت نہ کی" اور "وہاں سے بھی پانو اُکھڑے"۔

کلکتے میں آمد :

انھوں نے صراحت کردی ہے کہ عظیم آباد سے وہ "تنِ تنہا" کشتی کے ذریعے کلکتے پہنچے۔ گھر والوں کو عظیم آباد میں چھوڑ دیا۔ کلکتے میں "چندے بے کاری گزری"۔ "چندے" سے دو چار یا چار چھے مہینے بھی مراد ہو سکتے ہیں اور سال بھر کے آس پاس کا زمانہ بھی۔ اُس کے بعد نواب دلاور جنگ نے اپنے چھوٹے بھائی کی اتالیقی کے لیے ملازم رکھ لیا۔ [نواب دلاور جنگ اور اُن کے بھائی میر محمد کاظم خاں کے متعلق میں معلومات حاصل نہیں کر سکا] ۔ "قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا، لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا۔ تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر... کے رسائی ہوئی"۔ —— عتیق صدیقی نے اپنی کتاب گل کرسٹ اور اُس کا عہد میں لکھا ہے :

"کالج کونسل کی کارروائی مورخہ ۲۹ [۱] اپریل ۱۸۰۱ء سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ کالج کے ہندستانی شعبے میں حسبِ ذیل منشیوں کا تقرر عمل میں آیا تھا" [طبعِ دوم، ص ۱۲۰]

اِس فہرست میں میر امّن کا نام بھی ہے۔ اگر میر امّن کے بیان میں "چندے" سے تقریباً سال بھر کی مدت مراد لی جائے اور دو سال نواب دلاور جنگ کے یہاں کی اتالیقی کی مدت کو سامنے رکھا جائے تو بہ ظاہر یہ نظر آتا ہے کہ میر امّن اپریل ۱۸۰۱ء سے کم و بیش تین سال (یا چار سال) پہلے کلکتے پہنچے ہوں گے۔ اگر اِس قیاس کو تسلیم کر لیا جائے، تو

---

[۱] عتیق صدیقی نے اپنی اِسی کتاب کے ص ۷۶ پر فورٹ ولیم کالج کے "ہندستانی شعبے کے منشیوں کی فہرست" درج کی ہے؛ اُس میں یہ بھی مرقوم ہے کہ ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو "ماتحت منشی" کی حیثیت سے چالیس روپے ماہانہ مشاہرے پر میر امّن کا تقرر ہوا۔ تاریخوں کے اِس اختلاف کی توجیہ یہ کی جا سکتی ہے کہ ۲۹ اپریل کو تجویز منظور کی گئی تھی اور باقاعدہ تقرر ۴ مئی کو ہوا۔ صدیقی صاحب نے اپنی انگریزی کتاب اوریجن آف ماڈرن ہندستانی لٹریچر میں ۲۹ اپریل کی کارروائی کی جو عبارت درج کی ہے، اُس سے اِس توجیہ کی بہ خوبی تائید ہوتی ہے۔ عبارت یہ ہے :

At a council of the college held on the 29th April 1801, it was Resolved that the following persons shall be appointed Moonshees on the college establishment at the salaries affixed" (PP 105)

پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ۱۷۶۱ء میں دہلی سے نکلنے کے بعد وہ ۳۶، ۳۷ برس تک عظیم آباد میں رہے ہوں گے۔

یہاں میر امّن کے ایک اور بیان کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اُنھوں نے باغ و بہار کے دیباچے کے آخر میں لکھا ہے: "یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تلک پہنچا ہے" (ص ۹)۔ "یہاں تلک" سے کلکتہ مراد ہے۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کن شہروں کی سیر کرتے اور تماشا دیکھتے آئے تھے۔ کیا کسی جگہ (قسمت آزماؤں کی طرح) قیام بھی کیا تھا؟ اُس کی مدت کتنی تھی؟ اِن سوالوں کے جواب معلوم نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اُن کے اِس بیان کا تعلق عظیم آباد سے کلکتے کے سفر کے درمیانی زمانے سے ہے یا دِلّی سے کلکتے پہنچنے کا پورا زمانہ مراد ہے۔ عظیم آباد میں اُن کے قیام کی جو قیاسی مدت لکھی گئی ہے، اُس کے سلسلے میں ہر ایک شہر کی سیر کرنے والے قول کو بھی سامنے رہنا چاہیے۔ معلوم نہیں اُس سفر کا درمیانی زمانہ کتنا تھا۔ یوں عظیم آباد کے زمانۂ قیام کے تعین میں معمولی فرق یا زیادہ فرق کا پیدا ہو جانا بہ خوبی ممکن ہوگا۔

ملازمت:

کلکتے میں وہ بہ طورِ اتالیق دو سال تک کام کرتے رہے "لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا، تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے "گل کرسٹ تک رسائی ہوئی"۔ "تب" کے لفظ سے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اتالیقی چھوڑنے کے فوراً بعد وہ گل کرسٹ تک پہنچے تھے اور ۴ رمئی ۱۸۰۱ء کو فورٹ ولیم کالج کے ہندستانی شعبے میں "ماتحت منشی" کی حیثیت سے چالیس روپے ماہانہ پر اُن کا تقرر ہوا تھا [گل کرسٹ اور اُس کا عہد، طبع دوم، ص ۱۲۱]۔

اِس سلسلے کی ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ خود میر بہادر علی حسینی کا تقرر بھی اِسی تاریخ کو ہوا تھا؛ یعنی یہ دونوں ایک ساتھ ملازم ہوئے تھے۔ میر امّن نے جو حسینی کے وسیلے سے رسائی حاصل کی، تو اِس سے بہ ظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حسینی کی رسائی گل کرسٹ تک اِس تاریخ تقرر سے کچھ پہلے ہی سے تھی۔ اِس قیاس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ جہاں

میر امّن کا تقرر "ماتحت منشی" کی حیثیت سے ہوا، وہاں حُسینی کا تقرر "چیف منشی" کے طور پر دو سَو روپے ماہانہ مشاہرے پر ہوا تھا۔ اگر گل کرسٹ اُن کو پہلے سے (اچھی طرح) نہ جانتا ہوتا اور اُن کی صلاحیت اور استعداد سے (بہ خوبی) واقف نہ ہوتا، تو اچانک یہ تقرر اس طرح شاید نہیں ہو سکتا تھا۔[1]

ملازمت سے سبک دوشی:

۴ مئی ۱۸۰۱ء سے جون ۱۸۰۶ء تک وہ کالج میں رہے۔ عتیق صدیقی نے ہفت روزہ ہماری زبان (نئی دہلی) کے ایک شمارے میں فورٹ ولیم کالج کی کارروائیوں کے حوالے سے پہلی بار یہ وضاحت کی تھی کہ ۴ جون ۱۸۰۶ء کو ہندستانی شعبے کے پروفیسر کی اس شکایت پر کہ میر امّن نے ایک طالبِ علم کو پڑھانے سے انکار کیا ہے، کالج کونسل کے سامنے پیش کیے گئے۔ الزام کو تسلیم کرتے ہوئے پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کا اُنھوں نے عذر پیش کیا۔ اُن کا بیان سُننے کے بعد کالج کونسل اس نتیجے پر پہنچی کہ میر امّن کالج کی خدمات سے سبک دوش

---

[1] گل کرسٹ، حُسینی کا بہت قائل تھا۔ جب کالج کونسل نے اُس کا بھیجا ہوا کتابوں کی طباعت کا تخمینہ منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا، اُس وقت اُس نے کالج کونسل کو ایک طویل خط لکھا تھا، جس میں بعض شرطوں کے ساتھ یہ پیش کش کی تھی کہ وہ خود اِن کتابوں کو چھاپ سکتا ہے؛ اُس میں ایک شرط یہ بھی تھی: "تالیف، ترجمے اور نقل کے تمام اخراجات میرے ذمّے ہوں گے، لیکن حکومت میر بہادر علی حُسینی کو اپنے مصارف پر، میری ماتحتی میں ہندستانی کتابوں کے مقابلے اور اُن کی تصحیح کے کام پر بحال رکھے" [گل کرسٹ اور اُس کا عہد طبعِ دوم، ص ۱۲۷]۔

ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی نے اپنے تحقیقی مقالے میں (حوالے کے ساتھ) لکھا ہے:

He calls Him Bahadurali Husaini as "One of the best Hindoostani scholars in India". He also says that he could never have affected what he had done in orthography and Grammer" if not strenuously aided by the Head Moonshee". Gilchrist and the Language of Hinduoostan, PP 79 (Rachna Prakashan New Delhi, 1972)

ہونے کے خواہش مند معلوم ہوتے ہیں۔ طے پایا کہ اِس مہینے کی تنخواہ کے علاوہ، اور چار مہینوں کی تنخواہ دے کر، کالج کی خدمات سے سبک دوش کر دیا جائے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے گنجِ خوبی کے مقدمے [شائع کردۂ شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی] میں یہی بات لکھی ہے (مگر عتیق صدیقی کی دریافت کا حوالہ نہیں دیا ہے) اور فورٹ ولیم کالج کی پروسیڈنگ کا حوالہ دیا ہے: "پروسیڈنگ آف دی کالج آف فورٹ، ہوم میلینیس رکارڈ نمبر ۵۶۰، ڈیٹڈ ۴ر جون ۱۸۰۶ء، ص ۱۳۶۔ نیشنل آرکائوز آف انڈیا، نئی دہلی۔"

بہ ہر حال یہ ثابت ہے کہ میر امّن، فورٹ ولیم کالج میں ۴ر جون ۱۸۰۶ء تک کام کرتے رہے اور اسی مہینے میں سبک دوش کر دیے گئے۔ اِس تاریخ تک وہ بہ قیدِ حیات تھے، مگر اُس کے بعد کا احوال معلوم نہیں۔ وہ کب تک زندہ رہے، کب انتقال ہوا، کہاں دفن ہوئے؛ اِن میں سے کوئی بات معلوم نہیں۔ ۱۸۰۶ء میں جب وہ پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کا عذر کرتے ہیں، تو اِس کا مطلب یہ بھی ہے کہ عُمر کے لحاظ سے وہ اُس وقت بُڑھاپے کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ محض قیاساً یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اُس وقت اُن کی عُمر پینسٹھ [۶۵] سال سے کم نہیں ہوگی۔ ستّر سال سے بھی کچھ زیادہ ہو، تو بھی یہ قرینِ قیاس رہے گی، بل کہ زیادہ قرینِ قیاس ہوگی؛ مگر اِس سلسلے میں قطعیت کے ساتھ فی الوقت تعیّن نہیں کیا جا سکتا۔

گنجِ خوبی

دو کتابیں اُن کی یادگار ہیں: باغ و بہار، گنجِ خوبی۔ آخر الذکر فارسی کی مشہور کتاب اخلاقِ محسنی کا ترجمہ ہے۔ دونوں کتابیں گل کرسٹ کی فرمایش پر لکھی گئی تھیں۔ گنجِ خوبی کے دیباچے میں میر امّن نے صراحتاً لکھا ہے کہ: "سنہ ایک ہزار دو سو سترہ ہجری میں، مطابق اٹھارہ سے دو عیسوی کے، باغ و بہار کو تمام کر کے اِس کو لکھنا شروع کیا" [گنجِ خوبی، شائع کردۂ شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی۔ سالِ طبع: ۱۹۶۶ء، ص ۴]۔ کتاب کے آخر میں "تاریخ گنجِ خوبی" کے عنوان سے قطعۂ تاریخ (تکمیل) ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۹ھ

میں یہ کتاب مکمل ہوئی تھی۔ اِس کتاب کا ایک بیش قیمت خطّی نسخہ میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا، رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے کتاب خانے میں محفوظ ہے [اُس کا عکس میرے سامنے ہے]۔ اِس کتاب سے متعلّق مزید تفصیل کے لیے دہلی یونی ورسٹی اڈیشن کے مقدمے کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

باغ و بہار ـــــ آغاز و اختتام :

میر امّن نے باغ و بہار کے خاتمے کی عبارت میں لکھا ہے :

"جب یہ کتاب فضلِ الٰہی سے اختتام کو پہنچی، جی میں آیا کہ اِس کا نام بھی ایسا رکھوں کہ اُسی میں تاریخ نکلے۔ جب حساب کیا، تو بارہ سو پندرہ ہجری کے آخر سال میں کہنا شروع کیا تھا۔ باعث عدمِ فرصت کے بارہ سو سترہ سنہ کی ابتدا میں انجام ہوئی۔ اِس فکر میں تھا کہ دل نے کہا "باغ و بہار[1]" اچھا نام ہے کہ ہم نام و ہم تاریخ اِس میں نکلتی ہے، تب میں نے یہی نام رکھا" [ص ۲۴۹]۔

---

[1] یہ دل چسپ اتّفاق ہے کہ محمد غوث زرّیں نے بھی ۱۲۱۷ھ میں قصّۂ چہار درویش کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا اور اُس کی تاریخ "باغ و بہار" سے نکالی تھی۔ اِس ترجمے سے متعلّق ضروری معلومات کے لیے دیکھیے ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب اُردو کی نثری داستانیں۔ نیز اُن کے مجموعۂ مضامین حقائق میں زرّیں کے لکھے ہوئے فارسی قصّۂ چہار درویش پر بھی ایک تحریر شامل ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ زرّیں نے چہار درویش کے قصّے کو پہلے فارسی میں لکھا تھا، اُس کے بعد اُس نے راجا رام دین کی فرمایش پر اپنے فارسی متن کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اُردو کے مقابلے میں فارسی متن نسبتاً مفصّل ہے۔

ایک بات اور : زرّیں کا نام محمد غوث ہے، لیکن چار درویش (اُردو) کے کئی نسخوں پر محمد عوض "مندرج ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کو اِس کا ایک خطّی نسخہ ملا تھا، مکتوبہ ۲۲ ستمبر ۱۸۰۳ء، اُس میں مصنّف کا نام " محمد غوث زرّیں ساکن بجنور شگفتہ زمیں " درج ہے۔ یہ قیاس کیا گیا کہ "کسی کم سواد کاتب نے محمد غوث کو " محمد غوص " لکھ دیا ہوگا جسے بعد میں " محمد عوض " پڑھ لیا گیا" [ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب اُردو کی نثری داستانیں میں یہ پوری بات لکھی ہے۔ میرے سامنے یہی کتاب ہے اور واوین کی عبارت اُسی سے ماخوذ ہے]۔ اِس سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ یہ محض قیاس نہیں، حقیقت ہے۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ میرے سامنے اِس کتاب کا جو خطّی نسخہ ہے، اُس میں مصنّف کا نام "محمد غوض"
←

یہ بیان بہت واضح ہے، اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۵ھ کے آخر میں اِس کتاب کا آغاز ہوا تھا اور ۱۲۱۷ھ کے آغاز میں یہ مکمل ہو گئی؛ لیکن ہندی مینول اور اِس کتاب کی ایک خطّی روایت (مخزونۂ انڈیا آفس لندن) کی دست یابی نے میر امّن کے اِس واضح بیان کو ناقابلِ قبول بنا دیا ہے۔ اِن دونوں روایتوں کے اندراجات کو بعد میں پیش کیا جائے گا، پہلے عتیق صدیقی کے ایک اہم قول کو پیش کرنا ضروری ہے؛ کیوں کہ سب سے پہلے اُنھی نے میر امّن کے منقولۂ بالا بیان پر شک ظاہر کیا تھا اور گل کرسٹ کے ایک خط کو دستاویزی شہادت کے طور پر پیش کیا تھا [ہندی مینول اور مذکورہ خطّی نسخے کے اندراجات کا اُس وقت تک کسی کو علم نہیں تھا]۔

عتیق صاحب نے لکھا ہے: "بعض ایسی دستاویزی شہادتیں ہم کو ملتی ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ چار درویش ۱۸۰۱ء کے اواخر میں مکمل ہو چکی تھی"۔ [گل کرسٹ اور اُس کا عہد، طبعِ دوم، ص ۱۳۲] ۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے گل کرسٹ کے ایک خط کا حوالہ دیا تھا، جو اُس نے کالج کونسل کو بھیجا تھا:

> "اِس معاملے میں ہمارے سامنے سب سے زیادہ اہم اور واضح بیان گل کرسٹ کا ہے، جس کے مطابق ۱۲؍جنوری ۱۸۰۲ء کو چار درویش، ہرکارہ پریس میں فارسی رسمِ خط میں چھپ رہی تھی اور اِس تاریخ تک اُس کے ۵۰ صفحات چھپ چکے تھے۔ اِس کے یہ معنی ہیں کہ ۱۸۰۱ء کے اواخر میں کتاب مکمل ہو چکی تھی اور چھاپے خانے کے سپرد کی جا چکی تھی" [ایضاً ص ۳۲]۔

گل کرسٹ نے کالج کونسل کو جو خط لکھا تھا، اُس خط کے ساتھ "اُن کتابوں کی طباعت کا تخمینہ" بھی منسلک تھا جو "یا تو چھپ چکی تھیں، یا چھپ رہی تھیں، یا اِسی سال چھپنے

لکھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بھی اِسے دیکھے گا، وہ یہی سمجھے گا کہ یہ "محمد عوض" ہے، "ع" پر غلطی سے نقطہ لگ گیا ہے۔ کسی نسخے کے ایسے ہی اندراج سے "محمد غوث" نے "محمد عوض" کا روپ دھارا ہے۔ میرے پاس جو خطّی نسخہ ہے یہ دراصل ایک مطبوعہ نسخے کی نقل ہے۔ مطبعِ مسیحائی (لکھنؤ) میں چھپے ہوئے نسخے کو ۱۸۵۴ء میں سید بشارت اللہ نے اپنے لڑکے سید ظہور الحق کے لیے نقل کیا ہے۔ ناقل خاصا غلط نویس ہے۔

والی تھیں" (ایضاً)۔ عتیق صاحب نے تخمینے والے اُس نقشے کو بھی اِسی بیان کے ذیل میں نقل کر دیا ہے، اُس کے مطابق "چار درویش" کے پانچ سو نسخوں کی طباعت کے اخراجات کا تخمینہ آٹھ ہزار آٹھ سو روپے لکھا گیا ہے۔ یہ صراحت بھی موجود ہے کہ ہرکارہ پریس میں اِس کتاب کے ۵۰ صفحے چھپ چکے ہیں اور کُل "فُولیو" ۴۳۲ ہیں۔ یہ تفصیلات اِس بات کو واضح کرتی ہیں کہ جنوری ۱۸۰۲ء سے پہلے یہ کتاب مکمّل ہو چکی تھی، اِس کی طباعت کے خرچ کا تخمینہ تیار کر لیا گیا تھا اور اِسے پریس بھیج دیا گیا تھا، جہاں چھپائی شروع ہو گئی تھی۔

عتیق صاحب کی پیش کی ہوئی اِس "دستاویزی شہادت" کے پیشِ نظر میر امّن کا یہ قول قابلِ قبول نہیں ٹھہرتا کہ یہ کتاب ۱۲۱۷ھ کی ابتدا میں مکمّل ہوئی ــــــــ میر امّن کے اِس قول کی اُنھوں نے یہ توجیہ کی ہے :

> "اِس سلسلے میں ایک اور امکان کا اظہار کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ جنوری ۱۸۰۲ء میں اور کتابوں کے ساتھ ساتھ "چار درویش" کی طباعت بھی جب ملتوی[1] کی گئی، تو اُس وقت میر امّن نے "چار درویش" کے مسوّدے پر نظرِ ثانی کر کے اُسے "باغ و بہار" بنایا ہو اور اِسی مناسبت سے اُس کا سنہِ تالیف ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء قرار دیا ہو" [ایضاً ص ۳۲]۔

عتیق صاحب نے ازراہِ احتیاط "نظرِ ثانی" کے لیے "امکان" کا اظہار کیا ہے اور یہ بجائے خود درست تھا، یوں کہ اُس وقت تک ایسی کوئی شہادت سامنے نہیں آسکی تھی جو سند کا کام دے سکتی ؛ لیکن ہندی مینول کی دست یابی کے بعد [جس میں پہلی بار اِس کتاب کے ۱۰۲ صفحے چھپے تھے] یہ ثابت ہو گیا ہے کہ میر امّن نے اِس کتاب کی پہلی روایت پر نظرِ ثانی کی تھی اور جب ۱۸۰۴ء میں یہ کتاب پہلی بار مکمّل طور پر چھپ کر سامنے آئی، تو وہ نظرِ ثانی شدہ روایت تھی [جس میں بہت سی تبدیلیاں کی گئی تھیں]۔

عتیق صاحب کے اِن اندراجات کے بعد اب ہندی مینول اور مذکورہ خطّی نسخے کے

---

[1] اِس کی ضروری تفصیل ہندی مینول کے تعارف کے ذیل میں آئے گی۔

اندراجات کو پیش کیا جاتا ہے ——— اِس کتاب کے آغاز میں، حمد و نعت کے بعد یہ عبارت ملتی ہے :

"منشا اِس تالیف کا یہ ہے کہ سنہ ایک ہزار دو سو پندرہ ہجری، اور اٹھارہ سَے ایک سال عیسوی، مطابق ایک ہزار دو سو سات سنہ فصلی کے، عہد میں اشرف الاشراف مارکوئس ولزلی گورنر جنرل ..... کے ..... چرچا علم کا پھیلا ..... اِس واسطے کتنی کتابیں اِسی سال بہ موجب فرمایش کے تالیف ہوئیں" [ص ۵]۔

لیکن ہندی مینول میں یہ عبارت اِس طرح ملتی ہے :

"اشرف الاشراف ولزلی مارکوئس گورنر جنرل ..... کے وقت میں ..... کہ ایک ہزار دو سو پندرہ برس ہجری اور اٹھارہ سَے ایک سال عیسوی مطابق ایک ہزار دو سو سات سن فصلی کے ہیں، چرچا علم کا پھیلا ..... چناں چہ یہ کتاب اِسی سال بہ موجب فرمایش کے تالیف ہوئی" [ص ۲]۔

آخری جملے سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ باغ و بہار ۱۲۱۵ھ میں مکمل ہو چکی تھی۔ اِس کی تائید ایک اور اندراج سے ہوتی ہے۔ باغ و بہار کے آخر میں میر امّن کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ شامل ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے :

"مرتّب ہوا جب یہ باغ و بہار ‏ ‏ ‏ تھے سنہ بارہ سو سترہ در شمار" [ص ۲۵۰]

مگر اِس کتاب کا جو مکمل مخطوطہ دست یاب ہوا ہے [جس کا تعارف آگے آئے گا] اُس میں یہ شعر اِس صورت میں مندرج ہے :

"مرتّب ہوا جب یہ باغ و بہار ‏ ‏ ‏ تھے سن بارہ سو پندرہ در شمار"

اِس سے بھی اِسی کی تائید ہوتی ہے کہ یہ کتاب (پہلی روایت کی صورت میں) ۱۲۱۵ھ میں مکمل ہو چکی تھی۔ [بہ ظاہر نظرِ ثانی کے وقت ۱۲۱۵ کو ۱۲۱۷ سے بدلا گیا ہے]

۱۲۱۵ھ مشتمل ہے ۱۸۰۰ء اور ۱۸۰۱ء پر۔ انجمن ترقّیِ اُردو کراچی کی شائع کی ہوئی تقویم کے مطابق یکم محرم ۱۲۱۵ھ، ۲۵ مئی ۱۸۰۰ء کے مطابق ہے اور یکم محرم ۱۲۱۶ھ کو مئی ۱۸۰۱ء کی چودہ تاریخ تھی۔ اگر اِس بات کو مان لیا جائے کہ یہ کتاب ۱۲۱۵ھ میں مکمل ہو چکی تھی، تو

اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ ۱۳ر مئی ۱۸۰۱ء تک یہ تیار ہو چکی تھی۔ یہ بات معلوم ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں میر امّن کے تقرر کا فیصلہ ۲۹ر اپریل ۱۸۰۱ء کو ہوا تھا اور ۴ر مئی ۱۸۰۱ء کو وہ باضابطہ ملازم ہوئے تھے۔ اُنھوں نے بالصراحت یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب گل کرسٹ کی فرمایش پر لکھی گئی :

"جان گل کرست صاحب نے ..... لطف سے فرمایا کہ اِس قصّے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں .... ترجمہ کرو۔ موافق حکمِ حضور کے میں نے اُسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے" (ص ٦)۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گل کرسٹ نے اِس کام کی فرمایش کب کی تھی ؟ ملازمت کے بعد؟ مگر اِس صورت میں تو یہ ماننا ہوگا کہ میر امّن نے ۴ر مئی کو شروع کر کے ۱۳ر مئی کو (یعنی دس دن میں) اِس کام کو مکمّل کر لیا۔ بہ ظاہر یہ بات ماننے کے قابل نہیں معلوم ہوتی کہ اِتنا بڑا کام دس دن میں مکمّل ہو جائے۔ لامحالہ یہی ماننا پڑے گا کہ ملازمت سے پہلے ہی گل کرسٹ نے اُن سے فرمایش کی ہوگی اور یہ فرمایش اُس وقت کی گئی ہوگی جب اُن کے اپنے قول کے مطابق "منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گل کرست صاحب بہادر کے رسائی ہوئی" تھی۔

آغاز کے سلسلے میں میر امّن نے عبارتِ خاتمہ میں یہ صراحت بھی کی ہے: " جب حساب کیا تو بارہ سو پندرہ ہجری کے آخرِ سال میں کہنا شروع کیا تھا"۔ "آخرِ سال" سے اُن کی مراد کیا ہے، اِس کا قطعی طور پر تعیّن تو مشکل ہے۔ اِس سے سال کا آخری مہینا مراد لیا جا سکتا ہے اور یہ بھی بہ خوبی ممکن ہے کہ آخری دو مہینے مراد لیے گئے ہوں۔ ہم (از روے احتیاط) یہ فرض کیے لیتے ہیں کہ سال کے آخری دو مہینے کی مدّت مراد لی گئی ہے۔ تقویم کے مطابق یکم ذی قعدہ ۱۲۱۵ھ مطابق ہے ١٦ر مارچ ۱۸۰۱ء کے، اور یکم محرّم ۱۲۱٦ھ، ۱۴ر مئی ۱۸۰۱ء کے مطابق ہے۔ اِس حساب کے لحاظ سے یہ ماننا ہوگا کہ ١٦ر مارچ ۱۸۰۱ء سے لے کر ۱۳ر مئی ۱۸۰۱ء کے درمیانی وقفے میں کسی وقت اِس کام کا آغاز ہوا ہوگا اور اِس صورت میں بھی یہی ماننا ہوگا کہ ملازمت (۴ر مئی ۱۸۰۱ء) سے پہلے اِس کام کی فرمایش کی گئی ہوگی۔ لیکن اِس سلسلے میں یہ بات ضرور ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ عبارتِ منقولہ نظرِ ثانی کے بعد کی لکھی ہوئی ہے، اِس لیے اُن کا یہ قول کہ ۱۲۱۵ھ کے آخرِ سال میں کہنا شروع کیا، کچھ زیادہ اہمیت

نہیں رکھتا، اِسے بہ آسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی واضح ہو جانا چاہیے کہ ہندی مینول (یعنی روایتِ اوّل) کے دیباچے کی عبارت سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ دیباچہ لکھا گیا ہے، اُس وقت وہ فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے: "تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب...... کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں۔ نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر، پانو پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دُعا اُس قدر دان کو کرتے ہیں"——

آخری جملے سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ تحریر لکھی گئی ہے، وہ اُس وقت گل کرسٹ کے تحت کام کر رہے تھے۔ اِس عبارت سے پہلے گل کرسٹ کی تعریف کرتے ہوئے اُنھوں نے یہ شعر بھی لکھا ہے:

"سرکار سے دے کے آب و دانا نادان کو بنایا جس نے دانا"

(۱۸۰۴ء کے مطبوعہ نسخے میں یہ شعر شامل نہیں) مصنّفین کا یہ عام انداز رہا ہے کہ مقدمہ یا دیباچہ اصل کتاب کی تکمیل کے بعد لکھتے ہیں۔ سارے قرائن دلالت اِسی پر کرتے ہیں کہ میر امّن نے بھی اِسی روایت کی پابندی کی ہے اور دیباچہ، کتاب کی تکمیل کے بعد لکھا ہے اور یہ بالکل درست ہے کہ جب وہ دیباچہ لکھ رہے تھے، اُس وقت وہ کالج کے ملازم تھے اور گل کرسٹ کی زیرِ نگرانی کام کر رہے تھے۔

اب مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ باغ و بہار کی پہلی روایت ہجری سنہ کے لحاظ سے ۱۲۱۵ھ میں مکمل ہو گئی تھی۔ ۱۲۱۶ھ کا آغاز ۱۴رمئی ۱۸۰۱ء کو ہوتا ہے، اِس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عیسوی سنہ کے لحاظ سے ۱۳رمئی ۱۸۰۱ء تک یہ پہلی روایت مرتّب ہو چکی تھی۔ اُس کے بعد اِس پر نظرِ ثانی کی گئی اور میر امّن کی صراحت کے مطابق ۱۲۱۷ھ کی ابتدا میں نظرِ ثانی کا کام مکمل ہوا۔ "ابتدا" سے اگر سال کے پہلے دو مہینوں کی مدّت بھی احتیاطاً مراد لی جائے، تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مئی جون ۱۸۰۲ء کے دوران نظرِ ثانی کا کام مکمل ہوا تھا [تقویم کے مطابق یکم محرم ۱۲۱۷ھ، ۴رمئی ۱۸۰۲ء کے مطابق ہے]۔ نظرِ ثانی کے بعد اِس کا

تاریخی نام "باغ و بہار" رکھا گیا، جس سے ہجری سنہ ۱۲۱۷ھ نکلتا ہے [پہلے اِس کا نام "چار درویش" تھا]۔ نظرِ ثانی کے بعد میر امّن نے وہ عبارتِ خاتمہ لکھی جس کو اوپر نقل کیا گیا ہے، جس میں اُنھوں نے یہ لکھا کہ یہ کتاب ۱۲۱۷ھ میں مرتّب ہوئی ہے۔ نظرِ ثانی ہی میں اُنھوں نے آخرِ کتاب میں شامل قطعۂ تاریخ کے دوسرے مصرعے میں "۱۲۱۵" کو ۱۲۱۷ سے بدلا، اور اُسی وقت آغازِ کتاب میں شامل روایتِ اوّل کی اُس عبارت میں تبدیلی کی جس کو اوپر نقل کیا گیا ہے۔

روایتِ اوّل میں اُنھوں نے لکھا تھا: "چناں چہ یہ کتاب اِسی سال بہ موجب فرمایش کے تالیف ہوئی"۔ اب اُسے اِس طرح بدل دیا: "اِس واسطے کتنی کتابیں اِسی سال بہ موجب فرمایش کے تالیف ہوئیں" اور اِس طرح "یہ کتاب اِسی سال تالیف ہوئی" کا تعیین ختم ہو گیا۔

اِس کے بعد، اِسی سلسلے میں میر امّن کے ایک اور بیان کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ اُن کی ایک عرضی کتاب کے شروع میں شامل ہے، جس میں اُنھوں نے لکھا ہے:

> "اِس بے وطن نے حکمِ اشتہار کا سُن کر، چار درویش کے قصّے کو، ہزار جدّ و کد سے اُردوے معلّا کی زبان میں باغ و بہار بنایا۔ فضلِ الٰہی سے سب صاحبوں کے سیر کرنے کے باعث سرسبز ہوا۔ اب اُمیدوار ہوں کہ اِس کا پھل مجھے بھی ملے ....."۔

شروع کی سطروں سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "اشتہار کا حکم سُن کر" اُنھوں نے یہ کتاب لکھی؛ لیکن یہ محض اندازِ بیان کی خرابی ہے۔ "اشتہار" سے قطعی طور پر وہ تجویز مراد ہے جسے کالج کونسل نے ۲ر نومبر ۱۸۰۱ء کو منظور کیا تھا، جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اچھی کتابوں پر انعامات دیے جائیں گے۔ اُنھوں نے یہ جو لکھا ہے کہ "چار درویش کے قصّے کو..... باغ و بہار بنایا" یہ واضح طور پر اِس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اُس وقت کی بات ہے جب وہ پہلی روایت پر (جس کا نام "چار درویش" تھا) نظرِ ثانی کر چکے تھے اور اُس کا تاریخی نام "باغ و بہار" رکھ چکے تھے اور یہ عرضی اُنھوں نے اُس وقت لکھی ہے جب اُن کی کتاب انعام کی غرض سے کالج کونسل کے سامنے پیش کی گئی [اِس کی تفصیل "انعام" کے تحت آئے گی]۔ اُن

کا یہ جملہ "سب صاحبوں کے سیر کرنے کے باعث سرسبز ہوا" بھی اِسی پر دلالت کرتا ہے کہ اُس وقت تک کتاب "صاحبوں" کی نظر سے گزر چکی تھی۔

کتاب کا نام :

گل کرسٹ نے ۲۰ جنوری ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل کے نام ایک طویل خط لکھا تھا، جسے عتیق صدیقی نے اپنی محوّلۂ بالا کتاب میں نقل کر دیا ہے (ص ۱۲۵) اُس میں گل کرسٹ نے اِس کتاب کا نام "چار درویش" لکھا ہے۔ گل کرسٹ نے کتابوں کی طباعت کا جو تخمینہ کونسل کے پاس بھیجا تھا (جس کا حوالہ آچکا ہے) اُس میں بھی اِس کا نام "چار درویش" ہے۔ عتیق صاحب نے لکھا ہے: "فورٹ ولیم کالج کی کارروائیوں کے رجسٹر کے مطابق اِس کا نام "چار درویش" ہے" (ایضاً ص ۱۳۰)۔ اِس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب اِس کتاب کی پہلی روایت مکمّل ہوئی تھی، تو اِس کا نام "چار درویش" تھا۔ بعد کو جب میر امّن نے پہلی روایت پر نظرِ ثانی کی، تب اِس کا تاریخی نام "باغ و بہار" رکّھا۔

اِس سلسلے میں بہ ظاہر ایک اشکال سامنے آتا ہے۔ ہندی مینول میں مشمولہ کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے، ایک طرف اُردو رسمِ خط میں اور دوسری طرف (آخر میں) رومن رسمِ خط میں؛ دونوں[1] صفحوں پر اِس کا نام "باغ و بہار" لکھا گیا ہے؛ لیکن درحقیقت اِس میں اشکال نہیں۔ یہ معلوم ہے کہ ہندی مینول ۱۸۰۲ء میں چھپا ہے۔ یہ سالِ طباعت اُس کے سرورق پر مرقوم ہے اور ۱۸۰۲ء کے وسط تک میر امّن نظرِ ثانی کے کام کو مکمّل کر چکے تھے۔ جب مینول کی فہرستِ مضامین تیّار کی گئی [اُس میں شامل کتابوں کے اجزا تو مختلف چھاپے خانوں میں چھپے تھے اور سرورق، صراحت کے مطابق "ہندوستانی پریس" میں چھپا ہے] تو اُس وقت نظرِ ثانی کا کام مکمّل ہو چکا تھا اور "چار درویش" کا نام "باغ و بہار" رکّھا جا چکا تھا۔

---

[1] ہندی مینول کے اِن دونوں صفحوں کا عکس اِس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

باغ و بہار کی تیاری میں مدد اور نثر کی درستی کا دعوا :

دو افراد نے یہ دعوا کیا ہے کہ اُنھوں نے باغ و بہار کی عبارت کی درستی اور اُس کی تیاری میں حصہ لیا ہے۔ پہلا بیان گل کرسٹ کا ہے۔ اُس کے بھیجے ہوئے تخمینے کے مطابق [جس کا حوالہ اوپر آچکا ہے] کتابوں کی چھپائی کے لیے رقم منظور کرنے کے سلسلے میں سکریٹری کالج کونسل نے یہ لکھا تھا: "کالج کونسل نے مجھے یہ ہدایت کی ہے کہ اِس امر سے آپ کو مطلع کردوں کہ .... آئندہ اُس وقت تک نہ تو کوئی کتاب قبول کی جائے اور نہ کوئی رقم اِس مد میں صرف کی جائے، جب تک مسوّدات کالج کونسل کے سامنے پیش نہ کرلیے جائیں ...." [گل کرسٹ اور اُس کا عہد، طبع دوم، ص ۱۲۵] "گل کرسٹ نے اِس جواب کے یہ معنی نکالے اور صحیح نکالے کہ ہندستانی شعبے کے لیے اِتنی بڑی رقم کالج کونسل منظور نہیں کرنا چاہتی" [ایضاً] گل کرسٹ نے اِس خط کے جواب میں جو مفصّل خط لکھا، اُس سے جھنجلاہٹ جھلکی پڑتی ہے؛ اِسی خط میں اُس نے یہ بھی لکھا تھا: "ہندستانی (ادب) حقیقتاً ابھی تک طفولیت کے دور سے گزر رہا ہے۔ اگر اِس وقت شدید کفایت شعاری برتی گئی، تو وہ کبھی پروان نہ چڑھ سکے گا۔ صرف چار درویش کے ساٹھ صفحات تیار کرانے میں مجھے سات آٹھ مہینے تک محنت و توجہ کرنی پڑی ہے۔ اِسی سے اور کتابوں کے متعلق اندازہ لگایا جاسکتا ہے" [ایضاً ص ۱۲۶]۔

گل کرسٹ نے کس انداز سے محنت اور توجّہ کی تھی، اُس کی تفصیل تو معلوم نہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ اُس کے زمانے میں جو کتابیں تیار ہوئی تھیں، وہ اُس کی نگرانی میں تیاری کے مرحلوں سے گزری تھیں۔ اُس کی اِسی عبارت کا آخری جملہ بھی اِس طرف اشارہ کررہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اِس ادارے میں پہلی بار ایک نئے انداز سے منظّم طور پر کام شروع کیا گیا تھا؛ اِس لیے یہ قدرتی بات تھی اور یہ لازم تھا کہ اُس نئے انداز کی نگرانی اور دیکھ بھال پوری طرح

ل ڈاکٹر صدیق الرّحمان قدوائی نے گل کرسٹ سے متعلق جو تحقیقی مقالہ (انگریزی میں) لکھا ہے، اُس میں اُنھوں نے گل کرسٹ کی اصل عبارت بھی لکھی ہے۔

کی جاتی۔ گویا یہ ایک عمومی انداز تھا کتابوں کی ترتیب و تسوید کی نگرانی کا۔ اِس میں عبارت پر نظر ڈالنا اور مشورے دینا بھی شامل ہوگا۔ میرامّن کو اُردو لکھنا تو حسینی اور افسوس بھی نہیں سکھا سکتے تھے [وہ خود میرامّن سے کم درجہ نثر نگار ہیں] ہاں عمومی طور پر مشورے دیے جا سکتے تھے اور مجموعی طور پر رائے ظاہر کی جاسکتی تھی اور گل کرسٹ نے اِسی اندازِ نگرانی کی طرف (غالباً) اشارہ کیا ہے۔

اِس کا اندازہ ایک اور طرح بھی کیا جاسکتا ہے۔ گنجِ خوبی کا جو مخطوطہ میرامّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا لندن میں ہے [جس کا ذکر اوپر آچکا ہے] میرامّن نے اُس پوری کتاب کو گل کرسٹ کے نظامِ املا کے مطابق لکھا ہے۔ اعراب نگاری اور معروف، مجہول اور لین آوازوں کے لیے علامات کی شمولیت کا (بڑی حد تک) اہتمام کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ گل کرسٹ کی ترتیب اور کڑی نگرانی کا اثر ہے۔ [اُس زمانے کی بات چھوڑیے، آج اُردو کے بیش تر مصنّفین کو اِن باتوں سے دور کا بھی علاقہ نہیں] ۔ گل کرسٹ کے ذہن میں نئی نصابی کتابوں کا تصور بہت واضح تھا۔ اُسے شکایت تھی کہ" ابھی ہندستانی نثر میں ایک بھی کتاب ایسی نہیں ہے جو قدر و قیمت یا صحّت کے اعتبار سے اِس قابل ہو کہ میں اپنے شاگردوں کو پڑھنے کے لیے دے سکوں۔ کسی ایسی جگہ سے شہد نکالنا میرے بس کی بات نہیں ہے جہاں مکّھیوں کا کوئی چھتّا ہی نہ ہو" [گل کرسٹ کے ایک خط کا اقتباس : گل کرسٹ اور اُس کا عہد، طبعِ دوم، صفحہ ۱۲۸]۔ باغ و بہار کے پیش لفظ میں اُس نے نوطرزِ مرصّع کی عبارت کے متعلّق بُری رائے ظاہر کی ہے۔ اِن باتوں کے پیشِ نظر، پہلا کام تو اُس نے یہی کیا ہوگا کہ طرزِ تحریر کی طرف توجّہ دلائی ہوگی اور مرتّبین کو بتایا ہوگا کہ اسلوبِ تحریر کا احوال اور انداز کیا ہونا چاہیے [اِس کا اعتراف میرامّن نے باغ و بہار کے دیباچے میں کیا ہے] ۔ بار بار اُس پر نظر بھی ڈالی ہوگی اور اپنے اندازِ نظر کے مطابق مشورے بھی دیے ہوں گے۔ اِس طرح ہم بہ آسانی کہہ سکتے

لہ باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل کے آخر میں انگریزی میں جو ورق ہے، اُس کے پہلے صفحے پر (جو گویا ٹائٹل پیج ہے) یہ بھی مرقوم ہے:
Under the Superintendence of John Gilchrist.
اِس سے بھی یہی ظاہر کرنا مقصود ہے۔

ہیں کہ باغ و بہار (اور دوسری کتابوں) کی تیاری گل کرسٹ کی عمومی ہدایات کے تحت کی گئی اور اُس کی نگرانی میں وہ مرتب[1] ہوئیں۔ اِس میں بُنیادی طور پر عبارت کے انداز اور بیان کے اسلوب پر توجہ کی گئی ہوگی اور مشورے دیے گئے ہوں گے؛ یعنی اُردو پن اور چلن کا پہلو نمایاں رہے۔ روایتی مشکل نگاری، بے جا آرایش پسندی اور صنعت گری سے پرہیز کیا جائے، وغیرہ۔ گل کرسٹ کے مندرجۂ بالا قول کا مطلب میرے نزدیک یہی ہے۔

دوسرے شخص میر شیر علی افسوس ہیں۔ آرایشِ محفل کے دیباچے میں اُنھوں نے یہ لکھا ہے کہ گل کرسٹ کے حکم کے مطابق اُنھوں نے متعدد کتابوں کی اصلاح کی ہے [اُن کی صراحت کے مطابق اِن کتابوں کی تعداد چھے ہے]۔ اِس کتاب کا جو مطبوعہ نسخہ ہے، اُس میں تو صرف یہ عبارت ملتی ہے:

> "جب میں "باغِ اُردو" کی تحریر سے فراغت پاچکا، صاحب مدرسِ ہندی مسٹر جان گل کرسٹ بہادر دام لطفہ نے .... فرمایا فی الواقع تو اِس فن میں دستگاہِ کامل رکھتا ہے .... اب جتنی کتابیں کہ لوگوں کی تالیف ہیں یا ترجمے، تو اُنھیں اصلاح دے۔ زنہار اِس امر میں کسی کی خاطر نہ کرنا۔ اُن کی صحت و غلطی کی پُرسش تجھی سے ہوگی، مولّفوں مترجموں سے کچھ علاقہ نہیں۔ میں مجبور تھا، حکم اُن کا رد نہ کر سکا۔ طوعاً کرہاً اِس کام میں مشغول ہوا۔ چناں چہ چار کتابیں تو بالکل درست کیں، تفصیل اُن کی دیباچۂ رقمی میں لکھ چکا ہوں اور ایک آدھ کے چلتے ہی مربوط کر دیے۔ بعد اُس کے اِس کام سے دست بردار ہوا کہ محنت برباد گنہ لازم جس کا نتیجہ ہو، وہ بے فائدہ ہے" [آرایشِ محفل، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۳]۔

یعنی مطبوعہ نسخے میں اُن کتابوں کی تفصیل نہیں لکھی گئی۔ اِس کی وجہ بھی اُنھوں نے اِسی دیباچے میں لکھ دی ہے: "بعضے مولّفین و مترجمین نے چھاپے کے وقت جو درخواست کی کہ نام کتبِ مسطورہ کے اگر دیباچے میں رہیں گے تو ہماری کسرِ شان ہوگی۔ ناگزیر اُن کے پاسِ خاطر (کذا)، راقم نے صفحۂ تحریر سے نکال ڈالے" [ایضاً ص ۶]۔ اِس کی نشان دہی اُنھوں نے

[1] ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی نے اپنے محوّلۂ بالا تحقیقی مقالے میں بھی یہی راے ظاہر کی ہے [ص ۹]۔

ضرور کر دی کہ خطّی نسخے میں یہ تفصیل موجود ہے اور یہ واقعہ ہے کہ موجود ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتاب خانے میں اِس کتاب کا جو خطّی نسخہ محفوظ ہے [نمبر U/108 - اُس پر فورٹ ولیم کالج کی مُہر ثبت ہے] اُس کے دیباچے میں افسوس کی مکمّل عبارت موجود ہے:

"......طوعاً کرہاً اِس کام میں مشغول ہوا، چناں چہ نثرِ بے نظیر، قصّۂ گل بکاولی، مادھونل، توتا کہانی، قصّۂ حاتم، قصّۂ چار درویش کو واجبی واجبی درست کیا، یعنے جس میں جتنی غلطی دیکھی، صحیح کی۔ ماجرا اِس کا یوں ہے کہ قصّہ چار درویش کا تو محاورے میں اکثر درست و عبارت اُس کی نہایت چُست تھی، جوں کی توں رہی، پر کہیں کہیں جملے بے ربط تھے، سو مربوط کر دیے۔ اور توتا کہانی، حاتم کا قصّہ بھی علیٰ ہٰذا القیاس محاورے میں ٹھیک تھا، کیوں کہ مترجم ان کا بھی زباں داں بلکہ شاعر بھی ہے، لیکن بہ سبب بے پروائی و سہل انگاری کے اس نے اصل سے جو مطابق نہ کیا، اس لیے عبارت بیش تر بدلی گئی۔ اور مادھونل کا تو مترجم زباں دانی میں کامل صاحبِ دیوان لیکن ترجمے کے وقت اُنے شاید مطابقت کا قصد نہ کیا۔ یا تو للّو سری لال کب، کہ معاون تھا، وہی اس بات پر متوجہ نہ ہوا، الغیب عند اللہ۔ بنابر اس کے، نئے سر سے بنانے میں آیا۔ کچھ فقرے رہ گئے ہوں تو رہ گئے ہوں۔ اور نثرِ بے نظیر بھی چھاپے کے وقت اسی طرح درست کرنے میں آئی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بے رنگ تھی اور نظم بھی اس کی نہایت رنگین، صنائعُ بدائعُ سے بھری ہوئی، میر حسن سا شاعر اس کا مصنّف، اور مولّف اس کا فنِ شاعری سے ماہر نہ تھا، بنابراس کے مطابق اُس کے نہ کر سکا، ہاں اپنی وضع کی ایک کتاب جُدی لکھی، چناں چہ اکثر صاحبوں کے پاس وہ موجود ہے۔ اور قصّہ گل بکاولی کا، یعنے مذہبِ عشق، ہر چند کہ اس کے مترجم کو نثر نویسی کا سلیقہ بھلا چنگا تھا، لیکن اصل سے اس کو اس نے بھی اکثر جاگہ مطابق نہ کیا۔ نظم کو تو بیش تر چھوڑ دیا، بلکہ کئی مقام نثر کے بھی ترجمہ نہ کیے تھے۔ سوا اس کے، اس زبان کی جمیع طرزوں سے بھی واقف نہ تھا، لہٰذا مضمونِ رنگیں

اس قصّے کا اُتنے رنگت کے ساتھ بندھ نہ سکا۔ قصہ کوتاہ، اِس ہیچ مداں کو از بس کہ
اس کا مضمونِ عالی پسند آیا، بے اختیار جی لگ گیا، اِس لیے موافق اُس کے مرتبے
کے عبارت تمام وکمال بہ طرزِ شاعری درست کی۔ لیکن جہاں مترجم کی بھی عبارت
اُسی وضع پر دیکھی، رہنے دی، کیوں کہ کچھ اپنے تئیں تعصّب نہ تھا، فقط اِس قصّے
کا بنانا منظور تھا۔ پر نام اِس لیے داخل نہ کیا کہ نثرِ بے نظیر میں ہر گاہ کہ یہ امر نہ
ہوا، تو کسی میں نہ ہو، چنانچہ کسی کتاب کے آخر (کذا) اپنا نام ثبت نہ کیا۔ ساتھ
اِس کے اِس کام سے دست بردار بھی ہوا کہ محنت برباد گنہ لازم جس کا نتیجہ ہو، وہ
بے فائدہ ہے[1]۔"

[خاص ناموں پر خط میں نے کھینچے ہیں، نیز کاما، فل اسٹاپ اور اضافت کے
زیر بھی میں نے لگائے ہیں]۔

یعنی افسوس نے گل کرسٹ کے حکم کے مطابق چھپے کتابوں کو بہ نظرِ اصلاح دیکھا۔
چار درویش کے متعلق اُنھوں نے [مصنّفانہ دیانت کے ساتھ] یہ صراحت کردی ہے کہ
"عبارت اُس کی نہایت چست تھی، جوں کی توں رہی"، بس کچھ بے ربط جملوں کو درست
کیا گیا؛ اِس "اصلاح" کی حیثیت قطعی طور پر ضمنی ہے بل کہ صحیح معنوں میں اِسے "اصلاح"
سے تعبیر ہی نہیں کرنا چاہیے، یہ سمجھنا چاہیے کہ بعض جملوں کے دروبست کے متعلق ایک
انشاپرداز اور مصنّف نے اپنی راے ظاہر کی ہے۔ یہ عام بات ہے کہ کتنے ہی بڑے انشاپرداز
کی عبارت کو دوسرا اچھا انشاپرداز دیکھے گا، تو وہ بعض [یا بہت سے] مقامات پر اپنے
اندازِ نگارش اور اپنے مختارات کی روشنی میں اُن مقامات کو اس نظر سے دیکھ سکتا ہے کہ اِس جملے کو

[1] یہ اعتراف ضروری ہے کہ مجھے پہلی بار آرایشِ محفل کے اِس خطّی نسخے کے وجود کی اور اس میں موجود
اِس منقولہ عبارت کی اطّلاع ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے تحقیقی مقالے فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات [سالِ طبع
۱۹۸۳ء] سے ملی تھی مگر مصنفہ نے بہت اجمال کے ساتھ اس کا حوالہ دیا ہے۔ حُسنِ اتّفاق سے مجھے
جنوری ۱۹۸۵ء میں مغربی بنگال انجمن ترقّیِ اُردو کی کانفرنس کے سلسلے میں کلکتے جانا پڑا۔ میں نے وہاں ایشیاٹک
سوسائٹی کے کتاب خانے میں اِس مخطوطے کو نکلوا کر دیکھا اور اُس سے اِس عبارت کو نقل کیا۔ بہ ہر حال تقدّم کا
شرف مصنّفہ کو حاصل ہے۔

یوں لکھا جاتا تو بہتر ہوتا'، یا یہ کہ میں لکھتا تو یوں لکھتا۔ اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسے مقامات پر لازماً کوئی غلطی ہوتی ہے اور پھر ہر مصنف کا اپنا اندازِ نظر اور اپنا طرزِ بیان ہوتا ہے۔ جہاں تک میر امّن کا تعلق ہے، تو افسوس کے مقابلے میں وہ چلن کے زیادہ قائل تھے اور اُن کی تحریر میں افسوس اور حسینی (وغیرہ) سے کہیں زیادہ [اور بہتر طور پر] استعمالِ عام کی روشنی پھیلی ہوئی نظر آتی ہے [اور سلاست و فصاحت کی بھی]۔ صاحبِ سیر المصنفین نے اِن الفاظ میں اِس کو بیان کیا ہے:

"میر امّن کے طرزِ بیان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ محاورے اور روزمرّہ کے آگے قواعدِ زبان کی پروا نہیں کرتے۔ بہادر علی اور میر امّن میں ایک خاص فرق یہی ہے کہ حُسینی قواعدِ زبان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اُن کے فقرے طولانی اور بے مزہ ہو جاتے، مگر وہ آگے پیچھے کے دو چار لفظ محذوف کر کے قواعد کی خلاف ورزی کرنا نہیں چاہتے اور میر امّن اِس کے برخلاف بول چال کی زبان کو ترجیح دیتے ہیں۔" [ص ۵۸]۔

افسوس نے جو کچھ لکھا ہے، اُسے اِسی روشنی میں دیکھنا[1] چاہیے۔

---

[1] معلوم نہیں میر امّن نے اُس اصلاح کو قبول بھی کیا تھا یا نہیں۔ میر امّن نے اپنے آپ کو ہر جگہ "میر امّن دلّی والا" لکھا ہے۔ کوئی مقام ہو، وہ "دلّی والا" کے بغیر اپنا نام نہیں لکھتے۔ بہ ظاہر یہ التزام سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ کلکتے کے اُس مجمعے میں، جہاں کئی دوسرے لوگ، جو اُن کے خیال میں دلّی والے [یعنی اہلِ زبان] نہیں تھے، یا ویسے دلّی والے نہیں تھے جیسا وہ اپنے آپ کو سمجھتے تھے؛ وہ لوگ درجے کے لحاظ سے اُن پر فوقیت رکھتے تھے۔ اِس صورتِ حال میں وہ ایک طرح سے اپنی برتری کا اظہار اور اعلان کرنا چاہتے ہیں۔ باغ و بہار کے آخر میں اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی اِسی جذبے کا مظہر ہے؛ ورنہ اُس مقام پر اِس اظہار کا کوئی محل نظر نہیں آتا۔

میں کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ میر امّن سے اگر اِس "اصلاحِ بے ربطی" کے متعلق دریافت کیا جاتا، تو غالباً وہ [مُنہ بنا کر] یہی کہتے کہ "بہت سے ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلّی میں گئے اور رہے؛ وہ بھی کہاں تک بول سکیں گے، کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے۔ اور جو شخص سب آفتیں ←

اِس سلسلے میں ایک اور بات ذہن میں آتی ہے؛ لیکن پہلے بہ طورِ تمہید، گنجِ خوبی کے اُس مخطوطے کے متعلق چند الفاظ کہنا ضروری ہیں جو میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور جس کا عکس میرے سامنے ہے۔ اِس تمہیدی عبارت کے بغیر وہ بات اچھی طرح معرضِ بیان میں نہیں آپائے گی۔

گنجِ خوبی کے اِس مخطوطے میں گِل کرسٹ کے نظامِ املا کی پابندی کی کوشش نظر آتی ہے۔ واقعی تعجب ہوتا ہے کہ میر امّن، جو بُڑھاپے کے عالم میں وہاں پہنچے تھے، اُن کو ڈیڑھ دو سال ہی میں گِل کرسٹ نے اپنے سانچے میں اِس طرح ڈھال لیا تھا کہ اُن کی تحریر میں اعراب اور علامات نے بڑی حد تک دخل پالیا۔ میں بہ طورِ مثال گنجِ خوبی کے مخطوطے سے دو جملے (مطابقِ اصل) نقل کرتا ہوں۔ کتاب کا پہلا ہی جملہ ہے : "مخلوق کی کیا مجال جو خالق کے اخلاق اور اوصاف بیان مَیں لاوے" ——— "کیا" میں "یاے مشموم"، "مَیں" اور "جو" میں واوِ مجہول، "اوصاف" میں واوِ لین، "مخلوق" میں واوِ معروف کی صورت نویسی اور "مَیں" میں نونِ غنّہ کا نقطے سے خالی رہنا؛ یہ سب گِل کرسٹ کے نظامِ املا کے عین مطابق ہے ——— اِسی صفحے پر دوسرا جملہ ہے: "حُسنِ خُلق

←

سہ کر، دلّی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اُسی شہر میں گزریں، اور اُس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں، سیر تماشا اور کوچہ گردی اُس شہر کی مدّت تلک کی ہوگی، اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا؛ اُس کا بولنا البتّہ ٹھیک ہے۔" ——— کلکتّے کے اُس مجمع میں تو بہ ظاہر ایسا کوئی دوسرا شخص نظر آتا نہیں جو میر امّن کے اِس معیار پر پورا اُترتا ہو۔ [افسوس پیدا ضرور دہلی میں ہوئے تھے، مگر گیارہ سال کی عمر میں دہلی سے باہر چلے گئے تھے اور اُن کی بھی دس پانچ پشتیں یہاں نہیں گزری تھیں۔] ——— ایک بات اور : مرزا رجب علی بیگ سرور کو اگر یہ بات معلوم ہو جاتی کہ افسوس نے (جنھوں نے نشوونما لکھنؤ میں پائی تھی) میر امّن کے بے ربط جملوں کی اصلاح کی تھی؛ تو اللہ جانے وہ اور کیا لکھتے اور کیا طوفان اُٹھاتے، جب کہ اِس علم کے بغیر ہی اُنھوں نے یہ لکھا ہے کہ میر امّن نے محاوروں کے ہاتھ پانو توڑے ہیں۔

میں بے بدل ہے؛ چنانچہ خُلقِ محمدی ضربُ المَثَل ہے؛"۔ "ہے" میں کشتی دار ی کی صورت اور "ضرب المثل" میں الف کے نیچے خط اُسی تربیت کا نتیجہ ہے۔

لیکن سوالیہ نشان اور ندائیہ نشان اُن کی تحریر میں کہیں نظر نہیں آتے، نیز کاما اور فُل اسٹاپ، دونوں کے لیے صرف ایک نشان ؛ اُنھوں نے استعمال کیا ہے۔
اِس مخطوطے کے شروع کے صفحوں میں جزمِ مدوّر اور جزمِ غیر مدوّر جس التزام کے ساتھ ملتے ہیں، آخر تک اُن کے التزام کی یہ صورت بھی باقی نہیں رہی ہے؛ البتہ آخرِ لفظ میں واقع یاے معروف، یاے مجہول اور یاے لین کی کتابت میں آخر تک یکسانی برقرار رہی ہے اور اُنھیں گل کرسٹ کے نظامِ املا کے مطابق ہی لکھا گیا ہے۔ جن لفظوں میں ہاے مخلوط ہے، اُسے عموماً دو چشمی صورت میں لکھا گیا ہے؛ البتہ ایسے بعض الفاظ کا املا (پُرانی عادت کے مطابق) باغ و بہار کے املا سے مختلف ہے؛ مگر ایسے لفظوں کی تعداد کم ہے۔

پیراگراف پوری کتاب میں کسی ایک جگہ نہیں بنایا گیا ہے۔ پہلی سطر سے آخری سطر تک پوری کتاب میں عبارت مسلسل لکھتے چلے گئے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ جہاں سے نیا باب شروع ہوتا ہے، وہاں بھی نئی سطر سے اُسے شروع نہیں کیا [اور یہ بھی پُرانی عادت کا اثر ہے]۔
اِس مخطوطے کو دیکھ کر مجھے یہ واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ میر امّن نے تو باغ و بہار کو گل کرسٹ تک رسائی کے بعد ہی شروع کر دیا تھا اور اُس وقت تک وہ اُس کے نظامِ املا سے پوری طرح روشناس نہیں ہو سکے ہوں گے اور اُنھوں نے جو متن تیار کیا ہوگا، وہ گل کرسٹ کے نظامِ املا کے مقابلے میں، زیادہ تر اُن کی عادت اور روش کے مطابق کاغذ پر آیا ہوگا۔ اُس نگارش میں رُموزِ اوقاف، علامات اور اعراب کی پابندی اور یکسانی کو اُس نے مکمّل کیا ہوگا۔

میر امّن نے گنجِ خوبی کو باغ و بہار کے بعد لکھا ہے۔ جب وہ دو سال سے زیادہ اُس کے زیرِ نگرانی متن تیار کرنے کے بعد بھی، اپنے دوسرے مخطوطے میں [جو اُس زمانے میں شائع نہیں ہوا تھا] آخر تک اُس کے نظامِ املا کی مکمّل طور پر پابندی نہیں کر سکے، تو یہ بات

بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ شروع شروع میں اُنھوں نے جس متن کو اپنے قلم سے لکھا ہوگا؛ رموزِ اوقاف، علامات اور یکسانیِ املا کے لحاظ سے اُس کا احوال وہ نہیں ہوگا، جو اُس مطبوعہ نسخے [کے] کا ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ اِس سے گل کرسٹ کے اُس قول کی صحت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور کیا جاسکتا ہے۔

فی الوقت ہمیں یہ نہیں معلوم کہ پریس میں جو فرمے کمپوز ہوتے تھے، اُن کی تصحیح کا کیا انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں کی چھپی ہوئی تین[۳] کتابیں اِس وقت میرے سامنے ہیں[۱]: ہندی مینول، باغ و بہار، مثنوی سحر البیان [سالِ طبع ۱۸۰۵ء، لیکن میر شیر علی افسوس کے مقدمے میں یہ صراحت موجود ہے کہ اُنھوں نے اِسے (گل کرسٹ کے حکم کے مطابق) ۱۸۰۳ء میں مکمّل کر لیا تھا، یعنی اِس کا مسوّدہ گل کرسٹ کی موجودگی میں مکمّل ہو چکا تھا] - اِن تینوں مطبوعہ کتابوں میں املا، علامات اور رُموزِ اوقاف کا جو یکساں انتظام اور اہتمام نظر آتا ہے، اُس سے یہی خیال ہوتا ہے کہ گل کرسٹ مسوّدے کو اور پھر کمپوز شدہ فرموں کو بہ طورِ خود دیکھتا ہوگا اور تصحیح کرتا ہوگا۔ اِس تصحیح کا تعلّق عموماً علامات و رُموزِ اوقاف اور اِن کے متعلّقات سے ہوتا ہوگا، اور املا کی اُن پابندیوں سے جن کو اُس کے مرتّبہ نظامِ املا میں بنیادی حیثیت حاصل تھی؛ مثلاً ہاے ملفوظ و مخلوط کا امتیاز اور یاے معروف و مجہول و لین کی شکل صورت، اور اِسی طرح کے دوسرے املائی رُموز اور اُمور۔

اِن باتوں کے پیشِ نظر مجھے گل کرسٹ کے اِس قول میں کوئی مبالغہ نظر نہیں آتا کہ اُس نے باغ و بہار کے پیشِ نظر صفحات کی تیّاری پر اچھا خاصا وقت صرف کیا ہوگا۔ اِس بات کو ماننے میں بھی تامّل نہیں ہونا چاہیے کہ شروع کا یہ زمانہ گویا میر امّن کی ٹریننگ کا تھا کہ اُن کو ایک نئے نظامِ املا سے روشناس کرایا جا رہا تھا اور اُس کا عادی بنایا جا رہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو رُموزِ اوقاف، علامات اور یکسانیِ املا کا وہ احوال نہ ہوتا جو ہمارے سامنے ہے اور اِن کتابوں کا بھی وہی حال ہوتا جو دوسرے اداروں اور مطبعوں کی چھپی ہوئی کتابوں کا ہے۔

---

[۱] یعنی ہندی مینول میں شامل باغ و بہار کی روایتِ اوّل کے ۱۰۲ صفحے۔

انعام :

"کالج کونسل نے ۲؍نومبر ۱۸۰۱ء کو ایک تجویز منظور کی تھی، جس میں یہ کہا گیا تھا کہ دیسی زبانوں میں ادبی کتابوں کی تصنیف و تالیف کی ہمّت افزائی کے خیال سے متبحر دیسی لوگوں کو انعامات دیے جائیں" [گل کرسٹ اور اُس کا عہد، طبع دوم، ص ۱۳۲] ---
اِس کے تحت کالج کونسل نے ۳۱؍اگست ۱۸۰۲ء کو یہ فیصلہ کیا کہ: "فاضل دیسی میرامّن، جو کالج سے وابستہ ہیں، اُن کو چہار درویش کے ہندستانی ترجمے کے لیے، جسے ہندستانی پروفیسر نے آج ہی پیش کیا ہے، پانچ سو روپے دیے جائیں" [ایضاً]۔ یعنی میرامّن کو اپنی اِس کتاب پر پانچ سو رُوپے بہ طورِ انعام کالج کونسل کی طرف سے ملے تھے۔

اِس سلسلے میں دُو باتیں وضاحت طلب ہیں۔ منقولہ عبارت کا یہ ٹکڑا "جسے ہندستانی پروفیسر نے آج ہی پیش کیا ہے"، یہ تحریر ۳۱؍اگست ۱۸۰۲ء کی ہے۔ یہ بات اوپر زیرِ بحث آچکی ہے کہ اِس کتاب کی دوسری [یعنی نظرِ ثانی شدہ] روایت تقریباً وسطِ ۱۸۰۲ء تک مکمّل ہو چکی تھی، اِس صورت میں یہ مان لینا قطعی طور پر قرینِ قیاس ہو گا کہ "۳۱؍اگست ۱۸۰۲ء" کو جو نسخہ پیش کیا گیا، وہ نظرِ ثانی شدہ روایت تھی۔ اِس پر ایک دلیل یہ بھی لائی جا سکتی ہے کہ میرامّن کی جو عرضی کتاب کے شروع میں شامل ہے، اُس میں اُنھوں نے صراحتاً لکھا ہے کہ "چار درویش کے قصّے کو ..... باغ و بہار بنایا"۔ یہ قطعی طور پر اِس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ وہ نسخہ تھا جس کا نام "باغ و بہار" رکھا جا چکا تھا اور یہ عرضی ملازمت حاصل کرنے کے سلسلے کی نہیں، بل کہ انعام حاصل کرنے کے سلسلے کی کڑی ہے ——— دوسری بات: اُس وقت تک کتاب تو مکمّل صورت میں چھپی نہیں تھی، اِس لیے ظاہر ہے کہ اِس کا خطّی نسخہ پیش کیا گیا ہو گا۔

باغ و بہار۔ ترجمہ، تالیف یا تصنیف :

میرامّن نے باغ و بہار کے دیباچے میں لکھا ہے: "یہ قصّہ چار درویش کا ابتدا

میں امیر خسرو ..... نے کہا تھا۔ اب خداوند نعمت .... جان گل کرسٹ صاحب نے .... لطف سے فرمایا کہ اِس قصّے کو ٹھینٹھ ہندوستانی گفتگو میں .... ترجمہ کرو۔" آخری جملے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب فارسی متن کا ترجمہ ہے؛ لیکن یہاں بھی اندازِ بیان کا ویسا ہی پیچ ہے، جو اُن کی عرضی میں ہے، جس کے ایک جملے سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ کالج کونسل کا انعامی اشتہار شائع ہونے کے بعد اُنھوں نے اپنی کتاب [باغ و بہار] لکھی ہے؛ حالاں کہ حقیقت یہ نہیں۔ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اپنی یہ کتاب اُس اشتہار کے مطابق، انعام کے لیے پیش کر رہے ہیں ___ صحیح صورتِ حال کی مکمل وضاحت ہو جاتی ہے اِس کتاب کے پہلے اڈیشن کے سرورق کی اِس عبارت سے :

"باغ و بہار .... ماخذ اُس کا نوطرزِ مرصّع وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے فارسی قصۂ چار درویش سے۔"

[سرورق کا عکس اِس کتاب میں شامل ہے] اِس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نوطرزِ مرصّع، فارسی قصۂ چہار درویش کا ترجمہ ہے اور باغ و بہار کا ماخذ نوطرزِ مرصّع ہے۔

گل کرسٹ کے لکھے ہوئے پیش لفظ ["PREFACE"] کا جو ایک صفحہ باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل کے آخر میں شامل ہے، اُس میں یہی بات گل کرسٹ نے واضح تر انداز میں لکھی ہے۔ خلاصہ اُس کا یہ ہے کہ فارسی میں امیر خسرو کا لکھا ہوا قصۂ چہار درویش ایک زمانے سے مقبول رہا ہے۔ عطا حسین خاں[1] نے نوطرزِ مرصّع کے نام سے اُس کا ترجمہ کیا۔ اُس ترجمے کی زبان مغلق اور مرصّع تھی ___ یہ موجودہ روایت

---

[1] سرورق پر اور "پیش لفظ" میں یہی نام ہے؛ لیکن نوطرزِ مرصّع کے دیباچے میں اُنھوں نے اپنا نام "میر محمد حسین عطا خاں" لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔ نوطرزِ مرصّع کے مرتّب ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے اپنے مقدّمے میں نام سے متعلق ضروری تفصیل لکھ دی ہے۔

["THE PRESENT VERSION"] اُسی مذکورہ ترجمے سے میر امّن نے تیار کی ہے [اِس صفحے کا عکس بھی اِس کتاب میں شامل ہے]۔

مولوی عبدالحق مرحوم نے بھی یہی لکھا ہے۔ فارسی قصۂ چہار درویش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "میر امّن کی باغ و بہار اسی کتاب کا ترجمہ کہی جاتی ہے اور وہ خود بھی یہی کہتے ہیں .... لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فارسی کا ترجمہ نہیں۔ قصہ وہی ہے، مگر اِس کا ماخذ بجاے فارسی کے، اُردو کی کتاب نوطرزِ مرصّع ہے" [مقدمۂ باغ و بہار، طبعِ دوم (۱۹۴۴ء)، ص ۳]۔

یعنی یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ باغ و بہار ترجمہ نہیں۔ میر امّن نے اصلاً نوطرزِ مرصّع کو سامنے رکھا ہے اور قصّے کو اپنی زبان اور اپنے خاص انداز میں لکھا ہے۔ مذہبِ عشق فارسی سے ترجمہ کیا ہوا داستانی قصہ ہے، اُسے سب نے ترجمہ ہی کہا ہے؛ مگر اِسی ترجمے [یعنی مذہبِ عشق] کو سامنے رکھ کر، پنڈت دیا شنکر نسیم نے اُس داستانی قصّے کو اختصار اور خاص پیرایۂ اظہار کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے اور اُن کی کتاب گلزارِ نسیم کو کوئی شخص ترجمہ نہیں کہے گا، کسی نے کہا بھی نہیں ہے؛ اُسے تصنیف کہا جاتا ہے اور وہ ہے بھی تصنیف۔ یا مثلاً مرزا غالب کو تاریخی حالات حکیم احسن اللہ خاں نے فراہم کیے تھے، مرزا صاحب نے اُن کو اپنی زبان اور اپنے انداز میں لکھا اور اُس کا نام مہرِ نیمروز رکھا؛ تو اِس کتاب [مہرِ نیمروز] کو تالیف نہیں کہا گیا، مرزا صاحب کی تصنیف کہا گیا ہے۔ مقصود اِس سے یہ ہے کہ جس طرح گلزارِ نسیم ترجمہ نہیں، تصنیف ہے اور جس طرح مہرِ نیمروز تالیف یا ترجمہ نہیں، تصنیف ہے؛ اُسی طرح باغ و بہار کو بھی [جو ترجمہ تو خیر ہے ہی نہیں] تالیف کے بجاے تصنیف کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ میر امّن کی نثر میں ایسی تخلیقی شان اور ایسا تصنیفی انداز نمایاں ہے، جس کی مثالیں کم یاب ہیں۔ یہاں اوسط درجے کے یا اُن سے بہتر درجے کے نثر نگاروں کا ذکر نہیں، یہاں میر امّن کا تذکرہ ہے، جن کی نثر میں تخلیقی انداز ہے اور اِس نثر نے اِس قصّے کو ایسی کتاب کا درجہ بخش دیا ہے جسے بلا تکلّف تصنیف کہا جا سکتا ہے، جب کہ

ان کی دوسری کتاب گنجِ خوبی کو ترجمہ ہی کہا گیا ہے اور وہ واقعتاً ترجمہ ہے۔ زبان میر امّن کی ہے اور بیان بھی اُن کا اپنا ہے؛ لیکن وہ اصل فارسی عبارت سے سرِمو تجاوز نہیں کرتے۔ اصل سے اِس قدر وفاداری نے، زبان اور بیان کی کئی خوبیوں کے باوجود، اُسے ترجمے کی سطح سے اوپر نہیں اُٹھنے دیا ہے؛ جب کہ باغ و بہار میں وہ ایک قصّے کو اپنے طور پر لکھتے ہیں اور اُس کی جُزئیات میں بھی دخل دیتے چلے جاتے ہیں اور قصّے کو لکھتے اِس طرح ہیں کہ اُس کا قالب بدل جاتا ہے۔ اس عمل نے اِس کتاب کو تصنیف کے درجے پر پہنچا دیا ہے[1]۔

---

[1] مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے محوّلہ بالا مقدمے میں باغ و بہار اور نوطرزِ مرصّع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "اصل میں ترجمہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں، فارسی قصّے کو اپنی اپنی زبان میں بیان کر دیا ہے۔" یہ واقعہ ہے کہ اگر خالص تکنکی انداز سے دیکھا جائے تو نوطرزِ مرصّع کو ترجمہ کہنا مشکل اور بہت مشکل ہے۔ صحیح صورت یہی ہے کہ تحسین، فارسی کے قصّۂ چہار درویش کو، کہانی کی حد تک فارسی متن کے مطابق اپنی زبان میں لکھتے چلے گئے ہیں۔ یعنی فارسی عبارت کی پابندی نہیں کرتے، صرف قصّے کی پابندی کرتے ہیں۔ یوں کہنا یہ چاہیے کہ نوطرزِ مرصّع، فارسی قصّے کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے، یا یوں کہیے کہ فارسی قصّے پر مبنی ہے، اور میر امّن نے بنیادی طور پر نوطرزِ مرصّع کو سامنے رکھ کر، اُسی قصّے کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ جس طرح نوطرزِ مرصّع زبان اور بیان کی حد تک فارسی قصّے سے مختلف ہے ـــــ اُسی طرح باغ و بہار، نوطرزِ مرصّع سے مختلف ہے ـــــ یہاں یہ بات ضرور ذہن میں رہنا چاہیے کہ میر امّن نے اصلاً نوطرزِ مرصّع کو اپنے سامنے رکھا ہے، لیکن کوئی فارسی نسخہ بھی اُن کے سامنے ضرور تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے صفی کے قصّۂ چہار درویش سے جو اقتباسات پیش کیے ہیں، بہ ظاہر تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہی نسخہ میر امّن کے سامنے رہا ہوگا۔ کلکتّے کی ایشیاٹک سوسائٹی میں صفی والے قصّۂ چہار درویش کا خطّی نسخہ موجود ہے، جو اصلاً فورٹ ولیم کالج کی ملکیت تھا؛ اُس سے بھی اِس امکان کی تائید کا ایک قرینہ سا نکلتا ہے کہ میر امّن کے سامنے شاید یہی نسخہ ہوگا۔ قطعی بات سب خطّی نسخوں کو دیکھنے کے بعد ہی کہی جا سکتی ہے۔

امیر خسرو سے منسوب روایت :

قصّے کے ماخذ کے بارے میں میر امّن نے لکھا ہے کہ : "یہ قصہ چار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اِس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا .... جو اُن کے پیر تھے .... اُن کی طبیعت ماندی ہوئی؛ تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور بیمار داری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی، تب اُنھوں نے غسلِ صحّت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اِس قصّے کو سُنے گا، خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔ جب سے یہ قصہ فارسی میں مروّج ہوا" [ص ۵]۔

"یہ قصہ ہمیشہ کہتے" سے لازمی طور پر یہ مطلب نہیں نکلتا کہ یہ تصنیف بھی اُنھی کی ہے؛ لیکن اِس ٹکڑے سے عام طور پر یہی مطلب مراد لیا گیا ہے اور غالباً میر امّن کا مقصد بھی یہی تھا کہ یہ قصہ امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ شیرانی صاحب نے اِس سے متعلق جو مضمون لکھا تھا اور جو پہلی بار رسالۂ کارواں [لاہور] کے سال نامے [۱۹۳۳ء] میں شائع ہوا تھا[1]، اُس میں تفصیل کے ساتھ اِس پر بحث کی ہے اور حتمی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اِس قصّے سے امیر خسرو کا کچھ تعلّق نہیں۔ یہ واقعی دل چسپ بات ہے کہ اب تک کی معلومات کے مطابق میر امّن واحد شخص ہیں جنھوں نے یہ بات لکھی ہے۔ نوطرزِ مرصّع میں اِس روایت کا ذکر نہیں [جو میر امّن کا اصل ماخذ ہے]۔ مولوی عبدالحق صاحب نے چہار درویش کے جس فارسی نسخے سے اپنے مقدمۂ باغ و بہار میں اختلافات کا حوالہ دیا ہے، اُس میں اِس کا وجود نہیں اور شیرانی صاحب کے سامنے چہار درویش کا جو نسخہ تھا، وہ بھی اِس روایت سے خالی تھا۔ زرّیں نے بھی فارسی قصۂ چہار درویش کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اُس ترجمے کو دیکھا ہے، وہ بھی اِس روایت سے خالی ہے؛ یعنی زرّیں نے جس فارسی نسخے کو

---

[1] میں شیرانی مرحوم کے پوتے جناب مظہر محمود شیرانی کا بہ طورِ خاص ممنون ہوں کہ موصوف نے اِسے میرے لیے فراہم کیا اور یوں اصل مضمون سے میں استفادہ کر سکا۔

اپنا ماخذ بنایا تھا، اُس میں بھی یہ روایت موجود نہیں تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ میر امّن نے یہ روایت اپنے زمانے میں سُنی ہوگی۔ اِس امکان سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ سوال پھر بھی ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ روایت مشہور تھی، تو پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی دوسرا شخص کہیں بھی اِس کا ذکر نہیں کرتا۔ بہ ظاہر یہی خیال ہوتا ہے کہ اِس روایت کے مصنّف خود میر امّن ہیں اور بہ قولِ شیرانی صاحب "کوئی تعجّب نہیں اگر امیر خسرو کو اُس کا مصنّف بنا کر اور نظام الدین اولیاؒ سے تبریک دوا کر مرتّبِ قصّہ نے اِس کو مقبولِ عام بنانے کی غرض سے دروغِ مصلحت آمیز والا حیلہ تراشا ہو۔ نیم مذہبی قصّوں میں مصنّفین قاری و سامع کو ثوابِ دارین کی بشارت اکثر دیا کرتے ہیں۔"

بہ ہر حال، قطعیّت کے ساتھ تو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ روایت میر امّن کی تراشی ہوئی ہے، اِس کا کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں؛ یہ امکان البتّہ ہے کہ اُنھوں نے اِسے کسی سے سُنا ہو۔ اِسی طرح یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ اِس روایت کو خود اُنھوں نے بنایا ہو، اِس قصّے کو عظمت اور اُس کے نتیجے میں خاص وقعت اور شہرت دینے کے لیے۔ گل کرسٹ نے بھی اپنے پیش لفظ میں امیر خسرو والی روایت کا ذکر کیا ہے، مگر قرینہ قوی موجود ہے کہ اُس نے اِس سلسلے میں میر امّن کے نوشتے کو سامنے رکھا ہے۔ بہ ہر صورت، میر امّن کے اِس بیان کے سوا، اُن سے پہلے یا اُن کے زمانے میں اور کہیں اب تک یہ روایت دیکھنے میں نہیں آئی ہے اور اِسی سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ اُنھی کی بنائی ہوئی ہے[1]

---

[1] ڈاکٹر محیّنی شاہد نے مجھے بتایا کہ اُن کے لڑکپن تک حیدر آباد میں اِس روایت کو بہت سے لوگ مانتے تھے اور بیماروں کو یہ قصّہ سُنایا جاتا تھا۔ اُنھوں نے بتایا کہ وہ خود بھی ایسے ایک دو موقعوں پر موجود رہے ہیں۔ ڈاکٹر امیر عارفی (استادِ شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی) نے بھی، جو اصلاً حیدر آبادی ہیں، اِس روایت کی تائید کی اور یہ بتایا کہ ایک بار بیماری کے زمانے میں اُن کو بھی یہ سنائی گئی تھی۔ اِسے اُنھوں نے اپنے لڑکپن کے زمانے کی بات بتایا۔ اِن حضرات کے بہ قول اب یہ روایت ختم ہو چکی ہے۔ دہلی میں مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا جو اِس سلسلے میں کچھ بتا سکتا۔ غالباً یہاں یہ روایت حیدر آباد کی طرح کارفرما نہیں رہی۔

شیرانی صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون میں فارسی چہار درویش کے مطبوعہ نسخے کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اُس میں امیر خسرو والی روایت موجود ہے اور میر امّن نے اِس روایت کو اُسی نسخے سے اخذ کیا ہے: "میر احمد خلفِ شاہ محمّد نے اِس کی ترتیب دی ہے اور قاضی محمّد ابراہیم بن قاضی نور محمّد نے چھاپا..... اِس نسخے میں قصّے کی تالیف امیر خُسرو کے نام منسوب کی گئی ہے۔ میر امّن نے بھی اِس روایت کو قبول کیا ہے۔" لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں شیرانی صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ جس نسخے کا اُنھوں نے ذکر کیا ہے، وہ موخّر مطبوعہ نسخہ ہے۔ اُس کے مرتّب نے اپنے مقدمے میں اِس کی صراحت بھی کر دی ہے کہ کئی خطّی نسخوں "واز نسخۂ اُردو ترجمۂ میر امّن دہلوی نیز مقابلہ کردہ" یعنی یہ نسخہ میر امّن کی باغ و بہار کے بعد کا ہے، اِس لیے اِس میں جو امیر خسرو والی روایت ہے، وہ باغ و بہار سے تو نقل ہو سکتی ہے، ایسا نہیں ہو سکتا کہ میر امّن نے اِس روایت کو اُس فارسی مطبوعہ نسخے سے اخذ کیا ہو۔ عظیم الشّان صدّیقی صاحب نے 'ہماری زبان' (دہلی) کے شمارۂ ۲۲ اپریل ۱۹۶۴ء میں ایک مضمون کی صورت میں صورتِ حال کی وضاحت کر دی تھی۔ اُس فارسی نسخے کی پہلی اشاعت ۱۲۹۵ھ کی ہے۔ شیرانی صاحب نے غالباً اُس کا موخّر مطبوعہ نسخہ دیکھا، جس میں سے میر احمد کا دیباچہ نکال دیا گیا ہے اور یوں اُن کو غلط فہمی ہوئی۔ دہلی یونی ورسٹی لائبریری میں اِس کی پہلی اشاعت موجود ہے اور میں نے اُس سے استفادہ کیا ہے۔

خطّی نسخے:

باغ و بہار کا ایسا کوئی خطّی نسخہ میری نظر سے نہیں گزرا جو میر امّن کا لکھا ہوا ہو یا اُن کی نظر سے گزر چکا ہو۔ یہ کتاب فوراً ہی چھپنے چلی گئی تھی اور جلد ہی چھپ بھی گئی تھی، اِس لیے اِس میں ذرا بھی تعجب کی بات نہیں کہ بہت سی دوسری کتابوں کی طرح اِس کے خطّی نسخے نہیں ملتے۔ عہدِ مصنّف کے ایک دو نسخے ہوں گے تو ضرور، مثلاً ایک تو وہی ہوگا جسے انعام کے لیے کالج کونسل کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

بہ ہر صورت، اِس کتاب کے حسبِ ذیل خطّی نسخے اب تک میرے علم میں آئے ہیں۔
دتاسی کے پاس اِس کا ایک خطّی نسخہ تھا، جس کا علم ڈاکٹر ثریا حسین کے (مطبوعہ) تحقیقی مقالے کے ایک اندراج سے ہوتا ہے، اُنھوں نے لکھا ہے:

"مارسیلز کی میونسپل لائبریری میں بھی اُس کے کتب خانے کے پچاس قلمی نسخے موجود ہیں، جن کی فہرست میں نے اپنے مارسیلز کے دورانِ قیام جنوری ۱۹۶۰ء میں تیار کی تھی۔ . . . جن میں سے کچھ اہم قلمی نسخے مندرجۂ ذیل ہیں:

۱۔ باغ و بہار، مولفۂ میر امّن، اُردو قلمی نسخہ، ۱۲۱۷ھ میں بڑی تقطیع کے ۹۲ صفحوں میں لکھا گیا ہے" [گارسین دتاسی۔ اُردو خدمات، علمی کارنامے، ص ۵۶]۔

یہ ۱۲۱۷ھ کا نوشتہ نسخہ تو گویا کتاب کی نظرِ ثانی شدہ روایت کی تکمیل کے فوراً بعد کا ہوسکتا ہے۔ مقالہ نگار نے یہ صراحت نہیں کی کہ اِس کے آخر میں ترقیمہ ہے یا نہیں؛ مگر ۱۲۱۷ھ کا حوالہ یہ ظاہر بھی ظاہر کرتا ہے کہ آخر میں یا شروع میں کوئی عبارت یا صراحت ہے ضرور۔
ڈنکن فاربس نے بھی باغ و بہار کو مرتّب کیا تھا۔ اُس نے اپنے مرتّبہ نسخے [اشاعتِ اوّل، لندن، ۱۸۴۶ء] کے پیش لفظ میں دو خطّی نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ اُس نے اپنے اڈیشن کی ترتیب کے سلسلے میں لکھا ہے کہ میرا مرتّب کیا ہوا یہ متن باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل پر مبنی ہے، اور میں نے دو خطّی نسخوں سے بھی مدد لی ہے۔ جن میں سے ایک نسخہ وہ ہے جو گل کرسٹ کی ملکیت تھا۔ اُس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "IN ALL PROBABILITY" یہ میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہی نسخہ ہے جو اُنھوں نے گل کرسٹ کے سامنے بہ غرضِ منظوری پیش کیا (ہوگا)۔ دوسرا نسخہ مسٹر رومر کی ملکیت ہے، جو میر امّن کے شاگرد تھے[1]۔ اِس نسخے کا کچھ حصّہ مصنّف (یعنی میر امّن) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور کچھ حصّہ مصنّف کی نگرانی میں لکھا گیا ہے۔

---

[1] جان رومر، ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا۔ گنجِ خوبی کا جو مخطوطہ میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے کتاب خانے میں محفوظ ہے، اُسے میر امّن نے اپنے اِسی شاگرد جان رومر کے لیے اپنے قلم سے لکھا تھا۔ اُس نسخے کے آخر میں یہ صراحت موجود ہے۔

ایک قدیم خطّی نسخہ (ن) :

انڈیا آفس لندن کے کتاب خانے میں باغ و بہار کا ایک خطّی نسخہ محفوظ ہے اور اُس کا عکس میرے سامنے ہے۔ اِس نسخے کے آخر میں کوئی تَرقیمہ نہیں، شروع میں بھی ایسی کوئی تحریر نہیں جس سے اس کے متعلّق کچھ معلوم ہو سکے۔ خط پختہ نستعلیق ہے، لیکن لکھنے والے نے بعض مقامات پر ایسی غلطیاں کی ہیں جن سے اُس کا کم سواد ہونا بھی ظاہر ہوتا ہے۔ آخر میں بس "تمام شد" مرقوم ہے۔ صفحات پر نمبر شمار موجود نہیں، البتّہ ہر ورق کے آخری صفحے کے آخر میں ترک [یعنی اگلے صفحے سے شروع ہونے والی عبارت کا پہلا لفظ] موجود ہے۔ میرے شمار کے مطابق کُل صفحات ۱۹۷ ہیں اور مسطر ۱۳ سطری ہے۔ متن مکمّل ہے اور کہیں بھی کسی طرح کی خرابی کے آثار نظر نہیں آتے۔

فورٹ ولیم کالج کی چھپی ہوئی کتابوں میں، گل کرسٹ کے نظامِ املا کے مطابق، بہت سے الفاظ پر حرکات ضرور ملتی ہیں، مجہول اور لین آوازوں کے لیے علامتیں پابندی کے ساتھ استعمال کی جاتی تھیں اور علاماتِ قرائت کا التزام بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ اِس خطّی نسخے کا احوال یہ ہے کہ زبر زیر تو کم سے کم لفظوں پر نظر آتے ہیں اور یہی احوال علامات کا ہے۔ شروع کے صفحوں میں تو مجہول اور لین آوازوں کے لیے کچھ لفظوں پر وہی علامتیں ملتی ہیں جو فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں بہ طورِ عموم ملتی ہیں؛ لیکن اُن کا اوسط کم ہوتا گیا ہے اور رموزِ اوقاف کسی ایک جگہ بھی نظر نہیں آتے۔ مجہول اور لین آوازوں کے لیے کچھ لفظوں پر جو گل کرسٹ کی مقررکی ہوئی علامتیں ملتی ہیں، اُن سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ناقل کے سامنے کوئی ایسا نسخہ باغ و بہار کا تھا جس پر گل کرسٹ کے مقرّرہ نظام کے تحت علامتیں لگی ہوئی تھیں۔ چوں کہ ناقل [عام اُردو والوں کی طرح] اعراب و علامات و رموزِ اوقاف کے استعمال اور التزام کا خوگر نہیں تھا، اِس لیے وہ پوری طرح اُس نظامِ املا کی پابندی نہیں کر سکا، بس کہیں کہیں نقل مطابقِ اصل کے تحت علامتیں لگا گیا۔

یہ مخطوطہ کس نسخے کی نقل ہے، اِس سلسلے میں کچھ کہنا یوں زیادہ مشکل نظر آتا ہے کہ کئی

مقامات پر بعض اُلجھنوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اُن کو بیان کیا جائے گا؛ مگر خاص بات یہ ہے کہ ہندی مینول میں شامل باغ و بہار کے ۱۰۲ صفحات کے متن کا جب اِس خطّی نسخے کے متن سے مقابلہ کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ ہندی مینول کے صفحات کا متن بہ طورِ عموم اِس نسخے کے متن کے مطابق ہے۔ جہاں کہیں ایک آدھ لفظ کا اختلاف یا فرق ہے، تو اُس کا تعلق اکثر مقامات پر ناقل کی غلط نگاری سے ہے ـــــ میں محض بہ طورِ مثال ایسے بس دو چار مقامات کی نشان دہی کرتا ہوں جہاں ہندی مینول کا متن اشاعتِ اوّل (۱۸۰۴ء) کے متن سے مختلف ہے اور اِس خطّی نسخے کے متن سے مطابقت رکھتا ہے۔ ہندی مینول کے لیے م، خطّی نسخے کے لیے ن اور اشاعتِ اوّل (۱۸۰۴ء) کے لیے ک بہ طورِ مخفّفات استعمال کیے گئے ہیں۔

ک میں ص ۴ پر ایک شعر یوں ہے:

جس کا ثانی اور مقابل ہے نہ ہووے گا کبھو ایسے یکتا کو خدائی سب طرح شایان ہے

م میں یہ شعر اِس طرح ملتا ہے:

جس کا ثانی اور مقابل آج تک پیدا نہیں ایسے واحد کو خدائی سب طرح شایان ہے

ن میں بھی یہ شعر اِسی طرح ہے۔ اِسی سلسلے کے دوسرے شعر کا پہلا مصرع ک میں یوں ہے: "لیکن اِتنا جانتا ہوں خالق و رازق ہے وہ"۔ م میں یہ مصرع یوں ہے: "اِس زمانے میں بھی بعضے مرد ہیں جوہر شناس"۔ ن میں بھی یہ مصرع اِسی طرح ہے ـــــ اِسی صفحے پر نعتیہ اشعار میں پہلے شعر کا دوسرا مصرع ک میں اِس طرح ہے: "اِس لیے پرچھائیں اُس قد کی نہ تھی مشہور ہے"۔ م میں یہ اِس طرح ہے: "اِس لیے پرچھائیں اُس کی پاس سے نت دور ہے"۔ ن میں بھی یہ مصرع م کے مطابق ہے، ہاں اِس میں "اس کے پاس" ہے اور یہ محض کتابت کا فرق ہے، متن کا نہیں ـــــ ص ۵ کی ساتویں سطر میں ک میں ایک جملہ یوں ہے: "جو صاحب دانا اور ہندوستان کی زبان بولنے والے ہیں"۔ م میں اِسے یوں لکھا گیا تھا: "جو صاحب دانا اور زبان بولنے والے ہندوستان کے ہیں"۔ ن میں بھی یہ جملہ اِسی طرح ہے ـــــ ک میں ص ۵ ہی پر ایک عبارت یوں ہے: "نجیبوں کے

قدر دان جان گل کرسٹ صاحب نے کہ ہمیشہ اقبال اُن کا زیادہ رہے جب تلک گنگا جمنا بہے'
لطف سے فرمایا۔" ھم میں یہ عبارت اِس طرح ہے: "نجیبوں کے قدر دان، غریبوں کے
فیض رساں، عاجزوں کے ہاتھ پکڑنے والے، بیچاروں کی پرورش کرنے والے' دانا زمانے
کے۔ BYT سرکار سے دے کے آب و دانا ٭ ناداں کو بنایا جس نے دانا، یعنی
جان گل کرسٹ صاحب نے کہ ہمیشہ اقبال اُن کا .....۔" ـــــ ن میں بھی یہ عبارت
اِسی طرح، یعنی ھم کے مطابق ہے [یہاں زیادہ مثالوں کی یوں ضرورت نہیں کہ اِس کتاب
کے ضمیمۂ تشریحات میں ایسے جملہ اختلافاتِ متن کی نشان دہی کر دی گئی ہے، اُنھیں دیکھا
جاسکتا ہے، لیکن یہ ضرور عرض کروں کہ ایسے اختلافات اچھی خاصی تعداد میں ہیں]۔

ہندی مینول میں باغ و بہار کے صرف ۱۰۲ صفحے چھپے تھے، جو پہلے درویش کی سیر
کے اختتام سے ذرا پہلے تک کے متن پر مشتمل ہیں۔ بقیہ متن میں بھی ک اور ن میں اختلافات
ملتے ہیں۔ میں یہاں بھی صرف دو چار مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

ک میں ص ۱۰۶ پر ایک جملہ یوں ہے: "تب بیمار اور درد مند دیس دیس اور
ملک ملک کے، جو دور دور سے آتے ہیں، دروازے پر جمع ہوتے ہیں، اُن کی بڑی بھیڑ
ہوتی ہے" ـــــ ن میں یہ عبارت یوں ہے: "تب بیمار اور درد مند ہر ملک کے
جو جمع ہوتے ہیں اور دور دور سے آتے ہیں دروازے پر اکٹھے ہوتے ہیں بڑی بھیڑ لگتی
ہے" ـــــ ک میں ص ۱۲۲ پر چوتھی سطر میں ایک جملہ یوں ہے: "وہ وزیر زادی جس
نے اپنے تئیں سوداگر بچہ مشہور کیا تھا، اُسے دیکھ کر متعجّب ہوئی" ـــ ن میں یہ جملہ یوں
ہے: "یہ سوداگر بچہ جو فی الحقیقت وزیر زادی تھی اُسے دیکھ کر ....۔" ـــــ ک میں
ص ۱۵۷ پر ولایتِ سراندیپ کے ذکر میں یہ بھی ہے کہ "اُس شہر میں بڑا بت خانہ تھا"
ن میں یہاں "بت خانہ" کی جگہ "گرجا" ہے ـــــ ک میں اِسی صفحے کی آخری سطر میں
ایک جملہ ہے: "اُس حجّام نے سارا بدن میرا پونچھ پانچھ کر ....."۔ ن میں "حجّام" کی جگہ
"ڈاکٹر" ہے ـــــ ک میں ص ۱۶۸ پر اٹھارویں سطر میں ہے: "پنڈے ایک خلعت
بڑے بت کی سرکار سے دے کر"۔ ن میں "پنڈے" کی جگہ "پادری" ہے ـــــ ک میں

ص ۱۰۷ پر ہے: "میں ..... دہرے میں گیا"۔ ن میں "دہرے" کی جگہ "گرجے میں گیا" ہے ـــــ ک میں ص ۲۰۵ پر یہ ہے کہ شہزادی فرنگ نے "ایک جرّاح کو بلوایا"۔ ن میں "جرّاح" کی جگہ "ڈاکٹر" ہے ـــــ ک میں ص ۱۵۹ پر ایک جملہ یوں ہے: "طہارت کر، کونے میں چھپ کر نماز پڑھ لیتا"۔ ن میں یہ جملہ اِس طرح ہے: "بدن کو طہارت دے کر، کونے میں ......"۔

میرا خیال ہے کہ اثباتِ مدعا کے لیے یہ مثالیں کافی ہیں۔ اب تک جو مثالیں پیش کی گئی ہیں، اُن سے بہ ظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ن کا متن کسی ایسے نسخے پر مبنی ہے جو نظرِ ثانی سے پہلے کا نسخہ تھا اور یہ وہی نسخہ تھا [یا اُس نسخے کی نقل تھی] جس پر ہندی مینول کا متن مبنی تھا؛ لیکن بعض مقامات پر یہ عجیب بات سامنے آتی ہے کہ م اور ن کے متن میں اختلاف ہے اور ن کا متن ک کے مطابق ہے۔ مثلاً ص ۳۲ پر ایک جملہ یوں ہے: "میرا دل چاہتا نہیں کہ تمھیں اکیلا چھوڑ کر جاؤں"۔ ن میں بھی یہ جملہ اِسی طرح ہے، جب کہ م میں اِس کی صورت یہ ہے: "میرا جی تو چاہتا نہیں کہ ....." ـــــ ص ۴۹ پر ایک جملہ اِس طرح ہے: "سب کی سب متفکّر ہوئیں اور قدم پر گرنے لگیں"۔ ن میں بھی یہ جملہ اِسی طرح ہے، جب کہ م میں اِس کی صورت یہ ہے: "سب کی سب متفکّر ہوئیں اور تدبیر کرنے لگیں"۔ ـــــ ص ۵۷، سطر ۶: "اِسی خاطر سے، پیچ تاب کھا کر میں چپکی ہو رہی"۔ م میں یہ اِس طرح ہے: "اُس کی خاطر سے پیچ تاب کھا کر میں چپکی ہو رہی"۔ اور ن میں یوں ہے: "اِسی خاطر پیچ تاب کھا کر میں چپکی ہو رہی"۔ یہاں ن کا متن ک اور م دونوں سے مختلف ہے ـــــ ص ۵۶، س ۷: "کنول اور فانوسِ خیال"۔ م میں "کنول فانوسِ خیال" ہے، یعنی "اور" موجود نہیں، مگر ن میں "اور" موجود ہے، یعنی ن کا متن ک کے مطابق ہے اور م سے مختلف ہے۔

لیکن سب سے زیادہ اہم اختلاف یہ ہے کہ کتاب کے آخر میں جہاں عبارتِ خاتمہ ہے، جو ص ۲۴۹ پر تیرھویں سطر سے شروع ہوتی ہے اور جس میں میر امّن نے یہ لکھا ہے کہ اِس کتاب کا آغاز ۱۲۱۵ھ کے آخر سال میں ہوا اور اختتام ۱۲۱۷ھ کے آغاز میں ہوا؛ یہ پوری

عبارت لفظ بہ لفظ ن میں موجود ہے۔ اِس عبارت کے خاتمے پر میرامّن کا کہا ہوا جو قطعۂ تاریخ ہے، اُس میں پہلے شعر کا دوسرا مصرع ن میں بدلا ہوا ہے۔ مصرع یہ ہے: "تھے سنہ بارہ سو سترہ در شمار"۔ ن میں یہ مصرع یوں ہے: "تھے سن بارہ سو پندرہ در شمار"؛ مگر دوسرا شعر:

"کرو سیراب اس کی تم رات دن   کہ ہے نام و تاریخ "باغ و بہار""

ن میں بھی اِسی طرح ہے۔ یہ عجیب تر صورتِ حال ہے۔ اِن سب اختلافات کو دیکھ کر میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ن کے کاتب کے سامنے اِس کتاب کی دو روایتیں تھیں، ایک تو وہ جسے پہلی روایت کہنا چاہیے اور نسخۂ ام جس پر مبنی ہے اور دوسری وہ روایت جو نظرِ ثانی کے بعد مرتّب ہوئی تھی۔ ن کے کاتب نے بُنیادی طور پر تو پہلی روایت کو سامنے رکھا ہے اور بعض مقامات پر نظرِ ثانی شدہ روایت سے بھی کام لیا ہے اور عبارتِ خاتمہ کو نظرِ ثانی شدہ روایت سے نقل کیا، اِس استثنا کے ساتھ کہ پہلے شعر کے دوسرے مصرع کو پہلی روایت کے مطابق رہنے دیا۔ یہ ہے تو عجیب تر صورتِ حال، مگر ایسے ہی کسی قیاس سے اِس کی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ اِس کے سوا فی الوقت اور کوئی توجیہ میرے ذہن میں نہیں آتی۔ ایک امکان یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ن کے کاتب نے جس نسخے سے نقل تیار کی ہے، وہ اِسی طرح ہو۔

بہ ہر صورت، نسخۂ ن کی اہمیت مسلّم ہے۔ پہلی روایت پر میرامّن نے نظرِ ثانی کی تھی، اِس کا ثبوت تو ہندی مینول سے مل جاتا ہے؛ لیکن اُس میں بس ۱۰۲ صفحے ہیں۔ باقی حصّے پر کس طرح نظرِ ثانی کی گئی تھی، اُس کا گوشوارہ اِسی خطّی نسخے کی مدد سے تیار کیا جا سکتا ہے اور یہ بہت اہم بات ہے۔

اِس خطّی نسخے کی ایک اہمیّت اور بھی ہے کہ کئی مقامات پر متن کی تصحیح اِسی کی مدد سے کی جا سکتی ہے۔ اُن تصحیحات کے مکمل حوالے توضیحۂ تشریحات میں بہ ذیلِ اختلافِ نسخ لکھے گئے ہیں، یہاں محض بہ طورِ مثال ایک تصحیح کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ص ۱۸۹ پر تیسری سطر میں ایک جملہ ہے: "مدّت تئیں یہی میرا کام تھا"۔ ک میں یہ اِس طرح ہے: "مدتیں یہی میرا کام تھا" [ک ص ۱۸۹]۔ صاف ظاہر ہے کہ "مدتیں" غلطیِ طباعت ہے۔ ڈنکن فاربس کے مرتّب کیے ہوئے نسخے میں "مدّت تلک" ہے اور بہ ظاہر یہ "مدتیں" کی قیاسی تصحیح ہے۔

ن میں "مدّت تئیں"[1] ہے [ک میں "مدتیں" بہ ظاہر اِسی کی بگڑی ہوئی شکل ہے]۔ یہاں ن کے متن کا صحیح ہونا مسلّم ہے اور اُسی کو ترجیح دی گئی ہے ——— اِس نسخے کے لیے "ن" بہ طورِ علامت استعمال کیا گیا ہے۔

مطبوعہ نسخے :

باغ و بہار اِتنی بار چھپی ہے کہ اِس کی سب اشاعتوں کا گوشوارہ تیار کرنا مشکل ہے[2] [اور اِس کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں]۔ تدوین کے نقطۂ نظر سے اِس کے تین نسخے قابلِ ذکر ہیں۔ زمانی ترتیب کے مطابق سب سے پہلے ہندی مینول کا نام آتا ہے، جس میں اِس کے ۱۰۲ صفحے پہلی بار شامل کیے گئے تھے۔ دوسرا نسخہ وہ ہے جو مکمّل صورت میں پہلی بار ہندوستانی پریس کلکتے میں چھپا تھا اور تیسرا نسخہ وہ ہے جسے ڈنکن فاربس نے مرتّب کیا تھا۔ ضمنی طور پر اِس کا ایک موخّر نسخہ بھی قابلِ ذکر ہے، جسے مولوی عبدالحق صاحب نے مرتّب کیا تھا۔ باقی جس قدر نسخے اب تک چھپے ہیں، وہ پُرانی اشاعتیں ہوں، یا ہمارے زمانے کے اہلِ علم

---

[1] "مدّت تئیں" مدّت تک کے مفہوم میں مستعمل رہا ہے۔ صرف ایک مثال، خواجہ میر دردؔ کی ایک رباعی کا پہلا شعر ہے : مدّت تئیں باغ و بوستاں کو دیکھا ٭ یعنی کہ بہار اور خزاں کو دیکھا۔ یہ دیوانِ مطبوعہ میں موجود ہے۔

[2] دتاسی کے خطبات میں متعدد مقامات پر باغ و بہار سے متعلق معلومات محفوظ ہے اور جین صاحب کی کتاب اُردو کی نثری داستانیں میں اِس کے بعض نسخوں اور ترجموں سے متعلق بھی کچھ باتیں ملتی ہیں؛ تفصیل کے لیے اِن کو دیکھا جاسکتا ہے۔ دتاسی نے اِس کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا (دیکھیے ڈاکٹر ثرّیا حسین کی کتاب گارسین دتاسی۔ اُردو خدمات علمی کارنامے، ص ۱۴۳)۔ دتاسی کے پہلے خطبے سے معلوم ہوتا ہے کہ باغ و بہار کو اُس نے اپنے یہاں نصاب میں شامل کیا تھا [خطباتِ گارساں دتاسی، انجمن ترقّیِ اُردو اورنگ آباد، ص ۴۱] اُس نے اِسی خطبے میں اِس کتاب کے ارمنی ترجمے کا بھی ذکر کیا ہے (ص ۴۲)۔ دتاسی کے اِس مجموعۂ خطبات میں صفحات ۴۱، ۴۲، ۹۸، ۱۱۸، ۱۵۷، ۱۷۴، ۱۸۴، ۱۹۰، ۱۸۹، ۲۸۳، ۲۹۱، ۳۲۰، ۳۲۴، ۳۷۴، ۶۶۹ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر ثرّیا حسین کی محوّلۂ بالا کتاب میں ص ۲۷۹ پر باغ و بہار کے کئی اڈیشنوں کا حوالہ موجود ہے جو دتاسی کے ذاتی کتب خانے میں تھے۔ قومی زبان (کراچی) کے دو شماروں : جون ۱۹۶۳ء، جولائی ۱۹۶۳ء میں باغ و بہار کے دو منظوم نسخوں کا تعارف کرایا گیا ہے (وغیرہ)۔

نے اُنھیں مرتّب کیا ہو؛ یہ سب یا تو اشاعتِ اوّل [۱۸۰۴ء] کی نقل ہیں یا ڈنکن فاربس کے نسخے پر مبنی ہیں، اِس لیے تدوین کے لحاظ سے اِن کو یہ حیثیت حاصل نہیں کہ متن کی تصحیح میں اِن کو سامنے رکھا جائے۔

① ہندی مینول (م):

اِس سے پہلے گل کرسٹ کے ایک خط کا حوالہ آچکا ہے جو اُس نے کالج کونسل کو لکھا تھا اور جس کے ساتھ اُن کتابوں کی طباعت کے خرچ کا گوشوارہ بھی منسلک کر دیا تھا جو چھپ رہی تھیں یا چھپنے والی تھیں۔ اِس کے جواب میں کالج کونسل کے سکریٹری نے اُس کو مطلع کیا کہ "آئندہ اُس وقت تک نہ تو کوئی کتاب قبول کی جائے اور نہ کوئی رقم اِس مد میں صرف کی جائے جب تک مسوّدات کالج کونسل کے سامنے پیش نہ کر لیے جائیں۔" گل کرسٹ نے بجا طور پر اِس کے یہ معنی نکالے کہ کونسل کتابوں کی طباعت کے لیے رقم دینا نہیں چاہتی۔ غرض کہ سوال وجواب کے بعد "صاحبانِ کالج کونسل نے..... گل کرسٹ کے استدلال سے عاجز آکر لکھا کہ زیرِ طبع ہندوستانی کتابوں کی جو فہرست اُس نے اپنے خط مورّخہ ۱۲ر جنوری ۱۸۰۲ء کے ساتھ منسلک کی تھی، اور جن کی مزید طباعت کالج کونسل نے روک دی تھی، اُن کے مطبوعہ اجزا، نیز غیر مطبوعہ حصّوں کا انتخاب چھاپ کر ایک جلد بنا دی جائے اور یہ کتاب پانچ سو صفحات سے زیادہ نہ ہو اور دس ہزار سے زیادہ اُس پر لاگت نہ آئے" [گل کرسٹ اور اُس کا عہد، طبعِ دوم، ص ۱۲۸]۔

گل کرسٹ نے اپنے خط کے ساتھ جو نقشہ بھیجا تھا، اُسے عتیق صاحب نے اپنی محوّلۂ بالا کتاب میں نقل کر دیا ہے [ص ۱۲۳ - ۱۲۴]۔ اُس میں "چار درویش" کا نام بھی شامل ہے جس کے متعلّق یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ وہ ہرکارہ پریس میں چھپ رہی ہے اور اب تک اُس کے ۵۰ صفحے چھپ چکے ہیں۔ غرض کہ کالج کونسل کی تجویز کے مطابق مختلف کتابوں کے اجزا کو یک جا کر کے ہندی مینول کے نام سے ایک کتاب تیّار کر دی گئی۔ اُس میں باغ و بہار کے ۱۰۲ صفحے شامل ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۲ر جنوری کو جب گل کرسٹ نے پہلا خط لکھا تھا، اُس کے بعد طباعت جاری رہی تھی اور جس وقت ہندی مینول کو تیّار

کیا گیا، اُس وقت تک اِس کے ۱۰۲ صفحے ہرکارہ پریس میں چھپ چکے تھے۔

ہندی مینول کی نایابی کا احوال لکھا جا چکا ہے۔ میرے علم میں اب تک اِس کا صرف ایک نسخہ ہے جو لندن کے اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ ہندستان کے کسی کتاب خانے میں اب تک اِس کے وجود کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ میں نے کلکتے کی ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں اور نیشنل لائبریری میں خاص طور پر اِس کو تلاش کیا، لیکن وہاں بھی اِس کا سُراغ نہیں ملا۔ جناب محمد قاسم دہلوی نے لندن سے اِس کے اوّل و آخر کے دو دو صفحات کا اور باغ و بہار کے ۱۰۲ صفحوں کا عکس بھیجا ہے؛ اِس کتاب کے یہی اجزا میرے سامنے ہیں۔ [ضرورت اِس کی ہے کہ اِس انتخابی مجموعے کے مالہ و ماعلیہ کا کوئی اچھا کام کرنے والا مطالعہ کرے، اِس سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں]۔

ہندی مینول کے سلسلے میں ایک عجیب اتّفاق رونما ہوا جس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ مجھے ایک زمانے سے اِس کی تلاش تھی۔ ۱۹۶۳ یا ۱۹۶۴ء میں ایک بار ڈاکٹر مختار الدین آرزو سے باغ و بہار کی تدوینِ نو کا ذکر آیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اُن کے پاس ایک قدیم نسخہ ٹائپ میں چھپا ہوا ہے، جو ہے تو باغ و بہار کا حصّہ، لیکن اُس کا سرورق اور آخر کے صفحات موجود نہیں، اِس لیے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کب کا چھپا ہوا ہے۔ اُنھوں نے ازراہِ لطفِ خاص وہ نسخہ مجھے دے دیا۔ میں نے اِسے دیکھا، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کون سی اشاعت ہے۔ شروع کا صفحہ، جس پر بسم اللہ مرقوم ہے، موجود، لیکن آخر سے ناقص۔ آخری مطبوعہ صفحے پر صفحہ نمبر ۱۰۲ موجود ہے، لیکن کسی شخص نے آٹھ صفحے اپنے قلم سے لکھ کر، پہلے درویش کی سیر کو مکمّل کر دیا ہے۔ میں نے اُسے رکھ لیا اور پھر بھول گیا۔ اب جو لندن سے ہندی مینول میں شامل چار درویش کے ۱۰۲ صفحوں کا عکس آیا، تو اچانک مجھے وہ نسخہ یاد آیا؛ اُسے نکال کر دیکھا؛ مقابلہ جو کرتا ہوں تو معلوم ہوا کہ یہ تو ہندی مینول کا حصّہ ہے، کسی شخص نے اصل کتاب سے اِن اوراق کو الگ کر لیا تھا۔ اور پھر کسی شخص نے یہ دیکھ کر کہ پہلے درویش کی سیر ناتمام ہے، اپنے قلم سے اُسے مکمّل کر دیا

اور جلد بندھوالی۔ کیا عرض کروں کس قدر مسرّت ہوئی !! اب ہندی مینول میں شامل اجزاے باغ و بہار کے دو نسخے میرے سامنے ہیں ؛ ایک اصل نسخہ، یعنی ہندی مینول میں شامل اوراق کا مجموعہ [عطیۂ ڈاکٹر آرزو] اور ایک اُس کا عکس [لندن سے قاسم دلوی صاحب کا بھیجا ہوا] - اِس مجموعے کو بڑی اہمیت اور بُنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اِس میں شامل کتابوں کے اوراق، اُن سب کتابوں کی پہلی روایت کے امین ہیں۔ جب بھی اُن میں سے کسی کتاب کو مرتّب کیا جائے گا، اِس مجموعے میں شامل اُس کتاب کے اجزا کو لازماً سامنے رکھنا ہوگا۔ اِس کے بغیر تدوین کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ باغ و بہار کے جو ۱۰۲ صفحے اِس میں شامل ہیں، اِن کی حیثیت بھی پہلی روایت کی ہے۔ اِن اوراق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب پہلی بار میرامّن نے اِس کتاب کو لکھا ہے، تو کس طرح لکھا تھا۔ اِس کی بھی تصدیق اِس مجموعے سے ہوتی ہے کہ میرامّن نے پہلی روایت پر نظرِ ثانی کی تھی اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نظرِ ثانی کس طرح کی گئی تھی۔ اِس نسخے میں شامل متن کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اِس کی مدد سے طبعِ اوّل کی بعض ایسی اغلاطِ طباعت کو دور کیا جاسکتا ہے، جن کی درستی ویسے، شاید مشکل تر ہوتی۔ ضمیمۂ تشریحات میں ایسے کئی حوالے آپ کو ملیں گے، میں یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ ہمارے نسخے میں ص ۵۲ پر ایک جملہ ہے : "جب سہی سانجھ ہوتی، چپکے ہی وہ خواجہ سرا اُس جوان کو ... لے آتا۔" طبعِ اوّل میں "سہی سانجھ" کی جگہ "سی سانجھ" ہے ("جب سی سانجھ ہوتی")۔ ظاہر ہے کہ یہ طباعت کی غلطی ہے۔ [غلط نامے میں یہ موجود نہیں]۔ ڈنکن فاربس کے نسخے میں یہاں صرف "سانجھ" ہے ["جب سانجھ ہوتی"]۔ "سی سانجھ" کو اُس نے بے معنی سمجھ کر، صرف "سانجھ" لکھا۔ ہندی مینول میں یہاں "سہی سانجھ" ہے [ن میں بھی یہی ہے] اور یہی صورت صحیح ہے [اِس لفظ کی تشریح سے متعلق دیکھیے ص ۲۹۹ پر حاشیہ نمبر ۱]۔

اِس مجموعے میں باغ و بہار کے ۱۰۲ صفحے شامل ہیں۔ چھپائی نستعلیق ٹائپ کی ہے۔ مسطر ۱۳ سطری ہے اور گل کرسٹ کے نظامِ املا کی اِن میں بڑی حد تک پابندی کی گئی ہے، یعنی علامات و رموز و اعراب کا اہتمام بھی ملحوظ رکھا گیا ہے، لیکن ۱۸۰۴ء کے مطبوعہ نسخے

سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اِس موخّر نسخے میں یہ اہتمام بڑے پیمانے پر کیا گیا ہے اور اِس کو التزام کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ پہلے درویش کی سیر مکمّل نہیں آسکی ہے۔ ہمارے مرتّبہ نسخے کے مطابق ص ۶۳ پر ساتویں سطر میں "چُپ رہی۔ فقیر تو" پر ص ۱۰۲ کی آخری سطر ختم ہو جاتی ہے۔ پہلے صفحے کا آغاز "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے ہوتا ہے اور کتاب شروع ہو جاتی ہے۔ میر امّن کی عرضی اِس میں شامل نہیں۔ صفحات نمبر پہلے صفحے سے ڈالے گئے ہیں۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ جو کتاب جہاں تک چھپ چکی تھی، وہ سب صفحات لے کر اِس مجموعے میں شامل کر لیے گئے اور ہر کتاب کے صفحات کے نمبر شمار الگ سے ڈالے گئے ہیں۔ جب وہ حصّہ ختم ہو گیا ہے اور کسی نئی کتاب کے اجزا شروع ہوئے ہیں، تو پھر ایک، دو سے نمبر شمار شروع کیے گئے ہیں۔ اِس مجموعے کے پہلے سرورق کا [جو اُردو رسمِ خط میں ہے] اور آخری ورق کا [جو رومن میں ہے] عکس اِس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اُن سے اِس میں شامل کتابوں کی تفصیل معلوم کی جا سکتی ہے۔ سالِ طبع ۱۸۰۲ء درج ہے۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ بعض عنوانات رومن اور ناگری رسمِ خط میں ملتے ہیں مثلاً دوسرے صفحے پر اشعارِ حمد سے پہلے GHUZUL لکھا ہوا ہے۔ ص ۳ پر اشعار سے پہلے UBYAT ہے۔ ص ۱۵ پر ایک شعر سے پہلے फर्द لکھا ہوا ہے اور ص ۲۵ پر، جہاں سے پہلے درویش کی سیر کا قصہ شروع ہوتا ہے، وہاں सैर पहिले दरवेश की مرقوم ہے۔ دو سطروں کے بعد اشعار سے پہلے अबीआत لکھا ہوا ہے اور ص ۹۰ پر شعر سے پہلے फर्द ہے۔ اِس کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آسکی اور ضرورت بھی۔ خطّی نسخے (ن) میں ہندی یا رومن رسمِ خط کہیں بھی نہیں ملتا۔ اِس سے یہ اندازہ کرنا شاید غلط نہ ہو کہ اصل مسوّدے میں یہ کچھ نہیں تھا، پریس میں کسی وجہ سے رومن اور ناگری رسمِ خط میں بعض سرخیوں کو ٹائپ کیا گیا۔ ۱۸۰۴ء والی اشاعت میں بھی رومن یا ناگری رسمِ خط میں کہیں کچھ نہیں ملتا۔ [چوں کہ میں ہندی مینوئل کا مکمّل عکس حاصل نہیں کر سکا، اِس لیے میں نے اپنے استفادے کو اُس میں شامل باغ و بہار کے ۱۰۲ صفحات تک محدود رکھا ہے]

—— اِس نسخے کے لیے (م) بطورِ علامت مقرّر کیا گیا ہے۔

۲ (الف) اشاعتِ اوّل (ک)

زمانی ترتیب کے لحاظ سے دوسری [اور مکمّل اشاعت کے لحاظ سے پہلی] مطبوعہ روایت وہ ہے جو کلکتے سے ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اِس نسخے کے سرورق پر سالِ طبع اور پریس کے متعلق یہ مرقوم ہے: "ہندوستانی چھاپاخانہ سنہ ۱۸۰۳عیسوی مُطابق سنہ ۱۲۱۸ ہجری کے" [اِس صفحے کا عکس اِس کتاب میں آغازِ متن سے پہلے شامل کردیا گیا ہے]۔ اِس اشاعت کے آخری صفحے پر [جو مکمّل رومن رسمِ خط میں ہے] سالِ طبع ۱۸۰۴ء لکھا ہوا ہے اور پریس کا نام "ہندوستانی پریس"۔ [اِس صفحے کا عکس اِس کتاب کے آخر میں شامل ہے]۔ سالِ طبع کا یہ اختلاف کوئی نئی چیز نہیں، متعدد کتابوں میں اِس کی مثال ملتی ہے کہ سرورق پر ایک سالِ طبع ہے اور آخری صفحے پر [یا عبارتِ خاتمۃُ الطّبع میں] دوسرا۔ مثلاً فسانۂ عجائب کے بعض نسخوں کا یہی احوال ہے [باغ و بہار مرتبۂ فاربس (اشاعتِ اوّل) میں بھی ایسا ہی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اِس نسخے کے تعارف میں نشان دہی کی گئی ہے]۔ اِس سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ سرورق پر عموماً وہ سنہ درج ہوتا ہے جب کتاب چھپنے کے لیے پریس جاتی ہے اور چھپائی شروع ہوتی ہے۔ جب کتاب کی چھپائی مکمّل ہوتی ہے اور سنہ بدل چکا ہوتا ہے تو اُس صورت میں آخری صفحے پر وہی نیا سنہ لکھا جاتا ہے۔ [یہ واضح کردیا جائے کہ یہ کُلّیہ نہیں]۔ اِس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ باغ و بہار ۱۸۰۳ء میں کسی وقت چھپنا شروع ہوئی تھی اور ۱۸۰۴ء میں اُس کی طباعت مکمّل ہوئی۔ اِس اعتبار سے یہ کہنا چاہیے کہ یہ کتاب ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی۔

اِس اشاعت کے نسخے صحیح معنی میں کم یاب ہیں۔ اِس وقت تک اِس کے تین۳ نسخے میرے علم میں آسکے ہیں: (۱) مخزونۂ کتاب خانۂ انجمن ترقّیِ اُردو، دہلی۔ (۲) مخزونۂ کتاب خانۂ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔ (۳) مخزونۂ کتاب خانۂ انڈیا آفس، لندن۔ میں نے اوّل الذّکر نسخے سے استفادہ کیا ہے۔ یہ نسخہ مکمّل ہے۔ اصل کتاب ص ۲۵۰ پر ختم ہوجاتی ہے۔ ص ۲۵۱ پر "فہرست باغ و بہار کی" ہے۔ اِسی صفحے پر بارھویں سطر میں

"غلط نامہ" لکھا ہوا ہے۔ تیرھویں سطر میں "غلط" اور "صحیح" کے عنوانات ہیں۔ چودھویں سطر سے غلط نامہ شروع ہو جاتا ہے جو ص ۲٦۹ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ ایک کالمی ہے۔ آخر میں دُو ورق اور ہیں، جن کا ایک صفحہ سادہ ہے اور تین صفحات کے اندراجات انگریزی زبان اور رومن رسمِ خط میں ہیں۔ آخری صفحہ "آخری سرورق" ہے۔ اُس سے پہلے کے صفحے پر انتساب کی عبارت ہے اور اُس سے پہلے صفحے پر پیش لفظ ہے۔ [اِن تینوں صفحوں کا عکس اِس کتاب کے آخر میں شامل کر لیا گیا ہے] ۔ کتاب نستعلیق ٹائپ میں چھپی ہے، مسطر اٹھارہ سطری ہے۔

طویل غلط نامے کے باوجود طباعت کی کچھ غلطیاں باقی رہ گئی ہیں۔ حواشی میں اِن کی نشان دہی کی گئی ہے، یہاں محض بہ طورِ مثال چند اغلاط کی نشان دہی کی جاتی ہے [جو ک کے متن میں موجود ہیں، لیکن غلط نامے میں موجود نہیں]۔ "حویلی کو گھیر لیا دروانے پر نرسیگا بجایا" [ک ص ۲۳۱] ۔ صحیح لفظ "نرسنگا" ہے [جو ف اور ن میں ہے] ۔ "جتنے باشندے اِس شہر کے ہیں میرا دشمن ہوئے" [ک ص ۲۳۱ — ہمارے مرتبہ نسخے میں بھی یہ دونوں جملے ص ۲۳۱ پر ہیں] ۔ واضح طور پر "میرا" غلطیِ طباعت ہے، "میرے" ہونا چاہیے [جو ن میں ہے۔ ف میں بھی یہاں "میرا" ہے، اور یہ نقلِ محض کا نتیجہ ہے] ۔ " اور اُس کی قیمت کا روپے دھر دیتا ہے" [ک ص ۱۸٦۔ ہمارے نسخے میں بھی یہی صفحہ ہے] ۔ "کا" واضح طور پر غلطیِ طباعت ہے، "کے" ہونا چاہیے جس طرح ف میں ہے۔ [ن میں یہاں "قیمت کا روپیہ" ہے، مگر وہ اختلافِ نسخ کے ذیل میں آتا ہے] ۔ "پنڈا ایک خلعت بڑے بُت کی سرکار سے دے کر اُسے رخصت کرتے ہیں" [ک ص ۱٦۸۔ ہمارے نسخے میں بھی یہی صفحہ ہے] ۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں "پنڈا" طباعت کی غلطی ہے، "پنڈے" کا محل ہے [ف میں "پنڈے" ہے] ۔ ہمارے نسخے میں ص ۱۷۰ پر ایک جملہ ہے : "وِے سُن کر اُس پیر زال کے روبہ رو گئے"۔ ک میں "پیر ذال" [مع ذالِ منقوطہ] ہے [ص ۱۷۰] ۔ ظاہر ہے کہ یہ کرشمۂ طباعت ہے۔ ف میں "پیر زال" ہے، یہی صحیح ہے اور اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ک میں ص ۱۷۷ پر "شاہِ راہ" ہے، ف میں "شاہ راہ" ہے اور

یہی صحیح ہے۔ ک میں ہ کے نیچے زیر، طباعت کی غلطی ہے۔

(ب) اشاعتِ اوّل کا سرورق:

مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے مرتبہ نسخۂ باغ و بہار کے مقدمے میں لکھا ہے:

" فارسی اور نوطرزِ مرصّع کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ باغ و بہار فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں، بلکہ اِس کا ماخذ نوطرزِ مرصّع ہے۔ تعجب اِس بات کا ہے کہ میرامّن نے فارسی کتاب اور اُس کے ترجمے کا تو ذکر کیا۔ مگر نوطرزِ مرصّع کا ذکر صاف اُڑا گئے"۔ (ص۱۲)

میری معلومات کی حد تک سب سے پہلے شیرانی صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون [مشمولۂ کاروان] میں اِس کی تردید کی تھی:

"....لیکن حقیقت میں میرامّن پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ یہ ایک اتّفاق ہے کہ میر نے اپنے دیباچے میں نوطرزِ مرصّع کا بہ حیثیتِ ماخذ کوئی ذکر نہیں کیا، مگر اپنی تالیف کے سرورق پر صاف الفاظ میں اِس کا اظہار کیا ہے، چناں چہ عبارتِ سرورق ملاحظہ ہو"۔

اِس کے بعد انھوں نے سرورق کی عبارت کا یہ حصّہ نقل کیا ہے: " باغ و بہار تالیف کیا ہوا میرامّن دلّی والے کا۔ ماخذ اس کا نوطرزِ مرصّع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے فارسی قصّۂ چہار درویش سے"۔ [اِس سرورق کا عکس اِس کتاب میں متن سے پہلے شامل کر لیا گیا ہے۔ اِس میں مکمّل عبارت دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں ترتیب بھی بدلی ہوئی ہے۔ نیز اِس میں "کہ" موجود نہیں اور "چہار درویش" کے بجائے "چار درویش" ہے] ۔ شیرانی صاحب نے مزید لکھا ہے کہ گل کرسٹ نے بھی اپنے پیش لفظ میں یہی وضاحت کی ہے۔ اِس کے بعد لکھا ہے: "یہ بیانات میرامّن کو ہر قسم کے الزام سے بری کر دیتے ہیں"۔

یہ صحیح ہے کہ اشاعتِ اوّل کے سرورق پر منقولہ عبارت موجود ہے، لیکن ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ میرامّن کی لکھی ہوئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات کہ کیا سرورق میرامّن کا تیار کیا ہوا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی چھپی ہوئی کئی کتابوں کے

سرورق عموماً اِسی انداز کے ملتے ہیں [مثلاً عتیق صاحب نے اپنی محوّلۂ بالا کتاب میں اخلاقِ ہندی طبعِ اوّل کے سرورق کا عکس چھاپا ہے، اُس میں اوپر کی دو سطریں اِس سرورق کی دو سطروں سے خاصی ملتی جلتی ہیں]۔ اگر یہ سرورق میرامّن کا بنایا ہوا ہے، تو پھر متن میں انھوں نے ایسی عبارت کیوں لکھی جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ کتاب فارسی قصّۂ چہار درویش کا بہ راہِ راست ترجمہ ہے! اِس سلسلے میں کوئی قطعی بات میں نہیں کہہ سکتا، لیکن ذہن میں سوالیہ نشان ضرور پیدا ہوتا ہے۔

(ج) پیش لفظ:

اِس کتاب کے آخر میں ["آخری سرورق" اور انتساب کے صفحے سے پہلے] انگریزی میں ایک عبارت ہے، جس کا عنوان ہے: "PREFACE"۔ کُل اُنیس ۱۹ سطریں ہیں۔ نہ تو شروع میں کسی کا نام ہے اور نہ آخر میں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ پیش لفظ گل کرسٹ کا لکھا ہوا ہے۔ ڈنکن فاربس نے اپنے مرتّبہ نسخۂ باغ و بہار کے پیش لفظ میں اِس کی پوری عبارت نقل کر دی ہے۔ اُس نے اِس کے لیے APPRENTLY BY DR. GILCHRIST لکھا ہے۔ یعنی یقین کے ساتھ وہ یہ نہیں کہتا کہ یہ پیش لفظ گل کرسٹ کا لکھا ہوا ہے۔ "بہ ظاہر گل کرسٹ کا ہے" یہ اُس کی رائے ہے اور تقاضاے احتیاط یہ ہے کہ یہی کہا جائے۔

میرا یہ خیال تھا (اور ہے) کہ یہ پیش لفظ ناتمام ہے۔ اِس خیال کی وجہ یہ تھی کہ آخر میں نام تو ہونا چاہیے تھا (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے)۔ یہ بھی خیال تھا کہ عبارت اچانک ختم ہو جاتی ہے اور بہ ظاہر ناتمامی کا احساس ہوتا ہے۔ اِس کتاب کی طبعِ اوّل کے جو تین نسخے میرے علم میں ہیں [جن کا ذکر آ چکا ہے] اُن تینوں نسخوں میں بس یہی ایک صفحہ ہے۔ انڈیا آفس (لندن) کے صفحات کا عکس مالک رام صاحب نے منگا کر دیا اور علی گڑھ کے نسخے کو میری درخواست پر ایم۔ حبیب خاں صاحب نے وہاں جا کر دیکھا؛ معلوم ہوا کہ دونوں نسخوں میں وہی ایک صفحہ ہے۔ نسخۂ انجمن ترقیِ اُردو میرے سامنے ہے،

اُس کا بھی یہی احوال ہے۔ ڈنکن فاربس نے اپنے مرتّبہ نسخے کے مقدمے میں اِس پیش لفظ کی عبارت نقل کر دی ہے، اُس نے بھی بس اِتنی ہی عبارت لکھی ہے۔

اِس چھان بین کے بعد یہ تو اندازہ ہو گیا کہ پیش لفظ کی اِتنی ہی عبارت شاملِ کتاب ہوئی تھی۔ اِس کا امکان بہ ہر حال ہے کہ عبارت اِس سے زیادہ لکھی گئی ہو اور شاملِ کتاب کسی وجہ سے نہ ہو سکی ہو، یا یہ کہ شیرازہ بندی میں ایک حصّہ شامل نہیں ہو پایا۔ [یہ محض گمان اور صرف خیال ہے؛ لیکن میں اِسے حقیقت سے قطعی طور پر عاری نہیں سمجھتا]۔ موجودہ صورت میں یہی مان لیا جاتا ہے کہ پیش لفظ کی بس اِتنی ہی عبارت شاملِ کتاب ہوئی ہے۔ اِس صفحے کا عکس اِس کتاب کے آخر میں شامل کر لیا گیا ہے۔

(ن) اعراب، علامات، رُموزِ اوقاف:

اِس نسخے میں الفاظ پر اعراب اور علامات، نیز عبارت میں رُموزِ اوقاف کا خاص اہتمام ملتا ہے۔ اُن کی ضروری تفصیل سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ گِل کرسٹ نے جب کتابیں مرتّب کرانے اور چھاپنے کا منصوبہ بنایا تھا، تو پہلے یہ بُنیادی کام کیا تھا کہ ایک مکمّل نظامِ املا[1] مرتّب کر لیا تھا۔ اُسے اُردو رسمِ خط اور غیر ملکی طلبہ، دونوں کی مشکلوں کا

---

[1] گِل کرسٹ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اُردو میں اُس نے سب سے پہلے املا پر ایک مستقل رسالہ لکھا تھا۔ وہ رسالہ تو اب تک نہیں مل سکا ہے، لیکن اُس کا خلاصہ موجود ہے۔ یہ تلخیص میرے علم کے مطابق میر شیر علی افسوس کی کتاب باغِ اُردو (ترجمۂ گلستانِ سعدی) کے شروع میں چھپی تھی، جو مع سرورق سات صفحوں پر مشتمل ہے۔ سرورق کے علاوہ صفحات کا مسطر تیرہ[13] سطری ہے اور ایک سطر میں (کم و بیش کی نسبت کے ساتھ) ۱۲ لفظ آئے ہیں۔ اکبر علی خاں صاحب نے مطّلع کیا کہ حفیظ الدّین کی کتاب خرد افروز میں بھی یہ تلخیص شامل ہے اور حفیظ الدّین نے اِس سے متعلق ایک مختصر سی عبارت بھی لکھی ہے۔ اُنھوں نے اُس عبارت کی نقل بھی بھیجی ہے۔ باغِ اُردو (طبعِ اوّل ۱۸۰۲ء) کے متعلق صفحات کا عکس بھی اُنھی کی معرفت دست یاب ہوا ہے۔ اِس سے پہلے باغِ اُردو کی ایک موخّر اشاعت کے صفحات کا عکس میرے پاس تھا جسے ازراہِ لطف ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے فراہم کیا تھا، مگر اُس نسخے کا سرورق موجود نہیں، یوں سالِ اشاعت اور پریس کا علم نہیں ہو سکا تھا، اب جو مقابلہ کیا تو طبعِ اوّل اور اِس موخّر اشاعت
←

خوب علم تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اُردو میں حروفِ علّت کی آوازیں نئے طالب علموں کے لیے بہت پریشان کُن ثابت ہوں گی اگر اُن کے تعیّن کی کوئی صُورت نہ ہو۔ اُسے اچھّی طرح علم تھا کہ اُردو کی تحریروں میں آخرِ لفظ میں واقع یاے معروف و مجہول کے امتیاز کو مُطلقاً ملحوظ نہیں رکھا جاتا اور یہی احوال ہاے ملفوظ و ہاے مخلوط کی شکل صورت کا ہے۔ عبارت میں نہ پیراگراف ہوتے ہیں نہ رُموزِ اوقاف۔ طالبِ علم کے لیے یہ معلوم کرنے کی کوئی صُورت

← کے سرورق کی عبارت میں بھی فرق ہے۔ میں نے اُسی زمانے میں "گل کرسٹ کا نظامِ املا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، اب از سرِ نو اُس کو لکھنے کا ارادہ ہے۔ طبعِ اوّل کے سرورق پر جو عبارت ہے، اُس کا ضروری حصّہ یہ ہے: "....جو رسالہ مسٹر جان گل کرست صاحب دام اقبالہ نے واسطے رسمِ خط اعراب کے بنایا ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے اور جو کوئی کلّیہ اُس کو دریافت کیا چاہے، سُو اُس رسالے میں دیکھ لے۔"

ابھی یہ لکھا جا چکا ہے کہ گل کرسٹ کے رسالۂ املا کی تلخیص حفیظ الدّین کی کتاب خرد افروز میں بھی شامل ہے۔ حفیظ الدّین نے اِس تلخیص کے سلسلے میں لکھا ہے:

"مخفی نہ رہے کہ ہندی کی جتنی کتابیں خواہ نظم خواہ نثر، نستعلیق یا نسخ خط میں چھاپا ہوئیں، سب جناب جان گل کرسٹ صاحب کے رسمِ خط کے موافق ہیں، اس لیے کہ لوگوں کو عبارت پڑھنے میں آسانی ہو۔ کیوں کہ جو کتاب کہ اِس رسمِ خط کے موافق نہیں، اُس کے پڑھنے میں، اور تو کیا، اہلِ ہند کہ جن کی یہ زبان ہے، وہ بھی اٹکتے ہیں، علی الخصوص یاے معروف و مجہول میں، کیوں کہ جب تک لفظ کے معنی اور مرجع ضمیروں کا بہ خوبی دریافت نہ کیا جائے اور صورتِ تحریر ایک ہی ہو، تو البتّہ اُس کے پڑھنے میں غلطی ہوگی۔ اور وے لوگ کہ جنھوں نے یے قاعدے نہ دیکھے اور مطلق اِس رسمِ خط سے آشنا نہیں، اگرچہ چھاپے کی کتابیں دیکھتے دیکھتے مہارت ہو جاتی ہے اور اجمالاً اِس قاعدے سے واقف ہو جاتے ہیں، لیکن ابتداً تو نہایت بھٹکتے ہیں بلکہ جابجا اٹکتے ہیں۔ مثل مشہور، محنت برباد گنہ لازم۔ پس اِن کے حق میں یے قاعدے بے فائدہ ہیں، بلکہ وہی نقص جیسا کا تیسا باقی رہا۔ اِس لیے بہ نظرِ فائدۂ عام اُس رسالے کا خلاصہ، جو جان گلکرسٹ صاحب نے رسمِ خط کے لیے ایجاد کیا ہے، اِس کتاب کے ساتھ چھپوایا، تاکہ جو اِس خلاصے کو دیکھے، بہ خوبی کتابوں کے پڑھنے پر قادر ہو اور بے کھٹکے، آنکھ موندے اپنی منزلِ مقصود کو پہنچے۔" [اصل کتاب (خرد افروز، طبعِ اوّل) میری نظر سے نہیں گزری۔ اکبر علی خاں صاحب نے یہ عبارت اِس صراحت کے ساتھ بھیجی ہے کہ یہ طبعِ اوّل کی نقل ہے، اُسی کے مطابق اِسے درج کیا گیا ہے]۔

نہیں کہ لفظ کے آخر میں جو واو آیا ہے، وہ معروف ہے، مجہول ہے یا معدولہ ہے (وغیرہ)۔
اُس نے اِن سب اُمور کو پیشِ نظر رکھ کر ایک جامع نظامِ املا مرتب کیا تھا، پھر اُس سے بھی بڑا یہ کام کیا تھا کہ نہایت سختی کے ساتھ اور بہت التزام کے ساتھ مطبوعات میں اُس کی پابندی کرائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ گل کرسٹ کی چھپی ہوئی [نستعلیق ٹائپ] کی کتابوں میں ایک ہی نظامِ املا سامنے آتا ہے اور اُس کی پابندی کا اہتمام اور التزام نظر آتا ہے۔ باغ و بہار کی اِس اشاعت میں بھی یہ اہتمام اور التزام پوری طرح سامنے آتا ہے۔
گل کرسٹ نے ی کو چار قسموں میں بانٹا تھا: معروف، مجہول، لین، مشموم۔ قاعدہ یہ بنایا تھا کہ جب ی لفظ کے آخر میں آئے گی اور معروف ہوگی، تو اُسے متعارف صورت (ی) میں لکھا جائے گا۔ اِس ی کا نام اُس نے "یاے دامنی" رکھا تھا۔ یہ صراحت کردی تھی کہ اِس کے نیچے نقطے نہیں ہوں گے۔ جیسے: دی، کی۔
جب مجہول ہوگی، تو اُسے [خواہ وہ لفظ کا جُز ہو، جیسے دے، یا الحاقی ہو جیسے: مبتلاے غم] تو اُسے متعارف صورت میں دراز لکھا جائے گا، مثلاً: دے، کے، سے۔ نقطے اِس کے نیچے بھی نہیں ہوں گے ——— آخرِ لفظ میں آنے والی یاے ماقبل مفتوح کو کشتی دار لکھا جائے گا، جیسے: ہی، می۔ نقطے یہاں بھی نہیں ہوں گے۔
وہ ی جو درمیانِ لفظ ہوتی ہے اور اُس کی آواز حرفِ ماقبل کی آواز میں شامل ہو کر نکلتی ہے، اُس کا نام اُس نے "یاے مشموم" رکھا تھا [جسے ہم آسانی کی خاطر "یاے مخلوط" بھی کہہ سکتے ہیں]۔ اِس ی کی پہچان یہ بنائی تھی کہ اِس کے نقطے نیچے اوپر رکھے جائیں گے، جیسے: کیا، پیار۔
لفظ کے بیچ میں جو ی آتی ہے، اُس کا نام اُس نے "یاے شوشہ دار" رکھا تھا۔ معروف و مجہول کا امتیاز اِس طرح متعین کیا تھا کہ یاے مجہول کے اوپر ایک چھوٹا سا دائرہ بنایا جائے گا، جیسے: کھیل، دیر، میں، جیل۔ حرفِ ماقبل حرکت سے خالی رہے گا۔ اِس علامت کا نام اُس نے "جزمِ مدوّرہ" رکھا تھا۔ اگر معروف ہوگی، تو خالی رہے گی، اُس پر کوئی علامت نہیں ہوگی، حرفِ ماقبل یہاں بھی حرکت سے خالی رہے گا، جیسے: کیل،

بِچیل، پِچیر، فیل۔

اگر اِس "یاے شوشہ دار" سے پہلے والے حرف پر زبر ہے، تو اُس صورت میں اِس پر آٹھ کے ہندسے جیسا چھوٹا سا نشان بنایا جائے گا، جیسے: فیض، طفیل، ہیٔش، دیٔر۔ اِس علامت کا نام اُس نے "جزمِ غیر مدوّرہ" رکھا تھا۔ حرفِ ماقبل یہاں بھی حرکت (یعنی زبر) سے خالی رہے گا۔

ی کی طرح واو کی بھی چار قسمیں کی تھیں: معروف، مجہول، ماقبل مفتوح، معدولہ۔ —— مجہول واو کے لیے وہی علامت مقرر کی گئی جو یاے شوشہ دارِ مجہول کے لیے مقرر کی گئی تھی، جیسے: مورْ، چورْ، گولْ۔ "واو و یاے مجہول کی علامت کا نشان جزمِ مدوّرہ مقرر کیا" [تلخیصِ رسالۂ گل کرسٹ]۔ البتّہ جمع کی صورت میں اِس واو پر کوئی علامت نہیں ہوگی: "واو جمع کا ہمیشہ مجہول رہتا ہے، اِس واسطے کوئی علامت اُس کی مقرر نہیں کی، مثلاً: لڑکو، لڑکوں" [ایضاً]۔

واوِ معروف پر [یاے شوشہ دارِ معروف کی طرح] کوئی علامت نہیں ہوگی۔ واوِ ماقبل مفتوح پر [یاے لین کی طرح] آٹھ کے ہندسے جیسی علامت آئے گی، جیسے: قؤل، غؤر —— واوِ معدولہ کا سر خالی رہے گا، جیسے: خود، خوشامد۔ اِن چاروں کے حروفِ ماقبل حرکت سے خالی رہیں گے۔

ہاے ملفوظ اور ہاے مخلوط میں صورت کا امتیاز ملحوظ رکھا جائے گا۔ ہاے مخلوط کو ہمیشہ دو چشمی لکھا جائے گا، جیسے: گھر، تمھیں —— "جب الفِ مقصورہ بہ صورت یا کے ہو، تب اُس کے دامن میں ایک نشان بہ صورت خنجری زبر کے دیا جائے گا، جیسے: موسیٰ" [ایضاً] —— "اور الف ولامِ وصل و یا و واو جو حالتِ وصل میں متلفّظ نہیں ہوتے، اُن کے نیچے خطِ عرضی دیا گیا۔ جیسا: فی التّاریخ، ابوالقاسم وغیرہ" [ایضاً]۔

ہاے مختفی "ہندی میں اکثر ساتھ یاے مجہول کے بدل ہوتی ہے اہلِ ہند کے محاورے میں، جیسا: مُردے کو" [ایضاً]۔

باغ و بہار کے اِس نسخے [یعنی اشاعتِ اوّل] میں بھی اِن قاعدوں کی پابندی کی گئی ہے۔ بعض مثالیہ جملے: "مارے بھوکھ کے طاقت گوْیائی کی نہ تھی" — "میْرے آنے کی کِسو کوْ خبر نہ ہوْئے" — "روْتا دیکھ کر پوچھا" — "خدمت کر رہیْں ہیْں" — "اُن پر ایک جوْ کی ہاتھی دانت کی" — "توْ میْں نیشاپور کوْ چلوں" — "تمھیْں اوْلاد دیْنی اُس کے نزدیک کیا بڑی بات ہی" — "کیا صانع ہے" — "یہہ تماشا ہی" — "چُپکا ہوْ رہے" — "دل میْں خوش ہوئی" — "عالمِ خوشی کا" "پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوْتا ہی — اِنتظار کھینچتا ہی" — "ایک بارگی وُہی خواجہ سرا" — "نجیبوں کے قدردان"۔

اہتمام اور التزام کا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ ک کے متن میں ایک جگہ ص ۲۱ پر "تمہیْں" چھپ گیا ہے، غلط نامے میں اُس کی تصحیح کی گئی ہے اور "تمھیْں" کو صحیح بتایا گیا ہے۔ [اُس زمانے کی بات چھوڑیے، ہم میں سے بہت سے لوگ اِس زمانے میں اِس کی پابندی نہیں کر پاتے ہیں] ۔ ک میں ص ۲۲ پر ایک جگہ "دوْپٹّے" چھپا ہے؛ غلط نامے میں "دوپٹّے" [معِ واوِ معدولہ] لکھنے کی ہدایت ملتی ہے۔ ص ۳۰ پر ایک جگہ "ایسے"، یائے معروف کے ساتھ "ایسی" چھپ گیا ہے؛ غلط نامے میں اِس کی بھی تصحیح کی گئی ہے اور "ایْسے" لکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ غرض کہ اِس طرح کی تصحیحات کئی جگہ ملتی ہیں۔

اضافت کے زیر نہایت پابندی کے ساتھ لگائے گئے ہیں۔ ایک جگہ ص ۵۹ پر لفظِ ظالم میں اضافت کا زیر چھوٹ گیا ہے، غلط نامے میں اُس کی تصحیح کی گئی ہے۔ مشدّد حرفوں پر تشدید ضرور لگائی گئی ہے۔ گاف پر التزام کے ساتھ دُو مرکز ملتے ہیں۔ الفِ ممدودہ کو ہر جگہ مد کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ہائے ملفوظ شوشے دار ہو یا کَھنی دار، اُس کے نیچے شوشہ [ٹٹکن] ضرور ملتا ہے، جیسے: کہو، ہی۔

"اُس" اور "اُن" کے الف پر پیش اور "اِس" اور "اِن" کے الف کے نیچے زیر ضرور ملتا ہے۔ یہی احوال "اِتنا" اور "اُتنا" کا ہے۔ اہتمام کا اندازہ یوں کیجیے کہ

ک کے متن میں ایک جگہ ص ۵۶ پر " ان " چھپا ہوا ہے، غلط نامے میں اِس کی تصحیح کرکے " اُن " لکھا گیا ہے۔ " وہ " کے واو پر ہر جگہ پیش ملتا ہے، اِسی طرح " وُہی "۔ " یہ " کی ی کے نیچے ہر جگہ زیر ملتا ہے، مگر " یہی " میں اِس کا التزام نہیں ملتا۔

جملۂ معترضہ کو قوسین میں لکھا گیا ہے، مثلاً: " نجیبوں کے قدردان جان گل کرِسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اِقبال اُن کا زیادہ رہے جب تلک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ اِس قصّے کو ..... " [ک ص ۳] ——— " .... تب شاہ جہان آباد مشہور ہوا (اگرچہ دِلّی جُدی ہے۔ وُہ پُرانا شہر اور یہہ نیا شہر کہلاتا ہی) اور وہاں کے بازار کو اُردوے مُعلاّ خطاب دیا " [ک ص ۵]۔

اگر مرکّب کا ایک جز دوسری سطر کے شروع میں آیا ہے، تو اُس صورت میں پہلی سطر کے آخر میں ایک چھوٹا سا خط بہ طورِ علامت لگایا گیا ہے، جیسے: " نوّاب دلاور- جنگ نے بُلواکر " [ک ص ۴]۔ اِسی صفحے پر: " اشرفُ - البلاد کلکتّے میں "۔ پہلی مثال میں پہلی سطر " دلاور " پر ختم ہو جاتی ہے اور " جنگ " دوسری سطر کے شروع میں آیا ہے۔ دوسری مثال میں پہلی سطر " اشرف " پر ختم ہوتی ہے، اور " البلاد " دوسری سطر کے آغاز میں آیا ہے۔ اِس علامت کو ایسے مقامات پر التزام کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

جن لفظوں کے آخر میں قائم صورت میں ہاے مختفی آتی ہے [جیسے: مدرسہ] محرّف صورت میں ایسے لفظوں کے آخر میں عموماً یاے مجہول ملتی ہے، جیسے: " مدرسے کا، قصّے کو، شاہ نامے میں "۔ یہ تینوں مثالیں ص ۲ سے منقول ہیں۔ یا مثلاً: تقدیر کے حوالے، بے خطرے جلتا ہی، ایک گوشے میں، دیوان خانے کی تیّاری کو حکم کیا۔

مُعلاّ، اعلا، ادنا؛ اِن لفظوں کے آخر میں ہر جگہ الف ملتا ہے۔ " اُردوے معلاّ " بہ طورِ مثال ابھی اوپر آچکا ہے۔ [میر امّن نے مخطوطۂ گنجِ خوبی میں اپنے قلم سے اِن لفظوں کو ہر جگہ اِسی طرح لکھا ہے۔ مفصّل بحث ضمیمۂ تلفّظ و املا میں]۔

بہت سے غیر عربی فارسی لفظوں کے آخر میں بھی الف ملتا ہے، جیسے: راجا، بھروسا، تارا، پیسا، ڈبیا، بُلبلا، پتا۔

اکثر لفظوں میں ایک حرف پر یا دو حرفوں پر حرکات ملتی ہیں، جیسے: مُنتظِر، عُہدے، قدَم، قِبلہ گاہ، قدَر دانی، پچونجگی، رِکاب، مُسلمان، اُپرالا، کوشش، شِفا، مُسافِر، بہِشت، سرہانے، کِتاب، عَہد، خِدمات، تاجِر، طلَب، دُرُست، گُناہ۔ لیکن جزم کو کہیں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔

ٹ کے لیے ت کے نقطوں پر چھوٹا سا خط لگایا گیا ہے: تـ ـــــــ ڈ کے لیے د پر ویسا ہی خط: دَ ـــــــ ڑ کے لیے ر پر یہی خط: ر۔ جیسے: مِتّی، مِتّی، بوڑھا، دانتا ـــــــ آخرِ لفظ میں واقع نونِ غنّہ کو نقطے کے بغیر لکھا گیا ہے، جیسے: ہیں، یہاں، جہاں، میں، میں۔

پیراگراف بنائے گئے ہیں ـــــــ کاما اور فُل اسٹاپ لگائے گئے ہیں۔ فُل اسٹاپ کے لیے چھوٹا سا کھڑا خط ملتا ہے، جیسے: "شہر بے سر ہو گیا ا" ـــــــ کاما کے لیے چھوٹا سا ڈیش (-) استعمال کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اِن دونوں رُموز کی پوری طرح اور بہت سے مقامات پر صحیح طور پر پابندی نہیں ہو سکی ہے۔ ڈنکن فاربس نے بھی اپنے مرتّبہ نسخۂ باغ و بہار کے پیش لفظ میں اِس طرف توجّہ دلائی ہے اور اِسے خامی قرار دیا ہے۔ یہی احوال پیراگرافوں کا ہے۔ فاربس کے نسخے (ف) میں پیراگراف ک سے مختلف طور پر ملتے ہیں۔

ندائیہ نشان (!) ملتا ہے، جیسے: "سُبحان اللہ! کیا صانع ہی" (ک ص ۱)۔ "تُمھیں اولاد دینی اُس کے نزدیک کیا بڑی بات ہی! قِبلۂ عالم! اِس تصوّرِ باطِل کو دل سے دور کرو" (ک ص ۱۱)۔

سوالیہ نشان (؟) بھی لایا گیا ہے، مثلاً: "اِس سُوال کا کیا جواب دو گے؟" (ک ص ۱۱) لیکن اِس کا التزام نظر نہیں آتا۔ فاربس کے نسخے (ف) میں رُموزِ اوقاف کا اہتمام ک کے مقابلے میں کچھ بہتر دکھائی دیتا ہے۔

(۳) مرتّبۂ ڈنکن فاربس (ف):

مشہور مستشرق ڈنکن فاربس نے باغ و بہار کو مرتّب کیا تھا۔ اِس نسخے کی چار اشاعتیں میرے علم میں ہیں۔ دو اشاعتیں، پہلی اور چوتھی، میری نظر سے گزری ہیں اور میں نے اِن دونوں سے اِستفادہ کیا ہے۔ پہلی بار یہ لندن سے ۱۸۴۶ء میں اور چوتھی بار وہیں سے ۱۸۶۰ء میں شائع ہوا[1] تھا۔ مرتّب نے اپنے مقدّمے میں یہ لکھا ہے کہ میرے اِس نسخے کا متن اصلاً "۱۸۰۳ء" کی اشاعتِ کلکتہ [یعنی طبعِ اوّل] پر مبنی ہے اور دو خطّی نسخے بھی میرے سامنے ہیں، جن میں سے ایک مکمّل طور پر میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ [اِن خطّی نسخوں کی ضروری تفصیل اِس سے پہلے "خطّی نسخے" کے عنوان کے تحت لکھی جا چکی ہے]۔ اِس لحاظ سے یہ نسخہ قابلِ ذکر قرار پاتا ہے۔ اِس کی دوسری اہمیّت یہ ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کا مرتّبہ نسخۂ باغ و بہار، فاربس کے اِسی مرتّبہ نسخے پر مبنی ہے [اِس کی بحث نسخۂ عبدالحق کے تحت آ رہی ہے]۔

میں نے جب مکتبۂ جامعہ کے لیے "معیاری ادب" کے سلسلے میں باغ و بہار کو مرتّب کیا تھا، تو اُس وقت فاربس کے مرتّبہ نسخے کی چوتھی اشاعت کو سامنے رکھا تھا [اِس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اشاعتِ اوّل اُس وقت مجھے نہیں مل سکی تھی] لیکن اب میں نے چوتھی اشاعت کے بجاے، اُس کی پہلی اشاعت [۱۸۴۶ء] کو سامنے رکھا ہے۔ اِس ترجیح کی وجہ صرف یہ ہے کہ چوتھی اشاعت کے مقدّمے میں فاربس نے وضاحتاً لکھا

---

[1] اِس کا دوسرا اڈیشن لندن ہی سے ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اِس اڈیشن کا ایک نسخہ بمبئی یونی ورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ [یہ اطلاع ڈاکٹر یونس اگاسکر نے اپنے ایک خط میں دی ہے]۔ اِس اشاعت کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری میں ہے اور وہیں اِس کا تیسرا اڈیشن بھی ہے جو لندن ہی سے ۱۸۵۱ء میں شائع ہوا تھا۔ بمبئی یونی ورسٹی لائبریری میں فاربس کا کیا ہوا باغ و بہار کا انگریزی ترجمہ بھی موجود ہے، جو لندن سے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا تھا [مکتوبِ اگاسکر صاحب]

ہے کہ میر امّن کے اصل متن میں کچھ ایسے قابلِ اعتراض حصّے بھی تھے، جو مشرقی تحریروں میں عموماً پائے جاتے ہیں۔ میں نے ایسے حصّوں کو ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن اور پرنسپل کلکتہ یونی ورسٹی کے ایما پر یا تو حذف کر دیا یا قدرے مختلف الفاظ میں بیان کر دیا۔ اِس کے بعد اُس نے ڈائرکٹر مذکور کی چٹھی بھی درج کر دی ہے۔ اِسی بنا پر میں نے مناسب بل کہ ضروری سمجھا کہ اشاعتِ اوّل کو سامنے رکھا جائے جو تغیّر و تبدّل سے محفوظ رہی ہے۔

اِس نسخے کے سرورق کی آخری دو سطریں یہ ہیں: "سنہ ۱۸۴۵ عیسوی مطابق سنہ ۱۲۶۱ ہجری کے / ولیم واٹس کے چھاپے خانے میں"؛ مگر کتاب کے آخری صفحے پر سالِ طبع ۱۸۴۶ درج ہے۔ یہاں بھی وہی صورت معلوم ہوتی ہے جس کا تذکرہ طبعِ اوّل [۱۸۰۴ء] کے تعارف کے ذیل میں آچکا ہے۔ اُسی کے بہ موجب اِس نسخے کے لیے بھی یہی کہا جائے گا کہ یہ ۱۸۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ متن ص ۲۶۰ پر ختم ہوتا ہے۔ اُس کے بعد نہایت مفصّل فرہنگ ہے جس پر صفحات کے نئے نمبر شمار ڈالے گئے ہیں۔ اِس فرہنگ کے مفصّل ہونے کا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ ۱۳۰ صفحات پر حاوی ہے۔ الفاظ کو پہلے اُردو رسم خط میں اور پھر رومن رسم خط میں لکھا گیا ہے۔ اِس سے تلفّظ کے تعیّن میں آسانی ہوتی ہے۔ الفاظ کے معانی انگریزی میں لکھے گئے ہیں۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ فاربس نے گل کرسٹ کے نظامِ املا کی مکمل طور پر پیروی نہیں کی ہے۔ اِس نسخے میں کاما کے لیے تو وہی نشان ملتا ہے جو کے میں ہے، لیکن فُل اسٹاپ کے لیے پھول کا نشان * استعمال کیا گیا ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ کے کے مقابلے میں اِس نسخے میں کاما اور فل اسٹاپ، دونوں کے استعمال کی ترقّی یافتہ اور بہتر صورت نظر آتی ہے۔

سب سے زیادہ فرق علامتوں کے استعمال کا ہے۔ گل کرسٹ کے مجوّزہ نظام کے برخلاف، فاربس نے علامتوں کا کام زبر زیر پیش سے لیا ہے۔ یہ اہم بات ہے — یاے شوشہ دار معروف کے حرفِ ماقبل کے نیچے زیر لگایا ہے اور ایسی یاے مجہول کے حرفِ ماقبل کو حرکت سے خالی رکھا ہے۔ یاے ماقبل مفتوح، شوشہ دار ہو یا دامنی، اُس

کے حرفِ ماقبل پر زبر لگایا گیا ہے، مثلاً: چَیل، کَیل۔ تَیل، جَیل۔ غَیب، مَیں، مَی۔
یاے مشموم کو کسی بھی علامت کے بغیر لکھا گیا ہے اور نقطے معمول کے مطابق لگائے گئے ہیں، جیسے: پیار۔

واوِ معروف کے حرفِ ماقبل پر پیش لگایا گیا ہے، واوِ مجہول کے حرفِ ماقبل کو خالی رکھا گیا ہے، واوِ ماقبل مفتوح کے حرفِ ماقبل پر زبر لگایا گیا ہے اور واوِ معدولہ کے حرفِ ماقبل پر پیش لگایا گیا ہے۔ اگر اُس کے بعد الف ہے، تو پھر حرفِ ماقبل کو خالی رکھا گیا ہے، جیسے: طُور، نُور۔ چور، مور۔ دَوڑ، عَورت۔ خواہ سرا، خُوش۔

گل کرسٹ کے نظامِ املا میں جزم کی کوئی جگہ نہیں تھی، فاربس نے جزم کو بہ کثرت استعمال کیا ہے، مثلاً: "محرم، معشوقہ، مسجد"۔۔۔۔۔۔ آخرِ لفظ میں واقع ی کے نیچے ہر جگہ نقطے ملتے ہیں، جیسے: "دِي، کي، ھي"۔

مرکب لفظ اگر دو ٹکڑے ہو کر دو سطروں میں آیا ہے، تو ک کے برخلاف، وہاں کوئی علامت استعمال نہیں کی گئی ہے۔ وہ الف اور لام جو لکھے جاتے ہیں، لیکن پڑھنے میں نہیں آتے، اُن کے اوپر یہ نشان مہ بنایا گیا ہے، جیسے: "في الحقیقت، اشرفُ الاشراف"۔ ک میں اِن حروف کے نیچے خط کھینچا گیا ہے۔ ہاں ف میں صرف الف لام کے اوپر یہ نشان ملتا ہے [مثلاً "فی الحقیقت" میں ی کو اِس میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اِسی طرح دوسرے مقامات پر]۔۔۔۔۔۔ اضافت کے زیر اور تشدید کا التزام ملتا ہے۔ پیراگراف بنائے گئے ہیں اور ک کے مقابلے میں، بہ لحاظِ تکمیلِ مفہوم، یہ زیادہ بہتر اور مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

آخرِ لفظ میں واقع ی کی صرف ایک شکل ملتی ہے، خواہ وہ معروف ہو یا مجہول یا لین۔ پہچان اِس طرح قائم کی ہے کہ جس یاے معروف کے حرفِ ماقبل کے نیچے زیر ہے، وہ معروف ہے۔ جس کے حرفِ ماقبل پر زبر ہے، وہ لین ہے اور جس کا حرفِ ماقبل خالی ہے، وہ مجہول ہے، جیسے: ھَي، ھِي، ھي۔ ی کے نیچے نقطے التزام کے ساتھ لگائے گئے ہیں۔ ہاے ملفوظ اور ہاے مخلوط کی صورت کا امتیاز ملحوظ نہیں

رکھا گیا ہے، مثلاً: "غُصّي مین بھرِي ھُوئیُ"، "باھر آدي"، "مُجھی پکارا"، "بادشاھر.ادِی کی کیا تقصِیر ھَي؟" ——— لیکن "یہ" ہمیشہ ایک ملفوظ ہ کے ساتھ ملتا ہے اور حرفِ اوّل کے نیچے التزام کے ساتھ زیر ملتا ہے، اِسی طرح "وہ" کے واو پر ہر جگہ پیش ملتا ہے۔

آخری نونِ غنّہ پر بھی ہر جگہ نقطہ ملتا ہے۔ میں بہ طورِ مثال شروعِ کتاب سے دو جملے [مطابقِ اصل] نقل کرتا ہوں۔ اِن سے املا، اعراب، علامات اور رموزِ اوقاف کی صورتِ حال واضح ہو جائے گی:

"اب آغاز قصّي کا کرتا ھُون۔ ذرَہ کان دھر کر سُنو اَور مُنصِفي کرو * سَیر مین چار درویش کي یُون لِکھا ھَي۔ اَور کہنی والي نی کہا ھَي۔ کہ آگي رُوم کي مُلک مین کوئُی شہَنشاہ تھا۔ کہ نَوشیرَوان کي سي عَدالت اَور حاتم کي سي سخاوت اُس کي ذات مین تھي *"

ڑ، ڈ اور ٹ کے لیے چار نقطے بہ طورِ علامت لائے گئے ہیں: "کرتوُتوُن" "اُٹھائیُ"، "ڈبڈبا کر"۔ لفظوں پر اعراب بھی لگائے گئے ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ عربی کے جن لفظوں کا آخری حرف اصلاً مشدّد ہے، مفرد صورت میں بھی اُن پر التزام کے ساتھ تشدید ملتی ہے، جیسے: حدّ، محلّ، خاصّ، عامّ۔ مصرع: "کہ یہ میرِي گُفتگُو مقبُولِ طبعِ خاصّ و عامّ" [مقدّمہ]۔ ک میں ایسے کسی لفظ پر تشدید موجود نہیں۔

اِس نسخے میں اغلاط اچھّی خاصی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ غلط نامہ اِس میں شامل نہیں۔ میں دو تین مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ [ضمیمۂ تشریحات میں بہ ذیلِ اختلافِ نسخ اِن کی تفصیل موجود ہے]۔ ص ۱۲۸ پر ایک جملہ یوں ہے [اِن مثالوں میں ف کے املا کی پابندی نہیں کی گئی ہے]: "کُتّا صندلی سے جتنا چاہا اُتنا کھایا"۔ ک کے متن میں بھی یہ جملہ اِسی طرح ہے، مگر اُس کے غلط نامے میں اِس کی تصحیح کی گئی ہے اور اِسے اِس طرح صحیح بتایا گیا ہے: "کُتّے نے صندلی سے

نیچے اُتر ....."۔ صاف ظاہر ہے کہ مرتّب نے ک کے غلط نامے کو نہیں دیکھا۔

ف ص ۱۳۲ : "جو کچھ سواری اور برداری درکار ہو"۔ ک میں "بار برداری" ہے اور یہی درست ہے۔ ک میں ص ۲۱۹ پر ایک جملہ یوں چھپا ہوا ہے : "بیگمات اور خواصوں میں پلاگیا اور کھیلا کودا کیا"۔ ف میں بھی یہ جملہ اِسی طرح ہے، بل کہ اِس میں گاف پر زبر بھی لگایا گیا ہے ("گَیا")۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ک میں "گیا" غلطیِ طباعت ہے [البتہ غلط نامے میں یہ مذکور نہیں]، "پلاکیا" ہونا چاہیے۔ [نسخۂ مولوی عبدالحق میں "پلاکیا" ہی ہے] - ف میں ص ۵۴ پر ایک جملہ یوں ملتا ہے: "جب سانجھ ہوتی"۔ ک میں "جب سی سانجھ ہوتی" ہے۔ مرتّب کی سمجھ میں "سی سانجھ" نہیں آسکا ہوگا [یوں کہ یہ کوئی لفظ ہی نہیں، یہاں طباعت کی غلطی ہے] اُس نے متعارف لفظ "سانجھ" لکھ دیا اور "سی" کو چھوڑ دیا۔ م اور ن میں "سہی سانجھ" ہے، اور یہی درست ہے۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمۂ تشریحات میں ص ۲۹۹، حاشیہ ۱]

مجموعی طور پر بہ لحاظِ متن یہ نسخہ ک کے مطابق ہے۔ اِس میں ایسا کوئی اضافہ نہیں جس کے لیے کہا جاسکے کہ وہ کسی خطّی نسخے سے منقول ہے، اور متن میں کہیں ایسا نمایاں فرق بھی نہیں جس کے لیے یہ کہا جا سکے کہ ک کے مقابلے میں یہ کسی بھی اعتبار سے ترجیحی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر لحاظ سے ترجیحی حیثیت ک کو حاصل ہے ــــــ اِس نسخے کے لیے "ف" بہ طورِ علامت استعمال کیا گیا ہے۔

مرتّبۂ مولوی عبدالحق (ع)

اِس نسخے کی بُنیادی نسخے کے طور پر تو کوئی حیثیت نہیں، لیکن ایک دو باتیں ایسی ہیں جنھوں نے اِسے ایسی اہمیت بخش دی ہے جو بہ ہر صورت قابلِ ذکر ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اِس نسخے پر مولوی صاحب نے جو مقدّمہ لکھا تھا، اُس میں یہ بھی لکھا تھا کہ میر امّن نے اگرچہ نوطرزِ مرصّع پر اپنے نسخے کی بُنیاد رکھی ہے، لیکن اُنھوں نے کہیں بھی اِس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ پھر متعدّد مثالوں سے مولوی صاحب نے اِس بات کو ثابت

کیا تھا کہ جہاں جہاں فارسی کے متن [مراد ہے اُس نسخے کے متن سے جو مولوی صاحب کے سامنے تھا لیکن جس کا تعارف اُنھوں نے نہیں کرایا اور نہ کسی طرح کی نشان دہی کی] اور نوطرزِ مرصّع کے متن میں اختلاف ہے، میر امّن نے ایسے مقامات پر نوطرزِ مرصّع کی پیروی کی ہے۔ اِس کی اصل وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب نے طبعِ اوّل کو نہیں دیکھا تھا، جس میں یہ صراحت موجود ہے۔ متعدّد لوگوں نے اِس کی تردید کی، لیکن اِس سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ مولوی صاحب کے پیشِ نظر فارسی نسخے کے بہت سے مقامات کا متن سامنے آگیا اور یہ بحث بھی مکمل ہوگئی کہ میر امّن نے اصلاً نوطرزِ مرصّع کو سامنے رکھا ہے۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ مولوی صاحب نے اپنے مرتّبہ نسخے پر جو مقدّمہ لکھا تھا، اِس زمانے میں اُس نے اِس کتاب کی اہمیت کو صحیح معنی میں روشن کیا اور میر امّن کی نثر کی خوبی اور اہمیت کو اُجاگر کیا اور اُس کے محاسن کی نشان دہی کی۔ اِس سلسلے میں مولوی صاحب کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ مولوی صاحب نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ اُن کے نسخے کا متن کس نسخے پر مبنی ہے، حالاں کہ یہ سب سے ضروری بات تھی۔ اب یہ بات اعتماد اور یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مولوی صاحب نے ڈنکن فاربس کے مرتّب کیے ہوئے نسخے پر اپنے نسخے کے متن کی بنیاد رکھی ہے اور یہ بھی کہ باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل [۱۸۰۴ء] اُن کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ اِس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جن مقامات پر کے اور فے میں اختلاف ہے [خواہ یہ اختلاف کے میں موجود غلطیِ طباعت کا پیدا کیا ہوا کیوں نہ ہو]، وہاں بہ طورِ عموم ع کا متن فے کے مطابق ہے۔ اِس کی بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

فاربس کے نسخے [فے] کے تعارف میں "سہی سانجھ" کا حوالہ آچکا ہے کہ فاربس کے یہاں صرف "سانجھ" ہے؛ مولوی صاحب کے مرتّبہ نسخے [ع] میں بھی صرف "سانجھ" ہے ——— فے میں ص ۱۶۴ پر "ٹانکے مرہم لگایا" ہے، یہی ع میں ہے، جب کہ کے [طبعِ اوّل] میں "ٹانکے لگا کر مرہم لگایا" ہے۔ [غالباً فے کی طباعت میں

"لگاکر" چھوٹ گیا تھا، ع میں بھی وہ اُسی طرح نقل ہوا] ـــــ پہلے درویش کی سیر میں جہاں باغ کے خریدنے کا ذکر ہے، وہاں ایک جملہ یوں ہے: "ایک باغ.... تالاب، کنوئیں پختہ سمیت"۔ ف میں یہاں "کوئی سمیت" ہے اور یہی ع میں ہے ـــــ اسی بیان میں ک، میں باغ کی قیمت "لاکھ روپے" ہے، ف میں "پانچ ہزار" ہے اور یہی ع میں ہے ـــــ اسی بیان میں اِس سے پہلے، جہاں لڑکے کے شربت ورق الخیال کی صراحی لانے کا ذکر ہے، وہاں ک میں ہے: "ایک صراحی ہمیشہ بلاناغہ اِسی وقت حاضر کیا کر"۔ ف میں "بلاناغہ" موجود نہیں، ع میں بھی یہ لفظ موجود نہیں ـــــ ہمارے نسخے میں ص ۱۲۷ پر ایک جملہ ہے: "جو کچھ سواری اور بار برداری درکار ہو"۔ ف میں "سواری اور برداری" ہے اور یہی ع میں ہے۔ ہمارے نسخے میں ص ۲۰۰ پر، پانچویں سطر میں ایک جملہ ہے: "باری داروں نے میری خبر عرض کی"۔ ک میں یہی ہے، ف میں اِس نے یہ صورت اختیار کرلی: "باری دروان نے میری خبر عرض کی"۔ چوں کہ ف میں یائے معروف و مجہول کی طباعت میں املائی امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے، اِس لیے مولوی صاحب نے یہی قیاس کیا کہ "باری دروان نے" دراصل "بارے دروان نے" ہوگا اور اُنھوں نے اپنے نسخے میں یہی لکھا: "بارے دروان نے میری خبر عرض کی"۔ پورا ٹکڑا بدل گیا ـــــ ع میں بعض ایسے مقامات سامنے آتے ہیں جہاں اُس کا متن ف سے مختلف ہے [اور ک سے بھی] میں اِس کی تین مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ہمارے نسخے میں ص ۱۸۲ پر ایک جملہ یوں ہے: "ایسا اژدحام تھا کہ تھالی پھینکیے تو آدمیوں کے سر پر چلی جائے"۔ ک اور ف میں یہی ہے، لیکن ع میں "....آدمیوں کے سروں چلی جائے" ہے ـــــ اِسی صفحے پر ایک جملہ یوں ہے: "میں نے وہ خاتم اُس سے لی اور سلام کر کر رخصت ہوا"۔ ک اور ف میں یہی ہے، ع میں "تب" کا اضافہ ہے: "تب میں نے وہ خاتم ...."۔ ـــــ ہمارے نسخے میں ص ۲۲۶ پر پہلی سطر میں ایک جملہ ہے: "بہ خوبی و دیانت داری اور ہوشیاری سے کرے گا"۔ ف میں بھی یہ جملہ اِسی طرح، مگر ع میں

یوں ہے: "خوبی و دیانت داری اور ہوشیاری سے کرے گا" [ص ۲۰۵]۔ "بہ" کے حذف نے جملے کو زبانِ حال کے مطابق بنا دیا ہے۔ اِنھی مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ضمیمۂ تشریحات میں بہ ذیلِ اختلافِ نسخ ایسی جملہ تفصیلات لکھ دی گئی ہیں۔ یہ میں پھر عرض کروں کہ مولوی صاحب کا مقدّمہ جو ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے، بہت کام کی چیز ہے۔ اُنھوں نے اِس کتاب کے محاسن پر مختصراً جو گفتگو کی ہے اور اجمال کے ساتھ جس طرح لسانی جائزہ لیا ہے، آج بھی وہ پڑھنے اور سرمشق کے طور پر سامنے رکھنے کی چیز ہے۔ اور ہاں، یہ اہم بات کہ باغ و بہار ہو یا نوطرزِ مرصّع، [اصطلاحی معنیٰ میں] اِن میں سے کوئی بھی ترجمہ نہیں، تحسین نے اپنی زبان میں اور اپنے انداز سے فارسی کے قصّے کو اُردو میں لکھا اور میر امّن نے نوطرزِ مرصّع کو سامنے رکھ کر اُسی قصّے کو اپنی زبان میں اور اپنے انداز سے لکھا؛ اِس کی طرف سب سے پہلے مولوی صاحب نے اپنے اِسی مقدّمے میں توجّہ دلائی تھی۔

اِس نسخے کا دوسرا اڈیشن میرے سامنے ہے جو انجمن ترقّیِ اردو (ہند) دہلی کی طرف سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اِس میں فرہنگ شامل ہے، لیکن بہت مختصر ہے۔ غلط نامہ موجود نہیں۔

قصّۂ چہار درویش [فارسی]:

اب تک کی معلومات کے مطابق سب سے پہلے تحسین نے فارسی قصّے کو اُردو کا جامہ پہنایا تھا، لیکن تحسین نے اپنی کتاب میں یہ نہیں بتایا کہ فارسی کا کون سا نسخہ اُن کے سامنے تھا۔ فارسی قصّے کے نسخے اچھی خاصی تعداد میں مختلف کتاب خانوں میں محفوظ ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے باغ و بہار کے مقدّمے میں ایک فارسی نسخے کی متعدّد عبارتیں نقل کی ہیں، لیکن صراحتاً تو یہ نہیں لکھا کہ وہ کون سا نسخہ ہے جو اُن کے سامنے رہے، البتّہ اُنھوں نے یہ ضرور لکھا ہے کہ "فارسی نسخے کے شروع میں جو منظوم حمد ہے، اُس کے مقطعے میں صفیؔ تخلّص ہے" اُنھوں نے مقطع بھی نقل کر دیا ہے۔ اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے صفیؔ کا

نسخہ تھا۔ کلکتے کی ایشیاٹک سوسائٹی کے کتاب خانے میں فارسی کے قصۂ چہار درویش کا ایک خطی نسخہ محفوظ ہے، جس کے آغاز میں منظوم حمد ہے اور اُس کے مقطعے میں صفی تخلص موجود ہے اور یہ وہی مقطع ہے جسے مولوی صاحب نے اپنے مقدمے میں نقل کیا ہے۔ اِس میں امیر خسرو والی روایت موجود نہیں۔ یہ فورٹ ولیم کالج کی کتاب ہے، اُس کی مُہر موجود ہے، کل صفحات ۲۲۶۔ خط نسخ نستعلیق۔ ترقیمہ موجود نہیں۔ جین صاحب نے اپنی کتاب میں فارسی کے کئی مخطوطوں کا حوالہ دیا ہے [ص ۲۵۵ سے ص ۲۵۷ تک]۔ شیرانی صاحب کے پاس محمد علی کا لکھا ہوا خطی نسخہ تھا، جس کا اُنھوں نے باغ و بہار سے متعلق اُس مضمون میں ذکر کیا ہے جو سال نامۂ کارواں [لاہور] میں شائع ہوا تھا۔

جین صاحب نے اپنی کتاب اُردو کی نثری داستانیں میں اور اُس سے پہلے میرے نام اپنے طویل خط میں یہ لکھا تھا کہ فارسی قصۂ چہار درویش کا سب سے پُرانا اور ضخیم نسخہ علی گڑھ یونی ورسٹی لائبریری کے "ذخیرۂ حبیب گنج" میں ہے۔ یہ قول اُن کے یہ ۱۱۲۴ھ/ ۱۷۱۲ء کا مکتوبہ ہے [ایضاً ص ۲۶۵] ۔ ڈاکٹر نفیس جہاں نے میر امّن پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے مقالہ لکھا تھا، جو چھپ چکا ہے [میر امّن دہلوی : حیات و تالیفات، دہلی، ۱۹۸۶ء] اُس میں اُنھوں نے لکھا ہے : "پروفیسر گیان چند جین نے مسلم یونی ورسٹی کے حبیب گنج کلکشن میں چہار درویش کے جس قدیم ترین نسخے کا ذکر کیا ہے، اُس کا اب وہاں پتا نہیں چلتا" [ص ۸۴] ۔ اب سے سال بھر پہلے میں نے بہ طورِ خود اِس کو تلاش کرایا۔ میری درخواست پر جناب رئیس نعمانی نے دو بار پورے ذخیرے کو اور اُس کے رجسٹر کو کھنگالا، لیکن یہ نسخہ نہیں ملا۔ میں نے جین صاحب کو خط لکھا اور صورتِ حال سے مطّلع کیا۔ اُن کا اصرار ہے کہ وہ نسخہ وہاں تھا اور یہ کہ میں نے اُس سے نوٹس لیے تھے۔

ڈاکٹر نفیس جہاں نے اپنے مقالے میں کئی نسخوں کا حوالہ دیا ہے۔ غرض کہ فارسی متن کے نسخے متعدد ہیں اور اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ جب تک اُن سب نسخوں کو [عکس کی صورت میں] یک جا کرکے، اُن کا مفصّل مطالعہ نہ کیا جائے، اُس وقت تک

کئی باتیں وضاحت طلب رہیں گی اور صحیح طور پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکے گا۔

اصل میں یہ ایک الگ اور مستقل تحقیقی مقالے کا موضوع ہے۔ فارسی کے سب نسخوں کو جمع کیا جائے، اُن کا مطالعہ کیا جائے اور پھر داستان کے اجزا کی کمی بیشی، تقدم و تاخر اور ایسے ہی دوسرے اُمور پر مفصل گفتگو کی جائے ———— اِسی طرح نوطرزِ مرصّع اور باغ و بہار کا تقابلی مطالعہ بھی اِسی کا ایک جز بنایا جائے۔ اِس مکمل، مربوط اور یک جائی مطالعے کے بعد صحیح طور پر نتائج نکالے جاسکیں گے۔ یہ بات بھی قطعیت کے ساتھ اُسی وقت کہی جاسکے گی کہ تحسین اور میر امّن، اِن دونوں کا کارنامہ صرف زبان اور محض اندازِ بیان ہے، یا اصل قصّے میں بھی اِن لوگوں نے دخل دیا ہے اور اضافے کیے ہیں، اور اگر دخل دیا ہے، تو اُس کی نوعیت کیا ہے، اُس کی مکمل طور پر تفصیل اُسی وقت مرتب کی جاسکے گی۔ ایسے مطالعے کے بغیر کوئی رائے ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ ویسے بھی باغ و بہار کے متن کی تدوین کا اِس مطالعے سے بہ راہِ راست تعلق نہیں، یوں بھی اِس تحریر میں اِس موضوع کو چھیڑنا مناسب نہیں۔ اِس سے طریقِ کار کی بھی خلاف ورزی ہوگی اور وہ کام بھی ناقص اور ناتمام رہے گا۔ کوئی بات ڈھنگ کی اور قرینے کی نہیں کہی جاسکے گی۔ صرف گمان اور محض قیاس کے دائرے میں گردش کرنا اور ہَوا میں گرہ لگانا کوئی معقول کام نہیں۔

جین صاحب نے اپنی محوّلۂ بالا کتاب میں لکھا ہے: "لیکن نوطرزِ مرصّع، میر امّن کا واحد ماخذ نہیں، اُنھوں نے کسی فارسی نسخے سے بھی یقیناً استفادہ کیا ہے، کیوں کہ بعض مقامات پر وہ نوطرزِ مرصّع سے کافی ہٹ جاتے ہیں" [ص ۲۷۰]۔ ڈاکٹر نفیس جہاں نے اپنے مقالے میں تفصیل کے ساتھ نوطرزِ مرصّع اور باغ و بہار کے اختلافات کو درج کیا ہے [ص ۹۲ سے ص ۱۶۴ تک]۔ اِن سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ بہت سے مقامات پر اِن دونوں کتابوں میں مکمل مطابقت نہیں، مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ایسے سب مقامات پر میر امّن نے کسی فارسی نسخے کی پیروی کی ہے یا بعض مقامات پر خود بھی دخل دیا ہے۔ ایسی سب باتوں کا قطعی طور پر فیصلہ اُسی وقت

ہو سکے گا جب فارسی کے نسخوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور پھر نوطرزِ مرصّع اور باغ و بہار سے اُن کا تقابل کیا جائے۔ فارسی قصۂ چہار درویش کے ایک موخر مطبوعہ نسخے کا اِس سے پہلے "امیر خسرو سے منسوب روایت" کے ذیل میں ذکر آچکا ہے۔

قصّے کے ماخذ اور بعض دیگر متعلّقات :

ہفتے وار ہماری زبان [دہلی] کے شمارۂ ۲۲ نومبر ۱۹۸۳ء میں گیان چند جین صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، اُس میں اُنھوں نے لکھا تھا : "میرے ایک شاگرد رحمت یوسف زئی نے ... مجھے بتایا کہ چار درویش کے پہلے درویش کی سیر داستانِ چہل وزیر کی ایک کہانی سے ماخوذ ہے۔ میں نے کتاب لے کر دیکھی اور اُسے درست پایا۔" اپنی کتاب اُردو کی نثری داستانیں میں اُنھوں نے داستانِ چہل وزیر کا تعارف کرایا ہے اور ضروری تفصیل بھی لکھی ہے۔

اِس قصّے کے بیش تر اجزا دوسری داستانوں میں مل جاتے ہیں۔ جین صاحب نے ایسے ماخذ کی نشان دہی کی ہے۔ میں نہایت درجہ اختصار کے ساتھ اُنھی کے مندرجات کو یہاں پیش کیے دیتا ہوں۔ تفصیل کے لیے اُن کی کتاب کو دیکھنا چاہیے :

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ چار درویش کا کوئی نسخہ [مراد ہے فارسی قصۂ چہار درویش سے] بارھویں صدی ہجری سے، یعنی اٹھارویں صدی عیسوی سے پہلے کا نہیں ملتا۔ قصّے کی تصنیف اِس سے کچھ ہی پہلے ہوئی ہو گی۔ ہمیں پہلے اور چوتھے درویشوں کی سرگذشت کا صحیح ماخذ معلوم ہے۔ بقیہ کے مماثلات کہیں کہیں ملتے ہیں۔

پہلے درویش کی سیر : یہ حکایت تمام وکمال داستانِ چہل وزیر میں ملکہ کی اٹھارویں داستان سے لی گئی ہے۔ دوسرے درویش کی سیر : شہ زادیِ بصرہ کی سرگذشت کا نقشِ اوّل کتھا کوش میں مدن منجری کی کہانی ہے۔ جوگی اور کنکھجورے کے علاج کا واقعہ بالکل اِسی طرح حکیم جالینوس اور اُس کے شاگرد بقراط کے بارے میں پڑھنے میں آیا ہے۔ خواجہ سگ پرست کے بے وفا بھائیوں کی روایت کی ابتدا الف لیلہ کی دو کہانیوں میں

ملتی ہے۔" دو کتّوں والے شیخ" میں دونوں بھائی شیخ کو اسی طرح دغا دیتے ہیں —— آذر بائیجانی جوان کی واردات سند بادِ جہازی کے چوتھے سفر کی یاد دلاتی ہے۔ تیسرے درویش کی سیر میں داروغہ بہزاد والا واقعہ الف لیلہ کی قمرالزماں کی داستان سے ماخوذ ہے۔ چوتھے درویش کی سیر تمام و کمال الف لیلہ کی کہانی " شہزادہ زین الاصنام اور شاہِ جنّات" ہے، صرف انجام مختلف ہے۔

تحسین نے نوطرزِ مرصّع کے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ داستان اُن کے ایک ساتھی نے سُنائی تھی۔ زرّیں نے پہلے اِس قصّے کو فارسی میں لکھا تھا اور پھر اپنے آقا کی فرمائش پر اُسے اُردو میں لکھا۔ یہ اور ایسے ہی بعض دوسرے اندراجات سے یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصّہ مقبول رہا ہے۔ ایسی کہانیاں اور داستانیں جو مقبول ہوتی ہیں، سُنائی جاتی رہتی ہیں اور لکھنے میں بھی آتی رہتی ہیں؛ اُن میں الفاظ، بیانات اور ترتیب میں اختلافات پیدا ہو جانا قدرتی بات ہے۔ فارسی کے مختلف نسخوں میں جو باہم اختلافات ہیں [یعنی جواب تک سامنے آئے ہیں، اور وہ بھی جواب تک سامنے نہیں آسکے ہیں] وہ اِسی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یوں بھی یہ ضروری ہے کہ فارسی کے جس قدر نسخے اب تک علم میں آسکے ہیں، اُن کو یک جا کر کے، تقابلی مطالعہ کیا جائے اور پھر اُردو کے نسخوں سے اُن کا مقابلہ کیا جائے، تب صحیح صورتِ حال سامنے آسکے گی۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے نوطرزِ مرصّع کے مقدّمے میں ص ۳۸ پر یہ لکھا ہے کہ تحسین نے محمّد علی والے فارسی نسخے کو سامنے رکھا ہے [جس کا تعارف شیرانی صاحب نے اپنے مذکورہ مقالے میں کرایا تھا اور مثالیں بھی پیش کی تھیں] مگر اُن کا یہ قول بہ طورِ خود اِس نسخے کے مطالعے پر مبنی نہیں، اُنھوں نے شیرانی صاحب کے پیش کیے ہوئے اقتباسات پر اپنے خیال کی بنیاد رکھی ہے۔ جب تک کوئی شخص محمّد علی والے فارسی نسخے کو مکمّل طور پر نہ پڑھے اور نوطرزِ مرصّع سے اُس کا مکمّل طور پر تقابل نہ کرے،

اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے فارسی نسخے بھی اُس کے سامنے ضرور ہوں ؛ تب تک اِس سلسلے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا تقاضائے احتیاط کے خلاف ہے۔

محمّد علی کے فارسی نسخے کا تعارف پہلی بار شیرانی صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون میں کرایا تھا۔ انھوں نے اُس نسخے کو خود پڑھا تھا۔ اُس کی بعض عبارتیں بھی نقل کی تھیں۔ اُنھوں نے محمّد علی کی وہ فارسی عبارت بھی نقل کی تھی جس میں اُس نے لکھا ہے کہ :

"روزے ایں غلامِ مستہام در محفلِ اقدس .... بہ تقریبے حکایتے از دل ریشاں درویشاں و سرگذشتے از سرگذشتگانِ قلندراں بہ زبانِ ہندی بعزِّ عرضِ ہمایوں رسانید ..... بہ ایں کمینہ .... فرمان صادر شد کہ آں را از عبارتِ ہندی بہ زبان فارسی ترجمہ نماید۔ بناءً علیٰ ہذا ..... آں حکایت را بالسطر بہ زبانِ عجمی نقل نمود۔"

اِس عبارت سے بعض حضرات نے یہ مطلب اخذ کیا کہ محمّد علی کے سامنے ہندی زبان میں لکھی ہوئی یہ داستان تھی، اُس کا اُس نے بہ موجبِ فرمایش اُردو میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر نفیس جہاں نے اپنے محوّلۂ بالا تحقیقی مقالے میں لکھا ہے : "محمّد علی کا یہ بیان بھی محلِّ نظر ہے کہ میں نے سطر بہ سطر اِس قصّے کو ہندی سے فارسی میں منتقل کیا" [ص ۷۹] ۔ اُنھوں نے در اصل اپنے اِس بیان کی بنیاد مقدّمۂ باغ و بہار میں مندرج ممتاز حسین صاحب کے اِس قول پر رکھی ہے :

"اول تو وہ [محمّد علی] یہ نہیں بتاتا کہ اُس نے کس ہندی سے ترجمہ کیا، برج سے، راجستھانی سے، اودھی سے، یا کھڑی سے ..... اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ یہ قصّہ .... ہندی میں رائج تھا، تو پھر دیکھنا پڑے گا کہ ...."۔

[مقالہ نگار نے ممتاز صاحب کی یہ عبارت نقل کردی ہے]۔

ڈاکٹر سہیل بخاری اِس سے بھی کئی قدم آگے بڑھ گئے ہیں، اُنھوں نے اِس سلسلے میں لکھا ہے : "خود محمد علی کا بیان ہے کہ اُس نے یہ قصّہ کسی اُردو نسخے سے فارسی میں ترجمہ

کیا ہے" [اُردو داستان۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ص ۱۱۹] ۔

یہ کہنا کہ محمد علی نے خود یہ لکھا ہے کہ اُس نے " اُردو نسخے سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے" اُس مرحوم پر اتّہام لگانا ہے۔ اُس نے یہ بات ہرگز نہیں لکھی۔ دوسرے یہ کہ " بہ زبانِ ہندی" کا مطلب وہ نہیں جو ممتاز صاحب نے سمجھا ہے۔ اُس زمانے کی کتابوں میں اور شاعری میں "ہندی" سے ریختہ مراد لیا جاتا تھا جس کا دوسرا نام اُردو ہے۔ میر کے عہد تک اِس کی مثالیں خاصی اچھّی تعداد میں ملتی ہیں۔ میں میر کے ایک شعر اور ایک نثری حوالے پر اکتفا کرتا ہوں :

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سُرورِ قلب   آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زباں کے بیچ

(کلّیاتِ میر، مرتبۂ آسی، ص ۶۷۶)

صاف طور پر " ہندی زبان" سے اُردو زبان مراد ہے [جس میں " سرورِ قلب" کا لفظ آتا ہے اور میر اِسی " ہندی زبان" کو جانتے ہیں] ۔

زرّیں نے اپنے ترجمۂ چہار درویش کے آغاز میں لکھا ہے :

" ایک روز فرمایا اگر کلام زبانِ ہندی میں انتظام پائے، سامع کو بہ سہولت سرور آئے۔ میںنے خوشنودی آقا کو بہبودی دنیا وعقبیٰ جان کر سرمو رشتۂ ادب کو ہاتھ سے نہ دیا اور زبان اُردو میں قلم بند کیا "۔

خط کشیدہ ٹکڑے اِس پر گواہ ہیں کہ " ہندی" سے " اُردو" مراد ہے [میرے سامنے زرّیں کی اِس کتاب کا جو نسخہ ہے، اُس کا تعارف اِس سے پہلے کرایا جا چکا ہے۔ ہاں سرورق پر کتاب کا نام " نوطرزِ مرصع" مرقوم ہے] ۔

دوسری بات یہ کہ محمد علی کی فارسی عبارت سے یہ مطلب لازماً نہیں نکلتا کہ اُس نے جو حکایت سُنائی تھی، وہ کاغذ پر لکھی ہوئی تھی۔ جب تک اِس کے خلاف کوئی قرینہ نہ پیش کیا جائے، اُس کی عبارت کا مطلب یہی لیا جائے گا کہ اُس نے درویشوں کی ایک داستان سُنائی تھی اور اُسی طرح سُنائی تھی، جس طرح حکایتیں یا داستانیں سُنائی جاتی تھیں، یعنی زبانی —— بادشاہ نے اِس قصّے کو پسند کیا اور فرمایش کی کہ اِسے

فارسی میں لکھو۔ اُس نے حکم کی تعمیل کی اور اُردو میں سنائے ہوئے قصّے کو فارسی میں لکھا۔

نظرِ ثانی :

ہندی مینول اور پھر خطّی نسخے (ن) کی دست یابی نے یہ تو قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ باغ و بہار کی پہلی روایت پر نظرِ ثانی کی گئی تھی۔ ہندی مینول کے تعارف کے ذیل میں جو مثالیں نقل کی گئی ہیں، وہ اِس کا واضح ثبوت ہیں؛ مگر اِس سلسلے میں ہمیں یہ نہیں معلوم کہ نظرِ ثانی کا فیصلہ میر امّن نے بہ طورِ خود کیا تھا یا اِس میں کسی دوسرے شخص کی فرمایش کو بھی دخل تھا۔ یہ بھی واضح طور پر نہیں معلوم کہ نظرِ ثانی کے کام کو میر امّن نے تنہا انجام دیا تھا یا کسی دوسرے شخص [یا اشخاص] کے مشورے بھی شامل رہے ہیں۔ افسوس کی جو عبارت نقل کی گئی ہے، اُس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ افسوس نے باغ و بہار کے متن کو شروع سے آخر تک دیکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ پہلی روایت کی تکمیل کے بعد ہی یہ ممکن تھا کہ وہ اِس کتاب کے متن کو پڑھ سکتے۔ اِس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ بھی ہے کہ پہلی روایت کے متن کے سلسلے میں افسوس نے کچھ نہ کچھ درستی کا کام ضرور کیا تھا [وہ چند جملے سہی]۔ اِس کا بھی اچھّا خاصا امکان ہے کہ مصنّف کو کچھ مشورے بھی دیے ہوں۔

یہ پہلی روایت [ہندی مینول اور خطّی نسخہ] اور عہدِ مصنّف کی دوسری اور آخری روایت [طبعِ اوّل ۱۸۰۴ء] میں متن کے جو اختلافات ہیں، اُن کو اگر یک جا کر لیا جائے اور پھر مطالعہ کیا جائے تو صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ جملوں کو ساخت کے لحاظ سے بہتر بنایا گیا ہے، جس سے چستی اور روانی بڑھ گئی ہے۔ کہیں کہیں قافیہ بندی کا حُسن بھی نمایاں کیا گیا ہے [جو میر امّن کی تحریر کا ایک خاص وصف ہے] اور کہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی غلطی کی، یا یوں کہیے کہ کسی غیر مناسب بیان کی تصحیح کی گئی ہے۔ میں یہاں دس گیارہ مثالیں پیش کرتا ہوں، جن سے نظرِ ثانی کی کیفیت اور نوعیت کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکے گا۔ چوں کہ ضمیمۂ تشریحات میں اختلافِ نسخ کو شامل

کرلیا گیا ہے، اِس لیے جملہ تبدیلیوں کا احوال اُس سے بہ خوبی معلوم کیا جا سکتا ہے۔

ص ۱۶ پر چودھویں سطر میں ایک جملہ ہے: "نوبت خانے میں شادیانے بجنے لگے"؛ مگر پہلے اِس کو اِس طرح لکھا گیا تھا: "نوبت خانے میں شادیانے کے ٹکورے بجنے لگے" [م۔ن] ——— اِسی صفحے پر سترھویں سطر میں ہے: "اندرونِ محل داخل ہوئے"؛ مگر پہلے اِس کی شکل یہ تھی: "اندرون محل کے داخل ہوئے" [م۔ن]۔ دونوں جملوں کو اصلاحوں نے چُست بنا دیا ہے ——— ص ۱۹۰ پر چوتھی سطر میں ایک جملہ ہے: "پرنالے کی راہ سے نکلنا ہے تو نکل"؛ لیکن اِس کی پہلی شکل یہ تھی: "پانی کے پرنالے کی راہ سے ......" [ن]۔ "پانی کے" زائد ٹکڑا تھا، اُس کے حذف نے جملے کو بہتر بنا دیا ——— اِسی صفحے پر چھٹی سطر میں اِسی پرنالے کے سلسلے میں ہے: "لوہے کی میخیں اور سیخیں.... جمع کر کے لے آؤ تو اُس کو کشادہ کروں"۔ "تو اُس کو کشادہ کروں" یہ ٹکڑا ن میں نہیں، یعنی نظرِ ثانی کے وقت اِس کا اضافہ کیا گیا ہے اور اِس سے معنویت میں اضافہ ہوا ہے۔

ص ۱۸۹ پر تیرھویں سطر میں ایک جملہ یوں ہے: "ایسا درد سے تڑپھنے لگا کہ ایک آن کی آن میں مر گیا"؛ مگر پہلے اِس کو اِس طرح لکھا گیا تھا: "ایسا درد سے بے قرار ہوا کہ ....." [ن]۔ ظاہر ہے کہ پورے ٹکڑے کو بدلا گیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ معنویت کے لحاظ سے یہ اصلاح بہت عمدہ ہے ——— ص ۵۹، سطر ۱۰: "مٹتی نہیں کرم کی ریکھا۔ اِن آنکھوں کے سبب یہ کچھ دیکھا"۔ لیکن پہلی روایت [م۔ن] میں یہ اِس طرح تھا: "کرم کی ریکھا مٹتی نہیں۔ اِن آنکھوں کے سبب یہ کچھ دیکھا"۔ اصلاح نے قافیہ بندی کا حُسن پیدا کر دیا ——— ص ۲۱۴، س ۱۶: "قلعے میں بیٹھے آرام کیا کرو"؛ مگر یہ اصلاحی شکل ہے، پہلے اِس کی صورت یہ تھی: "قلعے میں بیٹھے گوز مارا کرو" [ن] ——— ص ۱۰۸، س ۷: "ایک قلفی چینی کی معجون بھری ہوئی دی کہ .... بلا ناغہ نہار نوشِ جاں فرمایا کرو"۔ پہلے اِسے یوں لکھا گیا تھا: ".... بلا ناغہ نگل جایا کرو" [ن]۔ "معجون" کے لیے "نگل جانا" قطعی طور پر غیر مناسب تھا، اُسے بدلا گیا۔

سراندیپ کی شہزادی کے قصّے میں ہے: "میں نے اپنے اوپر لازم کیا کہ آن اور جل اُس کو پہنچایا کروں" [ص ۱۵۰]۔ پہلے "کھانا اور جل" تھا [ن]۔ نظرِ ثانی میں "جل" کی رعایت سے "آن" لایا گیا اور یہ "کھانا" سے کہیں بہتر ہے ——

"نہیں تو آج رات کو تو ستیاناس ہوگا" [ص ۱۷۱]۔ ن میں یوں ہے: "نہیں تو ...... سنگسار ہوگا"۔ یہ قول مندر کی بڑی پجارن کا ہے۔ ظاہر ہے کہ "سنگسار" اُس کی زبان سے قطعاً غیر مناسب تھا، اُسے بدلا گیا ہے۔

ص ۱۸۱ پر ایک جملہ ہے: "اور اُتنا ہی کھود کر، چھان چھون کر تو بڑے میں ڈالا"۔ ک کے متن میں "اتنا ہی" کے بجائے "وتنا ہی" چھپا ہے، مگر غلط نامے میں اِس کی تصحیح کی گئی ہے اور "اتنا ہی" کو صحیح لکھا گیا ہے؛ لیکن ن میں "وتنا ہی" ہے۔ اِس کا صاف طور پر مطلب یہ ہے کہ میر امّن نے پہلے "وتنا ہی" لکھا تھا۔ ص ۹۶، س ۱۷: "جتنی خرچ کرو، اس میں اُتنی ہی برکت ہوتی ہے"۔ مگر ن میں "وتنی ہی" ہے۔ یہاں بھی اصلاح کی وہی صورت ہے —— "وتنا" اور "وتنی" کے سلسلے میں ایک خیال میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ شاید یہ افسوس کی اصلاح ہو۔ اِس خیال کی وجہ یہ ہے کہ گنجِ خوبی میں کئی جگہ "وِتنا" ملتا ہے، مثلاً: "جتنا خزانہ سالِ گذشتہ میں لایا تھا، وِتنا نہ لایا" [مخطوطۂ گنجِ خوبی، ص ۳۴۳، نسخۂ مطبوعہ، دہلی یونی ورسٹی اڈیشن ص ۳۱۶]۔ میر امّن نے واو کے نیچے زیر بھی لگایا ہے۔

"ہمّت بلند رکھ کہ خدا اور خلق پاس
ہمّت ہو جتنی، وِتنا ترا اعتبار ہو" [مخطوطۂ گنجِ خوبی ص ۳۶۔ نسخۂ مطبوعہ ص ۳۵]

یہاں بھی میر امّن نے اپنے قلم سے واو کے نیچے زیر لگایا ہے۔ اِس کا صاف طور پر مطلب یہ ہے کہ "وِتنا" اور "وِتنی" میر امّن کی زبان پر تھا اور اُنھوں نے [اپنی] بول چال کے مطابق اُسے لکھا بھی ہے۔ گنجِ خوبی، فورٹ ولیم کالج میں گل کرسٹ کے زمانے میں چھپی نہیں تھی، اُس کے خطّی نسخے میں یہ لفظ باقی رہ گئے۔ باغ و بہار میں بھی اِن لفظوں کو لکھا تھا؛ لیکن یہ کتاب چوں کہ گل کرسٹ کی نگرانی میں چھپی اور اُسی کے حکم کے مطابق

افسوس نے بھی اِس کے متن کو بہ نظرِ اصلاح دیکھا تھا، اِس لیے اِس کے متن میں یہ لفظ محفوظ نہیں رہ سکے۔ ایک جگہ غلطی سے شاملِ متن ہوگیا، تو غلط نامے میں اُس کی تصیح کردی گئی۔

نظرِ ثانی میں پوری عبارت بھی بدلی گئی ہے۔ ہندی مینوں کے تعارف میں اِس کی مثال موجود ہے، اُسے دیکھا جاسکتا ہے۔ اِن اصلاحوں کا مطالعہ دل چسپی کی چیز ہے اور اِس سے اُس اہتمام کا بھی بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے جو گل کرسٹ کے ملحوظِ خاطر رہتا تھا۔

باغ و بہار کی نثر — اہمیت اور اجزاے ترکیبی :

سب سے پہلے یہ ضروری بات پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ میر امّن کی حیثیت قصہ گو یا داستان نگار کی نہیں۔ واقعات ہوں یا کردار، یہ سب اُن کو اِسی طرح ملے تھے۔ اگر دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے رکھے گئے ہیں، یا بہ قولِ شیرانی : "مصنّف کی جغرافیائی معلومات، جیسا کہ افسانوں کا دستور ہے، ناقص ہے"، یا ایسی ہی کچھ اور باتیں؛ تو یہ سب بھی اُن کی "تصنیف" نہیں۔ اُنھوں نے اصل قصّے کو، جسے پہلے اُردو ہی میں مرصّع زبان میں لکھا جاچکا تھا، اپنی زبان میں لکھا ہے اور اصل حیثیت اُس زبان اور اُس اندازِ بیان کی ہے۔ تحسین کی نوطرزِ مرصّع اُن کا اصل ماخذ ہے؛ اُس کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہر کردار تحسین کی زبان میں باتیں کر رہا ہے۔ باغ و بہار میں ہر کردار اپنی زبان میں باتیں کرتا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ بہت سے مقامات پر میر امّن نے منظر نگاری یا تصویر کشی کے ذیل میں کچھ جزئیات کا اضافہ کیا ہے اور دونوں کتابوں کے ایسے مقامات کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو صاف صاف معلوم ہوگا کہ میر امّن کے اضافوں نے اُس منظر کو جان دار اور بھرپور بنا دیا ہے۔ زیادہ تفصیل کی گنجایش نہیں، میں صرف ایک مکالمے کو بہ طورِ مثال پیش کرتا ہوں، صورتِ حال کا اِسی سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

تیسرے درویش کی سیر میں ایک مقام پر کٹنیاں، شہ زادی کو ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔ ایک کٹنی اُس گھر میں آجاتی ہے جہاں شہ زادی موجود ہے۔ نوطرزِ مرصّع میں کٹنی، شہ زادی سے کہتی ہے: "اے صاحب زادی! میں ایک دخترِ عاجزہ، حاملہ رکھتی ہوں کہ دردِ زہ میں گرفتار ہے اور بے اختیار نان و کباب چاہتی ہے" [مرتبۂ نور الحسن ہاشمی، طبع اوّل، ص ۲۳۴] - اب میر امّن کا بیان دیکھیے:

"میں غریب رنڈیا، فقیرنی ہوں؛ ایک بیٹی میری ہے کہ وہ دُوجی سے، پورے دِنوں، دردِ زہ میں مَرتی ہے اور مجھ کو اِتنی وُسعت نہیں کہ آدھی کا تیل چراغ میں جَلاؤں، کھانے پینے کو تو کہاں سے لاؤں! اگر مر گئی، تو گور کفن کیوں کر کروں گی! اور جَنی، تو دائی جَنائی کو کیا دوں گی! اور جچا کو سَٹھوارا، اَچھوانی کہاں سے پلاؤں گی! آج دُو دِن ہوئے ہیں کہ بھوکھی پیاسی پڑی ہے" [ص ۲۱۱]۔

دونوں کے بیانات میں اندھیرے اُجالے کا فرق ہے۔ میر امّن نے جن جُزئیات کا اضافہ کیا ہے، اُن سے مکالمے میں جان پڑ گئی ہے اور پورا منظر متحرک محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہی میر امّن کا کمال ہے۔ یہ قولِ مولوی عبدالحق: "لفظ کو اُس کے صحیح مفہوم میں، ٹھیک موقع پر استعمال کرنا اصل انشا پردازی ہے اور اِس میں میر امّن کو بڑا کمال حاصل ہے" [مقدمۂ باغ و بہار]۔

میر امّن کی بامحاورہ اور روزمرّہ سے آراستہ نثر کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُردو نثر کا یہ نیا اسلوب، فارسی کی اُس طاقتور نثری روایت کے دباو سے ذہنوں کو آزاد کرانے کا نقطۂ آغاز بنا، جس نے ہندستان کے اہلِ علم کو بے طرح اپنا گرویدہ، بل کہ یوں کہیے کہ اسیر بنا رکھا تھا۔ ابوالفضل، ظہوری، طغرا اور نعمت خانِ عالی جیسے مشکل پسندوں کی نثر کو مثال اور معیار کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ نثر جو بیان کی پیچیدگی میں اپنی مثال آپ تھی اور جس میں لفظی و معنوی صنعتوں کا بہت زیادہ عمل دخل تھا، اِس نثر کے اثرات چھائے ہوئے تھے۔ نوطرزِ مرصّع کو اُردو میں اِسی روایت کا پہلا [ہلکا سا اور کچھ بگڑا

ہوا سا] نقش کہنا چاہیے۔ ایسے حالات میں معمولی یا اوسط درجے کی صلاحیت رکھنے والا کوئی شخص ایسے نئے اسلوب کا ڈول نہیں ڈال سکتا تھا جو فارسی کی اُس طاقتور روایت کے اثر اور دباؤ کو کم کرسکے اور اِس کے ساتھ ہی اُس مرصّع روایت کے مقابلے میں ایک سادہ وصاف [لیکن پُرکار] روایت کو اِس طرح پیش کرسکے کہ اب اُس کو مثال اور معیار کی حیثیت حاصل ہو جائے ــــــ میر امّن کی نثر نے یہی کام کیا ہے۔ باغ و بہار نے اُردو میں نثر نگاری کے اُس اسلوب کی تشکیل کی، جس نے آگے چل کر منفرد علمی حیثیت حاصل کی۔ میر امّن کی اصل حیثیت ایک ایسے صاحبِ طرز نثر نگار کی ہے جس نے اُردو میں سادہ و پُرکار پیرایۂ اظہار کا نقش درست کیا، روزمرّہ اور محاورۂ اہلِ زبان کی اہمیت کو صحیح معنی میں پہلی بار روشن کیا اور جس چیز کو چلن کہتے ہیں، لُغت اور قواعد کے مقابلے میں اُس کی افضلیت اور برتری کا اظہار اور اعلان کیا۔

پروفیسر احتشام حسین کے الفاظ میں : " ادبی نثر کی ترقّی کے لیے جس طرح کا ماحول ہونا چاہیے تھا، وہ آہستہ آہستہ ہندستان میں پیدا ہو رہا تھا۔ اٹھارویں صدی کا خاتمہ ہوتے ہوتے تاریخ نے ایک اور کروٹ بدلی تھی اور زندگی نئے حدود کی طرف بڑھ رہی تھی " [اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ ، ص ۱۲۸] ۔ ادب، خاص کر نثر میں "نئے حدود کی طرف " بڑھنے کے لیے فورٹ ولیم کالج نے راستہ بنایا تھا۔ اِس ادارے میں پہلی بار اِس زبان کی وسعت سامنے آئی۔ کالج میں اچھے اچھے مصنّفین کو گل کرسٹ نے یک جا کر دیا تھا، یہ اُس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اُن مصنّفین میں شیر علی افسوؔس اور بہادر علی حسینی جیسے کئی لوگ شامل تھے، جو علم میں شاید میر امّن پر فضیلت رکھتے ہوں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ نثر نگاری میں اُن میں سے کوئی ایک بھی میر امّن کے برابر کا نہیں۔ اُن سب نے [گل کرسٹ کی فرمایش اور ہدایت کے مطابق] سادہ وصاف نثر لکھی ہے، مگر اُس نثر میں دلوں کو چھو لینے اور ذہنوں کو متاثّر کرنے کی ویسی صلاحیت نہیں۔

سادہ و صاف نثر لکھنا بجائے خود کوئی بڑی بات نہیں۔ جس زمانے میں میر امّن نے کلکتے میں باغ و بہار لکھی ہے، اُسی زمانے میں، یعنی اُنھی دنوں شمالی ہندستان میں ایک دوسرے مصنف زرّیں نے بھی قصّۂ چہار درویش کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اِس ترجمے کی زبان آسان ہے، سادہ و صاف ہے؛ لیکن اُبالی کھچڑی کی طرح بےمزہ بھی ہے۔ میر امّن کی نثر میں جو حُسن، طاقت اور چھا جانے والی کیفیت ہے، اُس میں اُن کے زمانے کا کوئی شخص اُن کا شریک نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ باغ و بہار کو جدید اُردو نثر کا پہلا صحیفہ کہا گیا ہے۔ اِس کتاب نے ایک نئے طاقتور اسلوب کی بنیاد ڈالی، جو معیار ساز ثابت ہوا۔ باقی سب کی نثریں خوب ہیں، مشکل پسندی سے محفوظ ہیں، آسان ہیں؛ مگر اُن میں وہ طاقت نہیں کہ ایک نئے اُسلوب کی تشکیل ہو سکے اور ایک نئے پیرایۂ اظہار کے خطّ و خال روشن ہو سکیں۔ نئی روایت کی تشکیل ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ کالج کے کسی اور مصنف میں یہ جُرأت اور ہمّت نظر نہیں آتی جو [اُس زمانے میں جب فارسی زبان، قواعد اور لُغت کی حکم رانی کا دور تھا] قواعد اور لُغت پر استعمالِ عام کو ترجیح دے سکے اور اُس کو اپنے اوپر اِتنا اعتماد ہو کہ : مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ افسوس ہوں، حسینی ہوں یا دوسرے لوگ؛ ساری کوشش اور کاوش کے باوجود اُن کے یہاں "کتابی زبان" کے اثرات کارفرما رہتے ہیں۔

تکرارِ الفاظ

جن عناصر نے باغ و بہار کی نثر کو حُسن بخشا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُسے بول چال کی زبان سے قریب تر کر دیا ہے، اُن میں سے چند اہم اجزا کی، اختصار کے ساتھ، نشان دہی کی جاتی ہے: (۱) تکرارِ الفاظ اُن کے اندازِ بیان کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اِس خصوصیت نے کئی شکلوں میں اپنے آپ کو نمایاں کیا ہے۔ کبھی تو وہ تابعِ مہمل کی پیوندکاری کرتے ہیں؛ اور اِس سے اُردو پن اور بول چال، دونوں کا رنگ چمک اُٹھتا ہے۔

کچھ مثالوں سے اِس کا اندازہ ہوگا [یہ وضاحت کردی جائے کہ یہاں استقصا منظور نہیں، اِس لیے ایسے ہر بیان کے ذیل میں زیادہ مثالیں پیش نہیں کی گئیں]
مثلاً : موٹے جھوٹے کپڑے (ص۱۵) تب لوٹ پوٹ رہیں گے (ص۲۰) کچھ بیس پاس رہے تھے (ص۲۷) دھو دھا کر صاف کیا (ص۲۵) لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں (ص۲۴) دولتِ دنیا کھو کھا کر (ص۲۴) ہاتھ منہ دھو دھا کر۔ ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر پکڑ لاوے (ص۶۹) کپڑے وپڑے پھینک پھانک دیے (ص۶۵) ننگا منگا فقیر بن کر (ص۶۵) بھون بھان کر کھا لیتے (ص۶۴) بغیر پوچھے گچھے (ص۳۱) ورنہ بانٹ چونٹ نہیں لیتا (ص۱۳۶) سب چھوڑ چھاڑ کر (ص۱۴) لڑھتا پڑتا پہاڑ سے نیچے آیا (ص۱۴۵) منا منو کر (ص۶۵)۔
(۲) اِسی انداز کی ایک دوسری شکل یہ ہے کہ کبھی مرادف اور کبھی قریب المفہوم لفظوں کو ایک ساتھ لاتے ہیں، اِس سے بھی گفتگو کا انداز نمایاں رہتا ہے، مثلاً : آدمیوں کی ساتھ سنگت سے (ص۹) ایک بیٹا جیتا جاگتا مجھے دے (ص۱۱) سپاہ گری کا کسب وفن (ص۲۱) قرض وام سے کام چلے (ص۲۹) تلاش میں ناو نواڑے کی (ص۶۴) اُس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا (ص۲۱) سر پر بوڑھا بڑا نہ رہا (ص۲۱) راہ باٹ میں اگر بھینٹ ملاقات ہو جاتی (ص۲۳) رعیّت پرجا مگن ہوئے (ص۱۵) اُس نے دو ایک خط خطوط جو لکھے (ص۲۳) مجھے حصّے بخرے سے کیا کام ہے (ص۱۳۵) راہی مسافر، جنگل میدان میں سونا اُچھالتے چلے جاتے (ص۱) گھاٹ باٹ اِس دریا کا (ص۶۵)۔
(۳) کبھی وہ جملے میں ایک لفظ کو مکرر لاتے ہیں اور اِس تکرار سے بھی وہی فائدہ حاصل ہوتا ہے، جیسے : ابھی سے پڑ پڑ رہنا خوب نہیں (ص۲۰) جنس ملک ملک کی گھر میں موجود تھی (ص۲۰) قلیے، کباب تحفہ تحفہ، مزے دار (ص۲۳) ہزار ہزار شکر بجالایا (ص۲۳)۔
(۴) اِسی انداز کی ایک شکل وہ ہے جس میں وہ متضاد لفظ ایک ساتھ لاتے ہیں، جیسے : تمام آدمی چھوٹے بڑے، لڑکے بوڑھے، غریب غنی شہر کے باہر چلے (ص۸۴) راجا پرجا قدیم سے رہتے تھے (ص۷) جہلم میں اپنے بیگانے، چھوٹے بڑے جمع ہوئے (ص۲۱) جتنے آدمی وہاں کے ہزاری اور بزاری نظر پڑے (ص۹۷)۔

⑤ اِس انداز کا حُسن اُس وقت کچھ اور بڑھ جاتا ہے جب وہ طویل جملوں میں ایسے
متعدد لفظ یک جا کر دیتے ہیں، جن میں سے بعض میں دو دو مرادف یا قریب المفہوم
لفظوں کے ٹکڑے ہوتے ہیں، مثلاً: "سب دولتِ دُنیا، گھر بار، آل اولاد، آشنا
دوست، نوکر چاکر، ہاتھی گھوڑے چھوڑ کر اکیلے پڑے ہیں.... اور قبر کے اندر کا احوال
معلوم نہیں کہ کیڑے مکوڑے، چیونٹے سانپ اُن کو کھا گئے" (ص۱۷)۔

⑥ یا پھر موقعے کی مناسبت سے ایسے کئی لفظ ایک ساتھ لاتے ہیں جو اصل میں
ایک ہی مفہوم کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اِس طرح عبارت میں بیان کا حُسن تو پیدا ہوتا ہی
ہے، لفظیات کے ذخیرے پر لکھنے والے کی نظر کس قدر مُحیط ہے، اِس کا بھی اندازہ ہوتا
ہے۔ ایسے مقامات پر عبارت میں داستان سرائی کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے اور یہ
داستانی انداز پڑھنے والے کی نظر میں دل چسپی کی چمک پیدا کر دیتا ہے اور توجّہ کو
پوری طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، مثال کے طور پر اِن ٹکڑوں کو دیکھیے: "ویسے ہی
آدمی غُنڈے، پھانکڑے، مُفت پر کھانے پینے والے، جھوٹھے، خوشامدی آکر آشنا
ہوئے" (ص۲۲)۔ "اور نوکر چاکر، خدمت گار، بہلیے، ڈھلیت، خاص بردار، ثابت خانی؛
سب چھوڑ کر کنارے لگے" (ص۲۳)۔ "فرّاشوں نے فرش فروش بچھا کر، چھت، پردے،
چلونیں تکلّف کی لگا دیں" (ص۲۱)۔ "تب اُس نمک حرام، بے رحم، کٹر، سنگ دل
نے" (ص۵۵)۔ "ایک جوانِ شکیل، خوش لباس، نیک خو، صاحبِ مروّت" (ص۵۷)۔
"ایک طرف آتش بازی، پھلجھڑی، انار، داؤدی، بُھجّنیا، مروارید، مہتابی،
ہوائی، چرخی، ہتھ پھول، جاہی جوہی، پٹاخے، ستارے چُھٹتے تھے" (ص۵۶)۔
"وہ بالغ ہوا، مسیں بھیگنے لگیں، چھب تختی دُرست ہوئی.... دربان اور روتے،
میوڑے، باری دار اور یساول، چوبدار اُس کو.... منع کرنے لگے" (ص۵۱)۔ "یہ حالت
دیکھ کر دائی، دوا، چھوچھو، انگا؛ سب کی سب متفکّر ہوئیں" (ص۴۹)۔

⑦ اِس داستانی اندازِ نگارش کی خوبی میں ایسے مقامات پر اور زیادہ اضافہ
ہوگیا ہے جہاں اُنھوں نے طویل جملوں میں ایسے ٹکڑے یک جا کیے ہیں جن میں سجع کا سا

انداز ہے اور جس سے عبارت میں ایک خاص طرح کی خوش آہنگی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً : "ایک روز بہار کے موسم میں کہ ..... بدلی گھمنڈ رہی تھی، پھوئیاں پڑ رہی تھیں، بجلی بھی کوندہ رہی تھی اور ہوا نرم نرم بہتی تھی" (ص۵۵)۔ "ایک صراحی شربت کی تکلّف سے بنا کر، برف میں لگا کر، لڑکے کے ہاتھ لوا کر لایا" (ص۴۹)۔ "میں دل کے شوق اور اٹھکھیلیوں کے ذوق سے" (ص۴۹)۔ "اُس لڑکے سے ٹھٹھا، مزاح کر کر دل بہلاتی تھی۔ وہ بھی ..... اچھی اچھی، میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا اور اچنبھے کی نقلیں لانے، بلکہ آہ اُدہی بھی بھرنے اور سسکیاں لینے" (ص۴۹)۔ "وہ پھول سا بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا اور وہ رنگ جو کندن سا دمکتا تھا، ہلدی سا بن گیا۔ مُنہ میں پھپھیڑی بندھ گئی، آنکھیں پتھرا گئیں" (ص۹۲)۔

(۸) میر امّن کے حالاتِ زندگی کی بیش تر تفصیلات معلوم نہیں، اِس لیے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ قصہ گوئی اور داستان سرائی سے بھی اُن کو کچھ ربط رہا ہے؛ لیکن اِس کتاب میں متعدد مقامات پر عبارت کا انداز کچھ ایسا ہے جو داستان سرائی کی ہلکی سی چمک لیے ہوئے نظر آتا ہے، مثلاً اِس عبارت کو دیکھیے : "بارے جب آفتاب، تمام دن کا مسافر تھکا ہوا، گرتا پڑتا اپنے محل میں داخل ہوا اور ماہ تاب، اپنے دیوان خانے میں اپنے مصاحبوں کو ساتھ لے کر نکل بیٹھا" (ص۸۵)۔ یا پھر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے طویل جملوں کی ساخت میں اِس طرح شامل کیے گئے ہیں کہ وہ مفہوم کی تکرار کا حق ادا کرتے ہیں اور اِس طرح بات کو پُرزور بناتے ہیں؛ ایسے مقامات پر بھی قصہ گوئی کے رنگ کی ہلکی سی چھوٹ پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، مثلاً یہ عبارت :

> "اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پُتلی اور ماباپ کی موئی مٹّی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں، باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا" (ص۲۴)۔

اِس سے پہلے تیسرے درویش کی سیر سے ایک کُٹنی کی گفتگو نقل کی جا چکی ہے، اُسے ایک بار پھر پڑھیے، تو یہ محسوس ہوگا کہ کوئی باکمال قصہ گو تفصیل بیانی سے مدد لے کر

اپنے بیان کو پُرزور بنا رہا ہے۔ ایسے مقامات اچھی خاصی تعداد میں اِس کتاب میں سامنے آتے ہیں۔ بہ ہر حال قصّہ گوئی سے اُن کا کچھ تعلق رہا ہو یا نہ رہا ہو؛ جہاں جہاں منظر نگاری، مرقع کشی یا کسی واقعے یا بیان کی تفصیلات معرضِ تحریر میں آئی ہیں، ایسے سب مقامات پر بیان کا رنگ بہت چوکھا ہو گیا ہے اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی نہایت دل چسپ بیان کو سُن رہا ہے، جس میں شامل تفصیلات اُس کے خیال اور ذہن کو متاثر کرتی چلی جا رہی ہیں۔ محض وضاحتِ مزید کے لیے اِس منظر کو دیکھیے:

> "کیا دیکھتا ہوں کہ دو رویہ صف باندھے، دست بستہ سہیلیاں اور خواصیں اور اُردا بیگنیاں، قلماقنیاں، ترکنیاں، حبشنیاں، اذبکنیاں، کشمیرنیاں جواہر میں جَڑی، عُہدے لیے کھڑی ہیں۔ اندر کا اکھاڑا کہوں یا پریوں کا اُتارا" [ص ۸۶]۔

⑨ مرادف اور قریب المفہوم لفظوں پر اُن کی نظر بہت گہری ہے اور یہ صفت بھی بیانیہ کے حُسن کو چمکاتی ہے۔ مثلاً ایک جیل خانے کے لیے اُنھوں نے پانچ لفظ استعمال کیے ہیں: بندی خانہ، زنداں، محبوس خانہ، بنڈت خانہ، قید خانہ۔ اِسی طرح محبوس، بندیوان، قیدی۔ اِسی طرح مثلاً: "جتنے چور چکار، جیب کترے، صبح خیزے، اٹھائی گیرے، دغا باز تھے" [ص ۱۰]۔ یا مثلاً نوکر چاکر، خدمت گار، بہلیے، ڈھلیت، خاص بردار، ثابت خانی" [ص ۲۲]۔ ایسی مثالیں بہت ہیں۔ داستان گو کے تخیّل کی جھلک اِس اندازِ بیان میں دکھائی دیتی ہے۔ پُرانے قصّہ گویوں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ نام جانتے ہوں اور اُن کو سلیقے کے ساتھ اپنے بیان میں کھپانے پر قادر ہوں۔ باغ و بہار کی نثر کے بہت سے مقامات اِس خوبی اور اِس فنّی چابک دستی اور اِس مہارت سے معمور نظر آتے ہیں۔

<u>اِمالہ</u>: اِمالے کی بعض بہت دل چسپ مثالیں اُن کی عبارت میں ملتی ہیں اور ایسے مقامات پر عام بول چال کی زبان کا اثر اُبھر آتا ہے، ایسی چند مثالیں: دل میرا دبدھے میں ہے (ص۴۷) شاگرد پیشے اور مجرائی .... حاضر تھے (ص۵۹) بوزے خانے کی (ص۱۳۹)

مجرے گاہ میں (ص۱۶) اُس ماجرے کی حقیقت پوچھتا تھا (ص۵) آہستے سے کہا (ص۲۶) اصل و نفعے کا تھا (ص۲۹) تکلیف روزمرّے کے خرچ کی ہونے لگی (ص۲۹) اِدھر اُدھر پڑے پھرے (ص۳۷) عصے بردار کھڑے ہیں (ص۳۵) نمک پروردے (ص۱۳) یہ کیا معنے رکھتا ہے (ص۳۹) کئی مرتبے (ص۲۰۴)۔

"بہ" کے مرکّبات : اِسی طرح مرکّبات میں "بہ" کا استعمال اُن کی عبارت میں اِس طرح ملتا ہے کہ بعض مقامات پر تو اجنبی پن پیدا ہو جاتا ہے لیکن اکثر مقامات پر بات چیت کا انداز نکھر جاتا ہے، ایسی بعض مثالیں : رنگ بہ رنگ کی شکلیں (ص۶) رنگ بہ رنگ کے جانور (ص۳۳) گلابیاں رنگ بہ رنگ کی (ص۳۶) پیڑھی بہ پیڑھی (ص۳) زار بہ زار رونے اور دُبلاپے سے (ص۱۱۳) لہو میں تر بہ تر (ص۲۶) خوشی بہ خوشی اجازت دی (ص۳۴) خلعتیں طرح بہ طرح کی اور جواہر رنگ بہ رنگ کے (ص۵) میں خوشی بہ خوشی بُت خانے میں آیا (ص۱۰۳)۔

قافیہ بندی : یہ خیال کرنا کہ میر امّن نے پوری کتاب میں ساری کی ساری عبارت اُسی طرح لکھی ہے جس طرح بہ قول اُن کے : "ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں" کسی طرح درست نہیں ہوگا۔ اِس کتاب میں وہ سب عناصر موجود ہیں جو اُس دور کی انشا پردازی کا جُز تھے۔ بس فرق یہ ہے کہ دوسروں کے یہاں اُن کا تناسب اور اُن کی ترکیب وہ نہیں، جو میر امّن کی عبارت میں ہے۔ یہاں صنعتیں بھی ہیں، قافیہ بندی بھی ہے، اجنبی طرزِ ادا بھی ہے، فارسی کے انداز پر تراشے گئے جملے بھی ہیں جن میں بھدّا پن سمایا ہوا ہے، لفظی تعقید اور فشر گربگی بھی ہے؛ یہ سب سہی، مگر مجموعی طور پر عبارت میں اُردو پن نمایاں رہا ہے اور سہلِ ممتنع کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ اُنھوں نے قافیہ بند ٹکڑے عبارت میں سموئے ہیں، مگر ایسے مقامات پر ذہن یہ محسوس نہیں کرنے پاتا کہ لکھنے والا قافیہ بندی کا ہُنر دکھانا چاہتا ہے، بل کہ ایسے بیش تر مقامات پر عبارت کا حُسن کم نہیں ہونے پاتا، اور کہیں کہیں تو بڑھ جاتا ہے۔ قافیہ بندی کی یہ چند مثالیں اثباتِ مدّعا کے لیے کافی ہوں گی :

"اور زمین پانی کا بتاشا؛ لیکن یہ تماشا ہے (ص۳۰)" وہ شرابی اپنی خرابی دل میں سوچا (ص۵۸)، شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ سارے غریب و غربا دعا دیتے ہیں اور جیتے ہیں (ص۵)، سر سے پانو تک موتیوں میں جڑی، روش پر آکر کھڑی ہوئی (ص۴۱)، یہ سب بہار اُس کے بغیر میری آنکھوں میں خار تھی (ص۴۱)، بادشاہ کو خردمند وزیر کا کہنا یاد آیا اور دونوں کو مطابق پایا (ص۱۷)، مکھڑا سورج کی مانند چمکنے اور کُندن کی طرح دمکنے لگا (ص۲۹)، میں یہ تسلّی پاکر، اپنی استقامت کے مکان پر آکر، منتظر تھا کہ کب شام ہو، جو میرا مطلب تمام ہو (ص۳۸)۔

پوری کتاب ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ یہ قافیہ بندی ذوق پر گراں نہیں گزرتی، اِس کے برعکس عبارت میں ایک خاص انداز کی خوبی کا اضافہ کر دیتی ہے۔

صنعتیں : میر امّن کی نثر میں مناسباتِ لفظی کی کمی نہیں۔ مراعاتُ النّظیر، تضاد اور تجنیس جیسی لفظی صنعتیں پوری کتاب میں بکھری ہوئی ہیں۔ کچھ مثالوں سے اِس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے : تو نے اپنی عنایت سے سب کچھ دیا؛ لیکن ایک اِس اندھیرے گھر کا دیا نہ دیا (ص۱)۔ جو فکر میرے جی کے اندر ہے، سو تدبیر سے باہر ہے (ص۱۳)۔ شبِ قدر کو وہاں قدر نہ تھی (ص۳۸)۔ میرا دل تو اُس پر لٹو ہوئی رہا تھا، چکنی کی طرح اُس کے اختیار میں تھی (ص۵۰)۔ خدا نے مار کر پھر جِلایا (ص۵۹)۔ غصّے کی آگ میں پھُک رہی ہوں، آخر جل بل کر بھوبھل ہو جاؤں گی (ص۶۲)۔ اُس کی حمد و ثنا میں زبان انسان کی گویا گونگی ہے (ص۳)۔ تیری امید کا سوکھا درخت اِن کی توجہ سے ہرا ہو کر پھلے گا (ص۱۹)۔ سوداگری بھول کر تماش بینی کا اور لینے دینے کا سودا ہوا (ص۲۲)۔ ایسی مثالیں اِس کتاب میں بہت ملتی ہیں۔

بہت سے مقامات پر طویل عبارت کے مختلف ٹکڑے لفظی مناسبتوں سے معمور ہیں [قافیہ بندی مزید برآں] بس دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں : جاتے جاتے ان چیت ایک دریا [جس کے دیکھنے سے کلیجا پانی ہو] راہ میں ملا۔ کنارے پر کھڑے ہو کر جو

دیکھا.... کچھ تھل بیڑا نہ پایا۔ یا الٰہی! اب اِس سمندر سے کیوں کر پار اُتریں.... آخر یہ لہر آئی کہ.... میں تلاش میں ناؤ نواڑے کی جاؤں۔ جب تلک اسباب گزارے کا ہاتھ آوے، تب تلک وہ نازنین بھی آرام پاوے۔ تب میں نے کہا... گھاٹ باٹ اِس دریا کا دیکھوں (ص۶۶)۔ اِس آندھی اور اندھیرے میں یہ روشنی خالی حکمت سے نہیں۔ شاید اِس شمع کے نور سے میرے بھی گھر کا چراغ روشن ہو (ص۱۵)۔

صنعتیں اور لفظی رعایتیں، سچ تو یہ ہے کہ زبان کا جز رہی ہیں۔ جہاں تناسب بگڑ جاتا ہے، بس وہاں نظر رُکتی ہے اور میر امّن کے یہاں ایسے مقامات کم سے کم ہیں جہاں تناسب بگڑا ہو، یہی وجہ ہے کہ [جب تک خاص طور پر متوجہ نہ کیا جائے] عام طور پر یہ خیال بھی ذہن میں نہیں آتا کہ باغ و بہار کی نثر میں قافیہ بندی کا اہتمام بھی ہے اور لفظی رعایتوں کی صنعت گری بھی ہے۔ یہ بات لکھنے والے کے کمالِ فن پر دلالت کرتی ہے۔ ہاں یہ واضح ہے کہ اِسے خواہ انشا پردازی کہا جائے یا داستانی پیرایۂ اظہار سے تعبیر کیا جائے، مگر یہ انداز بول چال کی زبان کا نہیں۔

عربی فارسی اور ہندی الفاظ—: میر امّن کی نثر کے سلسلے میں ایک اور بات بھی وضاحت طلب ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُنھوں نے عربی فارسی الفاظ بہت کم استعمال کیے ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اُن کی عبارت میں بہ طورِ عموم ایسے عربی فارسی لفظ شامل نہیں ہو پائے ہیں جو غیر مانوس ہوں۔ ایک طرف تو یہ صورتِ حال ہے، دوسری طرف یہ ہوا ہے کہ جگہ جگہ کم مانوس یا نامانوس غیر عربی فارسی لفظوں کو جملے میں اِس طرح کھپایا ہے کہ ایسے مقامات پر عبارت کے وہ ٹکڑے چمک اُٹھے ہیں اور اندازِ بیان میں نیاپن پیدا ہو گیا ہے۔ کمال اُن کا یہ ہے کہ یہ کم مانوس لفظ اُن کی عبارت میں آکر اپنی اجنبیّت کھو دیتے ہیں۔ اِس قدر برمحل ہوتے ہیں کہ ذہن میں ایک نئی چمک پیدا ہو جاتی ہے اور نثر میں نئے پن کی روشنی شامل ہو جاتی ہے اور پڑھنے والا فوری طور پر محسوس کر لیتا ہے کہ عربی یا فارسی کے متعارف لفظ کا نہایت عمدہ بدل مل گیا ہے۔ اُن کی نثر میں عربی فارسی کے لفظ کم نہیں۔ مگر یہ الفاظ چوں کہ مانوس اور نظر آشنا ہوتے

ہیں، یوں وہ نظر کو اپنی طرف نہیں کھینچ پاتے۔ اُن کے مقابلے میں دوسرے لفظ چوں کہ کم مانوس ہیں، یوں اُن کا نیا پن ذہن پر اپنا گہرا نقش ثبت کر دیتا ہے اور نظر کو اچانک اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ وہ جگہ جگہ ایسی پیوند کاری کرتے ہیں کہ عبارت کا وہ ٹکڑا چمک اُٹھتا ہے اور پھر پوری عبارت پُراثر انداز ہو جاتا ہے، مثلاً : ”جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے“۔ ”گھر سینا“ ایسا محاورہ ہے جس سے لوگ عام طور پر مانوس نہیں، مگر ہے عام فہم اور دل کش اور مفہوم کو بہت عمدگی اور ہمہ گیری کے ساتھ ادا کر رہا ہے۔ اِس ایک ٹکڑے نے پوری عبارت پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ نظر اِس پر خاص کر رُک جاتی ہے اور ذہن میں نئے پن کا احساس اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ مثلاً اِس چار سطری ٹکڑے کو دیکھیے : ”اُسی وقت خواجہ سرا کو حُکم کیا کہ کل صبح کو قیمت اِس باغ کی لونڈی سمیت چُکا کر، قبالہ باغ کا اور خط کنیز ک کا لکھوا کر اِس شخص کے حوالے کر، اور مالک کو زرِ قیمت خزانۂ عامرہ سے دِلوا دو۔ اِس بَردانگی کے سنتے ہی آداب بجا لایا اور مُنہ پر رونَہت آئی“ [۵۵] اِس عبارت میں آخری ٹکڑا [مُنہ پر رونہت آئی] ایسا لگتا ہے جس پر نظر اچانک رُک جاتی ہے، اِس سے پہلے کے سارے جملے اور ترکیبیں نظر سے ذرا سی دیر کے لیے اوجھل ہو جاتی ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہے نیا پن۔

ہر اچھے قصّہ گو کی طرح میر امّن نے اِس کا بہت لحاظ رکھا ہے کہ جہاں کوئی خاص کردار آ گیا ہے تو وہ کردار اپنی ہی زبان میں باتیں کرتا ہے۔ مثلاً جوتشی جب زائچہ بناتا ہے یا کُٹنی جب باتیں کرتی ہے یا لکڑہارا جب کچھ کہتا ہے؛ تو ایسے سارے مقامات پر غیر عربی فارسی لفظ یا تو بالکل نہیں [مثلاً جوتشی کی گفتگو میں] یا پھر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایسے مقامات سے یہ استدلال کرنا کہ باغ و بہار میں ہندی لفظوں کا اوسط زیادہ ہے، یا یہ کہ اُن کی تعداد زیادہ ہے، درست نہیں ہوگا۔ فسانۂ عجائب میں بھی ایسے مقامات پر ایسے کرداروں کی گفتگو کا یہی انداز ہے۔ یہ تو قصّہ گوئی کا خاص انداز تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ میر امّن کی نثر میں ایسے لفظ بہت سلیقے کے ساتھ شامل ہوئے ہیں جن کی جگہ دوسرے انشا پرداز عموماً عربی فارسی کے لفظ لاتے ہیں۔

مثلاً : "بدلی گھمنڈ رہی تھی، پھوئیاں پڑ رہی تھیں" یہ انداز دوسروں کے یہاں نہیں ملتا اور ایسے ہی ٹکڑے اُن کی نثر کا حُسن اور زیادہ بڑھاتے ہیں اور اُن کا نقش پڑھنے والے کے ذہن پر اِس قدر گہرا ہوتا ہے کہ وہ مجموعی طور پر اُن کی نثر کو اِسی انداز سے معمور فرض کر لیتا ہے۔

مرکّبات ــــ : فارسی مرکّبات اُن کے یہاں کم ہیں اور جو ہیں، وہ کثیر الاستعمال ہیں، مثلاً ص ۲ سے ص ۲۱ تک بیس صفحوں میں کل مرکّباتِ اضافی و عطفی ۱۲۱ ہیں۔ ان میں اگر "نیک اندیش"، "قدردان"، "شب بیدار"، "نکتہ رس" اور "جہاں پناہ" جیسے مرکّبات کو بھی شامل کر لیا جائے تو اُن کی تعداد ۱۳۰ کے لگ بھگ ہو جائے گی۔ یہ اوسط کچھ زیادہ نہیں، معمولی ہے اور اِس نے بھی اُن کی نثر کو بوجھل ہونے کے اثرات سے بچائے رکھا ہے۔

اُن کے یہاں برچھی و تلوار، تخت و چھتر، چرن برداری، زیرِ جھروکے اور چینِ و آرام جیسے مرکّبات بھی مل جاتے ہیں، لیکن ایسے مرکّبات کی تعداد زیادہ نہیں۔ وہ فارسی مرکّبات کو اضافت یا حرفِ عطف کے بغیر، اُس طرح بھی لکھتے ہیں، جس طرح وہ بول چال میں آتے ہیں، اور کبھی وہ ایسا اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں کہ مرکّب صفاتی ٹکڑے جملے کی آرائش کو بہت بڑھا دیتے ہیں، مثلاً اِس جملے کو دیکھیے : "اِسی واسطے دل حیران اور خاطر پریشان تھا (ص۵۴)۔ ایک اور انداز یہ ہے کہ توصیفی مرکّبات میں ترتیب تو وہی فارسی ترکیب والی برقرار رہتی ہے، لیکن موصوف اُردو ہوتا ہے اور صفت کے طور پر فارسی یا عربی کا لفظ آتا ہے، مثلاً : خلعتیں فاخرہ، پنجرے آہنی، خواصیں شکیل۔ اِس انداز سے اُردو پن جملوں میں چمک اُٹھتا ہے۔

فارسیّت اور اجنبی طرزِ ادا ــــ : یہ دل چسپ بات ہے کہ باغ و بہار میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں طرزِ ادا میں اجنبی پن شامل نظر آتا ہے یا صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فارسی کے انداز پر جملے گڑھے گئے ہیں، جیسے فارسی جملوں کا ترجمہ کیا جا رہا ہو۔ ایسے طویل جملے بھی ہیں جن میں تقدیم و تاخیر، تعقید اور کا و اک

اندازِ بیان نے بھدّاپن نمایاں کر دیا ہے۔ ایسے مقامات کم نہیں۔ زیادہ مثالوں کی گنجایش نہیں، اِس لیے نسبتاً کم مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ پہلو اگر نظر میں ہو تو پڑھنے والا ایسے سارے مقامات پر از خود اِس صورتِ حال کو سمجھ سکتا ہے۔ سادہ و صاف اندازِ بیان اور عربی فارسی لفظوں کے مقابلے میں ہندی لفظوں کے کھپانے اور اُس سے پیدا شدہ حُسن کاری کے متعلّق اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، ایسے مقامات پر اُس سے مختلف صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ مثلاً اِس طویل مرکب جملے کو دیکھیے: "بہ موجب حُکم بادشاہ کے، اُس آدھی رات میں [کہ عین اندھیری تھی] مَلِکہ کو [جو جو بڑے بھونرے میں پلی تھیں اور سوائے اپنے محل کے دوسری جگہ نہ دیکھی تھی] بھوئی، لے جاکر ایک مَیدان میں، کہ وہاں پَرِندہ پَر نہ مارتا، انسان کا تو کیا ذِکر، چھوڑ کر چلے آئے" (ص۹۱)۔ مُبتدا کی خبر کس قدر دور واقع ہوئی ہے! پہلے ٹکڑے میں جو لفظی تعقید ہے، وہ مزید برآں۔ چند اور مثالیں: فقیر موافق فرمانے اُس کے (ص۳۰)، ساتویں برس میں پانو دیا (ص۲۴۲)، ایلچی نے زمین خدمت کی چومی (ص۱۱۹)، غور میں گیا (سوچنے لگا) (ص۱۰)، رعشہ ہو گیا (کانپنے لگا) (ص۱۷۳)، کسب کر رہا تھا (ہُنر دکھا رہا تھا) (ص۱۵۰)، آخر یہ حالت اپنی پہنچائی (ص۴۳)، تجھ سا عقل مند.... صحبت مے نوشی کی باہم گرم کرے، یہ کیا معنے رکھتا ہے (ص۳۹)، سب قوم.... آکر جمع ہوئے (ص۱۶)، اگر تم میں قوّت نہ تھی، تو کیوں ایسی کچّی ہوس پکائی (ص۴۲) اور سرانجام سرکشی کا کیا (ص۱۲۱) ہزار محنت سے وہ کئی منزلیں کاٹ کر اُس کے مکان پر پہنچا (ص۲۳) نہ مجلس خوشی کی خوش آوے (ص۴۵) محبّت اُس کی دل سے نہ بھولی (ص۵۲) میں نے اپنے دل میں یہ قول کیا تھا (یعنی عہد کیا تھا) (ص۴۷)، میں سرِ مو تفاوت کہتا ہوں (یعنی غلط کہتا ہوں) (ص۱۴۴)، اب حیا و شرم پکڑ اور صبر و قناعت کو کام فرما (ص۷۵)، میں بہ مجرّد سُننے اِس قصّے کے (ص۲۰۶)، کسو کو اُس کے آنے کی آہٹ کی خبر نہ ہوئی (ص۱۹)، مجھے باعث ہوا (اصرار کیا) (ص۲۰۷)، تلاش کر کے میری خاطر پیدا کر کے لا (ڈھونڈھ کر) (ص۲۲۶)، خدا کے توکّل پر بھروسا کر کے (ص۲۵)، یہ وہی لونڈی ہے جو اس باغ کے ساتھ

خرید ہوئی (ص۵۶)، جس واسطے یہ محنت کشی کر کر گیا، وہ مطلب ہاتھ نہ آیا (ص۲۰۶)، وہ ہرن نظروں سے چھلاوا ہو گیا (ص۱۹۵)، جب دوپہر ہوئی، برخاست ہو کر اندرونِ محل داخل ہوئے (ص۱۵)، سب قوم جمع ہوئے (ص۴)۔

جگہ جگہ فارسی کے انداز پر اُردو کے مرکب ٹکڑے ایسے آئے ہیں جن میں لفظی تعقید نے فارسی پن کے اثر کو نمایاں کر دیا ہے، صرف چند مثالیں: بہ سبب نام آوری کے (ص۶۹)، واسطے اپنے نبی کی آل کے (ص۴)، بہ موجب فرمایش کے (ص۵)، درود طفیل پیغمبر کی روح کے (ص۱۷)، ایک کونے میں اُس مکان کے چُپکا جا بیٹھا (ص۱۹)، ماباپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے (ص۲۴)، بہ سبب نام آوری کے (ص۶۹)، یے دونوں کی باتیں حاتم نے سُنیں (دونوں کی یے باتیں) (ص۷)، نباہ اپنا نہ دیکھا (ص۷)۔

"تے" اور "کو" کا استعمال: "نے" کے استعمال کی چند مثالیں: تب میں تے بے اختیار اُس پری کو.... بغل میں لے آیا (ص۱۱۱)، تو نے بستی کو چھوڑ کر جنگل پہاڑ کیوں بسیتا ہے (ص۱۹۷)، ذرا سُرت آئی، تو میں اپنے تئیں مُردہ خیال کیا (ص۱۴۵)، میں پاس جا کر جو دیکھا (ص۱۰۹)، جب میں جیتا اُٹھ کر، اُس معشوق کے مقابل جا کر سلام کیا (ص۱۹۷)، القصہ رات کو چُپکے یے دونوں بھائی اور کوتوال کے ڈنڈے نے مجھے اُس پہاڑ پر لے گئے (ص۱۴۵)[1]۔

"کو" کا استعمال: اِس قصّے کو.... ترجمہ کرو (ص۶)، جاگیر کو ضبط کر لیا (ص۶)، نواب علی مردان خاں نہر کو لے کر آیا (ص۳)، اب میں آغاز اُس کو کرتا ہوں جو ہے منظور کام (ص۴)،

---

[1] "نے" کا استعمال خاصی سیّال حالت میں رہا ہے اور بہت بعد تک اِس کے اثرات کارفرما رہے ہیں۔ انشا اور مومن کے یہاں سے ایسی چند مثالیں: غیر کے ملنے کا طعنہ جو دیا میں، تو کہا (کلامِ انشا، ص ۸) میں کہا، میں غلام ہوں، بولا (۱۳۵) ساتھ کے اپنے ہم صفیر جتنے تھے، سب نے رو دیا (۲۰۱)۔ رو دیا بے اختیار اُس شوخ نے تاثیر سے (مومن۔ دیوان مرتّبہ مولوی ضیا احمد، طبع ثانی، ص ۲۴۷) دیکھ اشکِ لالہ گونِ رقیب، اُس نے ہنس دیا (۱۰۷) رو دیا اُس نے جو میری لاغری کو دیکھ کر (۴۵) ـــــ یہی احوال "کو" کے استعمال کا ہے۔

سب کو کہ دو حاضر رہیں (ص۱۶) یہ نیّت کر کے اُس طرف کو چلے (ص۱۸) سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی (ص۲۱) دیوان خانے کی تیاری کو حکم کیا (ص۲۱) شبِ قدر کو وہاں قدر نہ تھی (ص۵۳) سب کو کہا (ص۲۰۵) میں نے خواص کو کہا (ص۴۷) بادشاہ بیگم کو کہو (ص۹۶) اپنے خاوند کو جا کر کہو (ص۲۱۴) اُس نازنین کو وہ تیل مل دیا (ص۲۳۶) رو بہ قبلہ کھڑا ہوا خدا کو کہتا تھا (ص۱۴۴)۔

جمع الجمع : اِس کتاب میں "سلاطینوں" اور "امراؤں" یہ دو لفظ کئی جگہ آئے ہیں (ص ۹، ۱۶، ۱۷۵، ۴۸، ۱۱۸) [اُن کی دوسری کتاب گنجِ خوبی میں ایسے متعدد لفظ ہیں، مثلاً : اقرباؤں، اصحابوں، مشایخوں، نذورات، اشرافوں ؛ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اُس زمانے میں اِس طرح مستعمل تھے]۔ اِس کے برخلاف جمع کو واحد کے طور پر بھی لایا گیا ہے : "میں رئیس اور اکابر اِس شہر کا ہوں" (ص۲۲۹)۔ [گنجِ خوبی میں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں، مثلاً : "ایک اُمرا اُس گھڑی حاضر تھا" (شائع کردۂ دہلی یونی ورسٹی، ص۱۲۳) ایک اصحاب نے ..... سوال کیا" (ص۸۹)]۔

تذکیر و تانیث : پُرانے شاعروں اور نثر لکھنے والوں کے یہاں اِس سلسلے میں بڑی رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سے لفظوں کی تذکیر و تانیث میں اختلاف آج تک موجود ہے۔ میر امّن کے یہاں بھی بعض مثالیں ایسی ملتی ہیں جو آج ہم کو بہت عجیب معلوم ہوں گی، مثلاً اُنھوں نے "شک" "فانوس" اور "خلعت" کو مونّث لکھا ہے، جب کہ بہ طورِ عموم یہ لفظ مذکر مستعمل رہے ہیں۔ اِس سلسلے میں قابلِ ذکر لفظ یہ ہیں [یہ وضاحت کر دی جائے کہ ہر لفظ کے آگے صرف ایک صفحے کا نمبر لکھا گیا ہے، لیکن اِس کا لازماً مطلب یہ نہیں کہ وہ لفظ بس ایک ہی جگہ آیا ہے۔ بعض لفظ متعدد مقامات پر آئے ہیں، مثلاً "التماس" ص ۸۲، ۸۶، ۴۴، ۹۶، ۲۲۵ پر آیا ہے، یا "فانوسیں" ص ۳۶ اور ۵۶ پر آیا ہے]۔

مُذکّر : آرام ص۵، آنول نال ص۶، التماس ص۸۲، بہشت ص۱۶۲، ٹھپّہ ص۱۹، جان و مال ص۱۶، جان و ایمان ص۱۶۳، جسم بجسم ص۶، جَبین ص۱۶، دُملیاں ص۲۰۱، راجا پرجا ص۷، رعیّت پرجا ص۱۶،

رقم (جواہر) ۳۱/۱۱، سن و سال ۸/۲۴۲، شہر پناہ ۸/۵، قوت ۶/۲۰، قند ۱۵/۱، لالچ ۶۹/۹، مینڈ ۱۴۵، ننگ و ناموس ۵۲/۵، واویلا ۱۱۹/۱۱ -

مونث : آئین ۱۳۳/ص، انند ۱۲/۱، تپ ۲۳۱/۱، حفظ و امان ۲۳۵/۵، خلعت ۴۹/۹، خلعتیں ۲۱/۱، خمیں (خم کی جمع) ۲۲۱/۱، دو ہتڑ ۱۲۰، دھراہر ۱۵۰، ڈھارس ۱۵/۱، رمز ۴۷/۲، ساتھ سنگت ۹/۹، سنگھاسن ۱۰۵/۵، سانس ۱۱/۱، سنجاف ۲۱/۱، شک ۱۲۶، عرض معروض ۱۵/۱، غور ۳۹/۹، فاتحہ ۲۰۹/۹، فانوس ۱۹/۱، فانوسیں ۳۶/۲، فکر ۱۳/۱، گلاب پاشیں [گلاب پاش کی جمع] ۲۴۳/۳، مانند ۲/۸، ناوک ۱۹/۷، نقب ۵۶/۵، واویلا ۲۴۱/۱، ہول ۵۷/۵ -

<u>اختلافِ عدد و معدود</u> : عدد جمع ہو اور معدود واحد یا یہ کہ فعل واحد لایا جائے، قدما کے یہاں اِس کی مثالیں ملتی ہیں۔ میر امّن کے یہاں بھی یہ صورتیں نظر آتی ہیں۔ وہ کہیں تو دونوں جز حالتِ جمع میں لاتے ہیں اور کہیں اِس کے برخلاف ؛ یہاں تک کہ ایک ہی جملے میں یہ صورتیں یک جا مل جاتی ہیں، مثلاً : پانَ سو اشرفی کے بدلے، پان پانَ سے جوتیاں اِن کے سر پر لگاؤ (ص۴۲)۔ یا اِن دو جملوں کو دیکھیے : پان سے اشرفی ..... انعام پاوے (ص۶۹)۔ پانچ سو اشرفیاں .... دلوادیں (ص۴۳)۔ اختلافِ عدد و معدود کی بس چند مثالیں اور : دو شخص کو ص۹۱، دو درویش کا احوال ص۱۱۵، چاروں درویش آپس میں ایک ایک کو تکنے لگا ص۱۱۴، دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا ص۲۵، ناگاہ دو جوان کو دیکھا ص۱۴۲، چاروں فقیر نے بھی دعا دی ص۲۴۰، یہ آسمان دو شخص کو ص۱۱۵، چار پری زادے نے ص۱۰۴، اگر ہزار سوار آوے ص۶۵ -

<u>مشترگربہ — "تا" علامتِ مصدر</u> : شترگربہ (مثلاً "تم" اور "تو" کا اجتماع) کی مثالیں اچھی خاصی تعداد میں ملتی ہیں۔ میں صرف تین مثالوں پر اکتفا کروں گا : غالب ہے کہ وہ دوستی تمھارے باپ کی یاد کرکر، ایک بوزنہ جو باقی ہے، تجھے دے (ص۲۲۳)، والد اِس عاجز کا .... بڑا سوداگر تھا (ص۲)، قبلۂ عالم اِس تصوّرِ باطل کو دل سے دور کرو (ص۱۴۱)۔

اساتذۂ دہلی اِس اصول پر کاربند رہے ہیں کہ اسمِ مذکر و مونث کی نسبت سے

علامتِ مصدر "نا" بدلتی رہے گی، مثلاً: کتاب پڑھنی اور اخبار پڑھنا۔ میر امّن کے یہاں بھی یہی التزام ملتا ہے، مثلاً: اولاد دینی ص۱۴، دُعا مانگنی ص۱، وظیفہ پڑھنا ص۱۔ صرف ایک جگہ "جلدی کرنا" آیا ہے: جلدی کرنا اور اُن کے درمیان مخل ہونا ص۱۹۔ غالباً قافیے کی رعایت نے یہاں یہ صورتِ حال پیدا کی ہے۔

ہائے مخلوط اور نونِ غنہ : ہائے مخلوط اور نونِ غنہ کا استعمال سیال حالت میں رہا ہے اور اب تک اُس کے اثرات کارفرما ہیں۔ خود میر امّن نے مخطوطۂ گنج خوبی میں اپنے قلم سے "بھوک" اور "بھوکھوں" لکھا ہے۔ باغ و بہار میں ایسے لفظ بھی ہیں جو کہیں مع ہائے مخلوط اور دوسری جگہ بغیر ہائے مخلوط ملتے ہیں، جیسے: ٹھنڈا اور ٹھنڈھا۔ اور کچھ لفظ ایسے بھی ہیں جو ہر جگہ صرف مع ہائے مخلوط آئے ہیں، جیسے: تڑپھنا، سامھنے [اب "سامنے" لکھتے ہیں] جھوٹھ، جھوٹھ موٹھ [مگر "جھوٹا" دوسری جگہ کے بغیر آیا ہے]۔ ضمیمۂ تلفظ و املا میں ایسے الفاظ زیرِ بحث آئے ہیں، اِس لیے یہاں مزید مثالوں سے قطعِ نظر کرتا ہوں۔

ہائے مخلوط ہی جیسا احوال نونِ غنہ کا ہے [دلّی والوں کے لہجے میں ویسے بھی متعدد لفظوں میں نونِ غنہ کی آواز شامل رہتی ہے]، مثلاً "ٹھینٹھ" مع نونِ غنہ ملتا ہے۔ چوں کہ ضمیمۂ تلفظ و املا میں ایسے لفظ بھی زیرِ بحث آ گئے ہیں، اِس لیے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں۔

سے، میں، کا، کی، کے، تو، آز: اِن کو جگہ جگہ جملوں میں اِس طرح لایا گیا ہے کہ آج اِس طرزِ استعمال اور طریقہ ادا میں اجنبی پن جھلکتا ہے، مثلاً:

سب علم سے ماہر ہوا (۶۸)، اور شہر کے سوداگر بچے سے شادی کر دی تھی (۲۱)، اپنے مطلب سے کام یاب ہوا (۲۲۱)، اس سال کے گزرنے سے اِس کی امانت اِس کے حوالے کر دوں گا (۲۲۰)، (یعنی اِس سال کے گزرنے کے بعد، یا گزرتے ہی)۔ کئی دن سے دوڑ دھوپ کر جنگل سے پکڑ لایا ہوں (یعنی کئی دن تک) (۷۱)۔ یا "مجھ سے" اور "تجھ سے" کی جگہ "مجھے" اور "تجھے"۔ جیسے: دونوں بھائیوں نے مجھے کہا (۱۳۵)۔ میں نے پہلے ہی تجھے کہا تھا (۸۶)۔

اب تو بھی جاکر اُس کی استدعا کر اور اپنے ساتھ ہی ساتھ لے آ [یعنی اُس سے استدعا کر] (ص۱۷)، عُذرِ مہماں داری کا کر کے، اُس کے شامل نہ ہوتا (ص۳۸)۔ مجلس کا شریک ہو (ص۱۹)۔

میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا (ص۲۴)، آج کے دن غریب خانے میں کرم کیجیے (ص۳۲)، ہر سال میں ایک دفعہ (ص۲۲۲)، ایک کوٹھری میرے تحت میں کر دی (ص۱۹۴)، گلے میں چمٹ گئی (ص۲۰۴)، خرید کرنے بازار میں گیا (ص۲۲۳)، نسبت ناتا کرنے میں راضی کیا (ص۲۳)، میرے مُنھ میں جیسے کسو نے مُہر دے دی (ص۱۵۵)۔

ایسے مرنے پر میں راضی ہوں (ص۲۰۴)، از برائے خدا یہ کیا مذکور ہے (ص۲۱۳)۔

میرے قبلہ گاہ نے .... میری اتالیقی کے لیے مقرر کیے تھے، تو تعلیم کامل ہر نوع کی پا کر قابل ہوں [تو = تاکہ] (ص۶۵)۔

"اُس پاس"، "کس پاس" جیسے ٹکڑے قدیم اساتذہ کے یہاں بالعموم ملتے ہیں۔ [غالب کے ایک قطعے کا تیسرا مصرع ہے: جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو]۔ باغ و بہار میں اِس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً: بادشاہ پاس لے چلوں (ص۲۱۹)، اُس پاس لے جاؤ (ص۲۷)، اِس فقیر پاس جو کچھ تھا (ص۲۹)، فقیر جوہری پاس گیا (ص۳۵)، بادشاہ پاس جاکر کہتا ہوں (ص۱۷)۔

مندرجۂ ذیل جملے میں [فارسی کے انداز پر] "جب تلک" حرفِ نفی کے اضافے کے بغیر آیا ہے: پھر میں نے پنڈ نہ چھوڑا، جب تلک وہ راضی ہوا (ص۳۵)۔ یا جیسے "اِلّا" کو مع اضافۂ "نہ" لانا: واِلّا نہ، جیسا کرے گا، ویسا پائے گا (ص۲۲۶)۔ واِلّا نہ، کسو بادشاہ کے ہاتھ .... نہ لگا (ص۲۴)۔ "واِلّا نہ" اپنے تو سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی (ص۲۴)۔

"کتنی" اور "کتنے" کا استعمال: "کتنی کتابیں اُسی سال .... تالیف ہوئیں" (ص۵) [یعنی کئی کتابیں]۔ "کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں رہا (ص۵) یعنی کئی سال، برسوں تک۔

اِسی طرح اِن جملوں میں "کوئی" اور "کئی" کا استعمال: "کوئی دن میں یہ ارادہ رکھتا

ہوں کہ سب چھوڑ چھاڑ کر.... نکل جاؤں" (ص۱۴۰)۔ یعنی چند روز میں، جلدی ——
"کئی برس کے عرصے میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی" (ص۲۲)۔ یعنی چند ہی سال میں ——
اِسی طرح: کتنے دن پیچھے وہ مردِ بزرگ جاں بہ حق تسلیم ہوا (ص۲۳۵)۔

کئی جملوں میں "علاوہ" کا استعمال بھی توجہ طلب نظر آتا ہے، مثلاً: "علاوہ، دانا اور نیک اندیش تھا (ص۱۴۰)۔ علاوہ، اپنی تقصیر کی خجلت سے مواجا تا ہے" (ص۲۴)۔
[اب ایسے مواقع پر "اِس کے علاوہ" کہتے ہیں]۔

افعال : میر امّن کی نثر میں افعال کی عجیب رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ کچھ تو ایسے فعل ہیں کہ پڑھنے والا اچانک یہ محسوس کرتا ہے کہ نیا لفظ سامنے آگیا ہے، مثلاً: نہیں تو.... ننگیالیں گے [سب کچھ چھین لیں گے] (ص۱۵۶)، چرھواں جوتا اڑایا [پہنا] (ص۱۰۱)، گھوڑے کو ننگیا کر (ص۲۱۵)، آپس میں بتیاتے ہیں (ص۲۰۳)، سب سرکاروں میں جو تحفہ چاہیتا [چاہیے ہوتا] (ص۱۳۷)، مجھے بھی بادشاہ زادی کہوایا (ص۹۱)، شیطان نے ورغلانا [ورغلایا] (ص۱۱۳)، خدا سے تو لگائے رہیں تھیں (ص۹۲)۔

اِس کے علاوہ مثلاً دھری ہیں اور دھرہی ہیں، باتیں بنائیں مجھے خوش نہیں آتیں؛ دیگیں ٹھنٹھنا رہیں ہیں، صافیوں سے بندھیں اور مجھروں سے ڈھکی رکھی ہیں، چُنی ہوئی اور چُنیں ہوئی۔ یا طرح طرح کے مرکب فعل، جیسے: نگاہ کیا، مصیبت کھینچی ہے۔

یا جیسے "کرکر" باغ و بہار میں بہ طورِ عموم ملتا ہے، مثلاً: نیست و نابود کرکر (ص۱۰)، نماز ادا کرکر (ص۱۱)، نیاز کرکر (ص۱۵)، سرفراز کرکر (ص۶)، مقرر کرکر (ص۱۸)، خرید کرکر (ص۲۴)، طلب کرکر (ص۵۵)، یاد کرکر (ص۲۲۳، ص۳۲)، توبہ استغفار کرکر (ص۱۴)، ارادہ کرکر (ص۱۹)، محنت کشی کرکر (ص۲۰۶)، تاکید کرکر (ص۴۵)، دریافت کرکر (ص۴۷)، استقبال کرکر (ص۳۵)، سیر کرکر (ص۴۱)، فراغت کرکر (ص۴۳)۔

[سرسید نے آثار الصنادید میں ایک جگہ لکھا ہے: "اگلی تاریخ کی کتابوں میں اِس بازار کو لاہوری بازار کرکہ لکھا ہے" (طبعِ دوم ص۵۲)۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ

عہدِ سرسیّد تک یہ کلمہ استعمال میں رہا ہے، البتّہ یہ ضرور ہے کہ باغ و بہار میں اس کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں]۔

"کر" جگہ جگہ اس طرح آیا ہے کہ آج اُس میں اجنبی پن محسوس ہوتا ہے، جیسے: خیمہ چوبوں پر استادکر، طنابوں سے کھنچوایا (ص۸)، حمدِ حق اور نعتِ احمد کو یہاں کر انصرام (ص۴)، فقیر سے صحبت بہت گرم کر، مزے کی باتیں کرنے لگا (ص۳۳)، خدا خدا کر جب صبح نزدیک ہوئی (ص۲۶)، میں کئی دن سے دوڑ دھوپ کر...... پکڑ لایا ہوں (ص۱۱)۔

اِس جملے میں "ہو" بھی اسی طرح آیا ہے: اِس بات سے دِق ہو کہنے لگی (ص۴۴)۔ ضمیمۂ الفاظ اور طریقِ استعمال میں افعال کی ایسی بیش تر اقسام کو یک جا کر دیا گیا ہے، تفصیل کے لیے اُسے دیکھا جا سکتا ہے۔

<u>الفاظ</u> : میر امّن کا یہ بڑا کمال ہے کہ اُنھوں نے لفظوں کی تراش اور کم معروف ہندی الفاظ کے برمحل استعمال کا نیا شعور بخشا ہے۔ دیدارو (خوب صورت) شتابو، بھیدو (محرمِ راز)، سرے پاو (خلعت)، سادی خوزادی، پھساہنڈے، چوچلے، بنڈت خانہ، پرپیچ، پرچھا، سُرت، اُپرالا جیسے بیسیوں لفظ اِس کتاب میں آئے ہیں، جن سے عبارت میں تازگی اور نیا پن پیدا ہو گیا ہے اور پہلی بار یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلے دنوں میں کیسے کیسے کام کے لفظ ہمارے پاس تھے، جن کو ہم چھوڑتے گئے اور بھولتے گئے۔ "چکمک" (چقماق) "تالیقہ" اور "جمیرات" جیسے لفظ واقعتاً عام بول چال کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اِسی طرح "مزاخ" اور اِس کی جمع "مزاخیں" عوامی استعمال کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اُنھوں نے عربی کے بعض ساکن الاوسط الفاظ کو متحرک الاوسط کر لیا ہے، جیسے: نَقَب؛ یہ بھی استعمالِ عام کی ترجمانی ہے۔ ضمیمہ ۳ میں چوں کہ ایسے بیش تر الفاظ کو یک جا کر دیا گیا ہے اور ضمیمہ ۲ میں تلفظ اور املا کی بحثیں آگئی ہیں، اِس لیے یہاں زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اِس کتاب میں خاص خاص افعال اور الفاظ ایک ایسا موضوع ہے جو مفصّل مطالعے کا مستحق ہے۔ اِس

مطالعے کے بغیر میر امّن کی نثر کے پورے محاسن نظروں کے سامنے نہیں آپائیں گے اور یہ اچھی طرح معلوم نہیں ہو پائے گا کہ اِس کتاب نے اُردو نثر میں ایک نئے اسلوب کی جو بنیاد رکھی تھی، اُس کے اجزاے ترکیبی کیا ہیں۔ اِس کی مقبولیت کا راز بھی اِسی پردے میں چھپا ہوا ہے۔

طریقِ کار :

اِس مقدمے کے پہلے حصّے میں یہ وضاحت کی جاچکی ہے کہ باغ و بہار کے یہ پانچ نسخے پیشِ نظر رہے ہیں :

۱۔ خطّی نسخہ [روایتِ اوّل] : ن
۲۔ ہندی مینول : م
۳۔ طبعِ اوّل [۱۸۰۴ء] : ک
۴۔ مرتّبۂ ڈنکن فاربس : ف
۵۔ مرتّبۂ مولوی عبدالحق : ع

متن کی بنیاد ک پر رکھی گئی ہے۔ ک کے آخر میں طویل غلط نامہ شامل ہونے کے باوجود، متن میں طباعت کی بعض غلطیاں باقی رہ گئی ہیں؛ م، ف اور ن کی مدد سے اُن کی تصحیح کی گئی ہے اور ضمیمہ ۱ میں بہ ذیلِ اختلافِ نسخ ایسے جملہ مقامات کی نشان دہی کردی گئی ہے۔ اِس کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کہ سختی کے ساتھ اصل متن کی پابندی کو لازم سمجھا جائے۔ پوری کتاب میں صرف ایک جگہ ص ۷۰ پر "سے" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ امتیاز کے لیے اِسے قوسین میں لکھا گیا ہے اور ضمیمۂ تشریحات میں (ص ۳۰۸، حاشیہ ۳ کے تحت) اِس پر گفتگو کی گئی ہے کہ یہ اضافہ کیوں ضروری سمجھا گیا۔ اِس ایک اضافے کے علاوہ، کسی دوسری جگہ کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

اِس سے پہلے یہ وضاحت کی جاچکی ہے کہ گل کرسٹ کے مقررہ نظامِ املا کے تحت ک میں اضافت کے زیر اور تشدید لگانے کا التزام ملتا ہے۔ اِسی طرح علامات اور

اعراب بھی ملتے ہیں۔ معروف و مجہول آوازوں کا تعین تو بہت التزام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اِسی کی مطابقت میں اِس متن میں بھی اضافت کے زیر التزام کے ساتھ لگائے گئے ہیں اور یہی صورت تشدید کی ہے۔ اضافت کے سلسلے میں بہ طورِ عموم کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے؛ مگر اضافت کا معاملہ یہ ہے کہ بہت سے مقامات پر ذہن میں یہ کچھ الجھن پیدا ہو سکتی ہے [اور ہوئی ہے] کہ یہاں اضافت کا زیر آنا چاہیے تھا یا نہیں آنا چاہیے تھا۔ ایسے سارے مقامات پر [نشان کے طور پر] گول دائرے کے اندر حاشیے کا نمبر لکھا گیا ہے اور ضمیمۂ تشریحات میں ایسے سارے وضاحت طلب مقامات پر ضروری گفتگو کی گئی ہے۔

بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث کے سلسلے میں وضاحت کی ضرورت محسوس کی گئی؛ ایسے سارے مقامات پر بھی گول دائرے کے اندر حاشیے کا نمبر لکھا گیا ہے اور اُس کے مطابق ضمیمۂ تشریحات میں حسبِ ضرورت مفصّل یا مختصر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً ص ۹ پر "ساتھ سنگت" آیا ہے اور ص ۱۶ پر [پہلی بار] "جان و مال" آیا ہے، اِن پر مفصّل بحث بالترتیب ص ۲۷۳ پر حاشیہ ③ کے تحت اور ص ۲۷۷ کے حاشیہ ① میں دیکھی جا سکتی ہے [وغیرہ]۔

لفظوں میں ضرورت کے مطابق حروف پر زبر، زیر، پیش لگائے گئے ہیں اور جزم بھی لگایا گیا ہے۔ اصل کی مطابقت کے علاوہ، اِس کو یوں بھی ضروری سمجھا گیا کہ اب [کسی نہ کسی وجہ سے] تلفّظ کا مسئلہ طلبہ اور اساتذہ، دونوں کے لیے پریشان کن ہو گیا ہے، خاص کر [اب] کم معروف اور نامانوس لفظوں کا صحیح طور پر پڑھنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اِسی طرح معروف، مجہول، مخلوط اور غنّہ آوازوں کے تعین کے لیے علامات سے کام لیا گیا ہے۔ اِس کی تفصیل یہ ہے:

درمیانِ لفظ واقع یائے معروف کے نیچے چھوٹا سا الف لگایا گیا ہے، جیسے: تیر، بیچل ——— یائے مجہول کے لیے حرفِ ماقبل کے نیچے زیر لگایا گیا ہے، جیسے: دیر، تیل ——— واوِ معروف پر اُلٹا پیش لگایا گیا ہے، جیسے: طور۔

چھُول ——— واوِ مجہول کے لیے حرفِ ماقبل پر پیش لگایا گیا ہے، جیسے : چُور، تُوڑ ——— واوِ معدولہ کے نیچے چھوٹا سا خط کھینچا گیا ہے، جیسے : خوٖزادی۔ ایسے مقامات پر واو سے پہلے جو حرف ہے، اُس پر پیش نہیں لگایا گیا ——— مخلوط آوازوں کے لیے اُن حروف پر آٹھ کے ہندسے جیسا نشان بنایا گیا ہے، جیسے : کٖیا، پٖیاس، ہٖوئی (بروزنِ فع) ——— نونِ غنہ پر اُلٹے قوس کا نشان بنایا گیا ہے، جیسے : مُنہ۔

کاما، سیمی کولن، ندائیہ، استفہامیہ جیسے رموزِ اوقاف کو پابندی کے ساتھ شاملِ عبارت کیا گیا ہے۔ خاص خاص ناموں پر خط ضرور کھینچا گیا ہے [اِس سلسلے کی پہلی کتاب فسانۂ عجائب میں بھی اِنھی علامات کو استعمال کیا گیا ہے اور اِسی طرح رموزِ اوقاف کی پابندی کی گئی ہے] ۔ کے کے متن میں جن جملوں کو قوسین کے اندر لکھا گیا ہے، اُن کو اُسی طرح قوسین کے اندر رکھا گیا ہے۔ ایک خاص اہتمام یہ بھی کیا گیا ہے کہ جن مقامات پر جملے میں دو ٹکڑوں کے درمیان کاما نہیں آسکتا، مگر خواندگی کی آسانی کے لحاظ سے وہاں پر فصل ضروری ہے؛ تو ایسے مقامات پر دو لفظوں کے درمیان [کتابت میں] ذرا سا فصل رکھا گیا ہے، تاکہ اِس طرح وہی فائدہ حاصل ہو سکے جو دوسرے مقامات پر کاما سے حاصل ہوتا ہے اور کسی طرح کی معنوی خرابی بھی پیدا نہ ہو۔ [فسانۂ عجائب میں بھی اِس کا التزام کیا گیا ہے] ۔

اِس سلسلے کی پہلی کتاب فسانۂ عجائب کے متن میں صرف اختلافِ نسخ کے نمبر شمار ڈالے گئے تھے۔ بعد کو یہ محسوس کیا گیا کہ متن کے ایسے بہت سے مقامات سے پڑھنے والے کی نظر سرسری طور پر گزر جاتی ہے، جہاں اُسے رُکنا چاہیے تھا اور یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اِس مقام پر کوئی بات بحث طلب ہے یا کسی طرح کی تشریح کی ضرورت ہے۔ اِس کا اہتمام ضرور کیا جانا چاہیے کہ وضاحت طلب مقامات پر پڑھنے والے کی نظر رُکے اور وہ اُس وضاحت کو دیکھ سکے جو ضمیموں میں پیش کی گئی ہے۔ اِس بنا پر اِس کتاب میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ متن کے ہر صفحے پر نمبر شمار ڈالے گئے ہیں۔

یہ نمبر دو۲ طرح کے ہیں۔ جو نمبر شمار گول دائرے کے اندر ہیں، تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مقام کسی نہ کسی لحاظ سے تشریح طلب ہے۔ اِس کے برخلاف جو نمبر معمول کے مطابق لکھے گئے ہیں [جیسے : ۲] تو یہ صرف اختلافِ نسخ کو ظاہر کرتے ہیں۔ جن لفظوں میں تلفّظ اور املا کے لحاظ سے کوئی بات تشریح طلب ہے، تو ایسے الفاظ پر پھول کا نشان بنا دیا گیا ہے، تاکہ پڑھنے والا پہلی ہی نظر میں سمجھ لے کہ اِس لفظ میں املا یا تلفّظ کے لحاظ سے کوئی بات بحث طلب ہے یا وضاحت طلب ہے۔

یہ ضرور واضح کر دیا جائے کہ علامات کے استعمال میں بہ قدرِ ضرورت کا خیال ضرور پیشِ نظر رہا ہے۔ مرتّب کی رائے میں جن مقامات پر اُن کو لانا ضروری تھا، اُنھی مقامات پر اُنھیں شاملِ عبارت کیا گیا ہے۔ مثلاً واوِ معدولہ کی علامت کو ہر جگہ نہیں لایا گیا، ایسے ہی مقامات پر اُسے لکھا گیا ہے جہاں کسی نہ کسی اعتبار سے اُس کی ضرورت محسوس کی گئی۔ مثلاً خوش، خود، خواجہ، خواہ مخواہ، خدانخواستہ، خواہش، اُستخواں، خواب، درخواست، خوار، خوان جیسے عام لفظوں میں اِس علامت کو شامل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ اِس کے برخلاف مثلاً "مے خوری" کے نیچے علامت لگائی گئی ہے۔ وجہ اِس کی یہ ہے کہ کے میں "مے خوری" اور "خوش خوری" کو توِ معِ واوِ معدولہ لکھا گیا ہے اور "غوطہ خور" کو معِ واوِ مجہول لکھا گیا ہے۔ اِسی لیے اِسے "غُوطہ خُور" لکھا گیا ہے اور اُن دونوں کو "مَے خوری" (ص ۶۲) اور "خوش خوری" (ص ۵۰) لکھا گیا ہے۔ اِسی طرح "خورجی"، "خوزادی"، "بھونڈ پیری"، "خورش" جیسے لفظوں کو بھی معِ علامت لکھا گیا ہے، اِس لیے کہ یہ نسبتاً کم معروف ہیں۔

"دو" سے مرکّب الفاظ بہ طورِ عموم کے میں معِ واوِ معدولہ ملتے ہیں، [زبانوں پر بھی اِسی طرح ہیں] جیسے : دو رستہ، دو پارہ، دوگانہ، دو رویہ، دو زانو، دو سار؛ ایسے لفظوں میں واوِ معدولہ کی علامت کو شاملِ لفظ کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا، البتہ ضمیمۂ تشریحات میں احتیاطاً ایسے الفاظ کے ذیل میں صراحت ضرور کر دی گئی ہے۔

آخر میں تین ۳ ضمیمے شامل کیے گئے ہیں۔ پہلے ضمیمے میں چار طرح کے بیانات شامل ہیں: ① اختلافِ نسخ۔ ② تشریح طلب مقامات کی وضاحت۔ ③ اشخاص، مقامات اور عمارتوں سے متعلق ضروری تفصیلات۔ ④ انتسابِ اشعار۔ اِس کتاب میں اشعار اِس قدر کم[1] ہیں کہ الگ سے ایک ضمیمے کا مسالا اکٹھا نہیں ہو پاتا، اِس لیے اُن کو بھی اِسی کے ذیل میں رکھا گیا ہے۔

دوسرا ضمیمہ تلفّظ اور املا کے مباحث سے متعلق ہے۔ باغ و بہار میں بہت سے لفظ تلفّظ یا املا کے لحاظ سے آج کے قاری کو بحث طلب معلوم ہوں گے۔ مثلاً میر امّن نے ہر جگہ "چھینا" لکھا ہے، جب کہ دِلّی والے اب "چھِینا" بولتے ہیں۔ یا میر امّن نے ہر جگہ "اعلا" اور "ادنا" لکھا ہے یا جیسے اُنھوں نے "تَعَب" لکھا ہے۔ [گنجِ خوبی میں اُنھوں نے ایسے کئی لفظوں کو متحرک الاوسط نظم کیا ہے۔ مثلاً "نَفَع" (نسخۂ مطبوعۂ دہلی یونی ورسٹی، ص ۲۶۳) "عطَر" (ص ۲۰۵) "سَہَل" (ص ۲۲۷)]۔ ایسی ہی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ ایسے تمام الفاظ کے تلفّظ یا املا کے سلسلے میں مفصّل یا ضرورت کے لحاظ سے مختصر بحث کی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اہم بحثوں کے تحت ضروری تفصیلات کو یک جا کر دیا جائے۔ کوئی شخص، خاص کر کوئی اُستاد اگر ایسے مباحث سے دل چسپی رکھتا ہے اور پوری ذمّے داری کے ساتھ اِس متن کو پڑھانا چاہتا ہے اور

---

[1] باغ و بہار میں شامل اشعار کی تفصیل یہ ہے: میر امّن کی عرضی میں دو ۲ شعر آئے ہیں [جن میں سے ایک شعر فردوسی کا ہے]۔ ۹ شعر حمد و نعت کے بیان میں آئے ہیں [یہ سب شعر خود میر امّن کے ہیں]۔ بارہ شعر کا ایک قطعہ کتاب کے آخر میں آیا ہے، خاتمۂ کتاب کے طور پر۔ [یہ بھی میر امّن کا ہے]۔ اِن کے علاوہ ۲۴ شعر اور ہیں، جن میں سے دو دو شعر تو پانچوں قصّوں کے آغاز میں تمہیدی بیان کے طور پر آئے۔ یہ کل دس شعر ہوئے [بہ ظاہر یہ بھی میر امّن کے کہے ہوئے ہیں]۔ اِس طرح اصل داستان میں کُل بارہ شعر آئے ہیں۔ ایک دوہا ہے (ص ۷۰ پر) ـــــ اشعار کے علاوہ متن میں تین ۳ کبت بھی شامل ہیں (ص ۸۱، ص ۹۲ اور ص ۱۳۷ پر)۔ اِن میں سے پہلے دو کبت ["نکھ بن کٹا دیکھے ...." اور "جب دانت نہ تھے ...."] نوطرزِ مرصّع میں بھی موجود ہیں۔ آخری کبت ["روٹھے کیوں نہ راجا ...."] میر امّن کا اضافہ ہے۔

اُس کے لیے پہلے خود اِن مسائل کو سمجھنا چاہتا ہے؛ تو اُس کے لیے ضروری مواد یک جا ہو جائے۔

ضمیمہ ۲ میں تلفظ یا املا کے سلسلے میں بھی ضمنی طور پر بعض اُمور زیرِ بحث آ گئے ہیں۔ اِس کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ ضمیمۂ تلفظ و املا میں [حروفِ تہجّی کے مطابق] اُس لفظ کو درج کر کے، اُس کے آگے ضمیمۂ تشریحات کے اُس صفحے کا اور حاشیے کا نمبر لکھ دیا گیا ہے جہاں وہ زیرِ بحث آیا ہے۔

تیسرا ضمیمہ افعال، الفاظ اور طریقۂ استعمال پر مشتمل ہے۔ میر امّن کی نثر میں طرح طرح کے مفرد اور مرکّب افعال ملتے ہیں، بہت سے جملوں کی بناوٹ بہ طورِ خاص توجّہ طلب ہے اور بہت سے لفظ بھی قابلِ توجّہ ہیں؛ کوشش کی گئی ہے کہ ایسی زیادہ سے زیادہ مثالوں کو یک جا کر دیا جائے۔ میر امّن کی زبان اور اُن کے اسلوب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اور اُس کی وسعت اور رنگا رنگی کا اندازہ کرنے کے لیے اِس ضمیمے کا مطالعہ افادیت سے خالی نظر نہیں آئے گا۔ ہاں یہ وضاحت کر دی جائے کہ اکثر ایک لفظ کے سامنے ایک ہی صفحے کا نمبر لکھا گیا ہے، لیکن لازمی طور پر اِس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لفظ بس اُسی ایک صفحے پر آیا ہے۔ البتہ بعض خاص الفاظ کے ذیل میں اِس طریقہ کار سے انحراف کیا گیا ہے، مثلاً "بندی خانہ" قید خانے کے معنی میں اب بالکل اجنبی لفظ ہے؛ اِس لفظ کے آگے اُن سب صفحات کا نمبر لکھ دیا گیا ہے جہاں یہ آیا ہے۔

مفصّل فرہنگ کو شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ لفظ کے وہی معنی لکھے گئے ہیں، جن معنوں میں وہ اُس مقام پر استعمال میں آیا ہے۔ خاص خاص الفاظ کے سامنے اُس صفحے کا نمبر بھی لکھ دیا گیا ہے جہاں وہ اُس معنی میں (پہلی بار) آیا ہے۔ ضروری مقامات پر معانی کے ذیل میں مآخذ کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے۔ اگر ایک لفظ ایک سے زیادہ معنی میں آیا ہے، تو اُس کی صراحت ضرور کر دی گئی ہے، مثلاً لفظِ "بکاول" کے ذیل میں لکھا گیا ہے: "بکاول

(ص ،،۔ ۱۵۵): اِس لفظ کے کئی معنی ہیں: باورچی —— باورچی خانے کا داروغہ؛ وہ شخص جو امرا و سلاطین کے سامنے کھانا چُنے [نور] ۔ص ۱۵۵ پر پہلے معنی میں آیا ہے اور ص ،، پر آخری معنی میں" یا جیسے: " بھوئی (ص ۸۸): حمّال [سامان اُٹھانے والا] ۔ص ۹۱: کہار [ڈولی اُٹھانے والے] "۔ یا جیسے "توقّف" ' یہ لفظ چار معنوں میں آیا ہے، اِس لیے اِسے معنوں کے لحاظ سے الگ الگ لکھا گیا ہے: ① " توقّف کا مکان نہیں (۱۴۹): یہ ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔ ② توقّف کرو (۱۵۳): رُک جاؤ، ٹھہر جاؤ [ابھی سزا نہ دو] ۔ ③ توقّف کیجیے (۷۹): انتظار کیجیے، ٹھہریے۔ ④ توقّف ہوگا (۲۴۴): اگر دیر ہوگی، تاخیر ہوگی " ماخذ کے سلسلے میں " نور " سے مراد نوراللّغات ہے، " اصطلاحات " سے فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں اور آصفیہ سے فرہنگِ آصفیہ مراد ہے۔

آخر میں اشاریہ ہے اور یہ صرف متنِ کتاب کے مندرجات پر مشتمل ہے —— یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مقدّمے کے صفحات پر نمبر شمار الگ سے ڈالے گئے ہیں اور اصل متن نئے نمبر شمار سے شروع ہوتا ہے۔

اِس کتاب میں آٹھ صفحوں کا عکس بھی شامل کیا گیا ہے، جن میں سے پانچ صفحے تو باغ و بہار طبعِ اوّل سے تعلّق رکھتے ہیں، اِس تفصیل کے ساتھ: طبعِ اوّل کے سرورق کے پہلے صفحے کا عکس۔ اِسے مقدّمۂ مرتّب کے بعد اور اصل متن کے شروع ہونے سے پہلے ص ۱ کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک صفحہ تو طبعِ اوّل میں شامل میر امّن کی عرضی کا عکس ہے۔ اِس کا مقصد یہ ہے کہ اُس اشاعت کی طباعت کا ایک مکمّل نمونہ سامنے آجائے۔ طبعِ اوّل سے متعلّق باقی تین صفحوں میں سے ایک صفحہ تو وہ ہے جس میں گل کرسٹ کا پیش لفظ ہے۔ ایک صفحہ وہ ہے جو انتساب سے تعلّق رکھتا ہے اور ایک صفحہ طبعِ اوّل کا آخری صفحہ ہے۔ یہ تینوں صفحے انگریزی میں ہیں۔ اِن کے علاوہ دو صفحے ہندی مینول سے متعلّق ہیں: ایک تو سرورق کے پہلے صفحے کا عکس ہے اور دوسرا اُس کتاب کا آخری صفحہ ہے۔ اِن

دونوں صفحات سے ہندی مینول کے مندرجات اور سنہ طباعت کی تفصیلات سامنے آجاتی ہیں۔ آخر میں مخطوطۂ گنجِ خوبی بہ خطِ میر امّن کے ایک صفحے کا عکس ہے۔

اِس سلسلے کی پہلی کتاب فسانۂ عجائب تھی۔ جس طرح اُسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور اہلِ نظر نے اُس کی خوبیوں کا اعتراف کیا، اُس سے کام کرنے کا حوصلہ بڑھا۔ توقع کرتا ہوں کہ یہ کتاب بھی، جو اُسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے، قبولِ عام کے شرف سے محروم نہیں رہے گی اور طالب علموں، خاص کر اساتذہ کے لیے کارآمد اور مفید ثابت ہوگی۔ اِس سلسلے کی چار کتابیں اور میری نظر میں ہیں: نوطرزِ مرصّع، مثنوی سحر البیان، مثنوی گلزارِ نسیم اور قصائدِ سودا کا مجموعہ؛ اگر صحت نے ساتھ دیا اور حالات نے موافقت کی، تو یہ کتابیں بھی اِسی انداز پر مرتّب ہو سکیں گی اور اہم کلاسکی متنوں کے پڑھنے اور پڑھانے میں وہ ضروری آسانیاں فراہم کر سکیں گی جن کی آج بہت ضرورت ہے۔

اِس کتاب کے سلسلے میں متعدد حضرات نے مختلف اعتبارات سے مدد کی ہے۔ اِس ضمن میں سب سے پہلا نام ڈاکٹر صدیق الرّحمان قدوائی کا ہے، جنھوں نے ہندی مینول کو تلاش کیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالستّار دلوی کی وساطت سے جناب قاسم دلوی سے نیاز حاصل ہوا اور موصوف نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ ہندی مینول کا عکس بھیجا، جس کے بغیر یہ کام مکمّل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر مختار الدّین آرزو سے ہندی مینول میں شامل باغ و بہار کے صفحات کا مجموعہ ملا تھا۔ مالک رام صاحب نے انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں محفوظ باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل کے آخری تین صفحات کا عکس منگوا کر دیا۔ اِن میں سے آخری دو صفحے میرے پیشِ نظر نسخے میں موجود نہیں تھے۔ [اِن دونوں صفحوں کا عکس اِس کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے]۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدّیقی (اُستادِ شعبۂ اُردو، بنارس ہندو یونی ورسٹی) نے میری درخواست پر عربی کے ایک مشہور قول کے سلسلے میں عربی کی متعدد ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کی (اُن کے مکتوب کی عبارت ص ۳۹۲ پر مندرج ہے)۔ ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی اور جناب شمس الرّحمان فاروقی سے بعض مسائل کے سلسلے میں مشورہ کیا گیا۔ جناب رئیس نعمانی اور ایم حبیب خاں صاحب

نے میری خاطر دو دفعہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں بعض نسخوں کو تلاش کیا۔ اکبر علی خاں نے گل کرسٹ کے رسالۂ رسمِ خط کا عکس فراہم کیا، جو میر شیر علی افسوس کی کتاب باغِ اردو کی اشاعتِ اوّل میں شامل تھا۔ اِس کتاب کی یہ اشاعت میری دسترس سے باہر تھی۔ اِس سے متعلق حفیظ الدّین کی ایک عبارت کی نقل بھی فراہم کی۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر نے بمبئی یونی ورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ڈنکن فاربس کی مرتبہ باغ و بہار کے دوسرے اور تیسرے اڈیشن اور اُس کے انگریزی ترجمے سے متعلق تفصیلات بھیجیں۔ اِن سب حضرات کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

آخر میں ڈاکٹر خلیق انجم کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اِس زمانے میں حالات کے دباؤ کی وجہ سے اِس قدر ضخیم کتاب کو چھاپنا دوسرے ناشرین کے لیے مشکل ہوتا۔ خلیق صاحب نے بہت خوش دلی کے ساتھ اور بہت دل چسپی کے ساتھ اِس کی کتابت اور طباعت کے مراحل کو طے میں معاونت کی اور اِس سے پہلے اِس کام کو جلد تر مکمّل کرنے کے لیے برابر اصرار کرتے رہے۔ اور ہاں، ایک ضروری بات تو رہی جا رہی ہے۔ سیّد ابو جعفر زیدی صاحب نے جس احتیاط اور اہتمام کے ساتھ اِس متن کی کتابت کی ہے اور التزامات کی پابندی کی ہے، یہ بہت مشکل کام تھا۔ اُن کا شکریہ خاص طور پر ادا کرتا ہوں۔

رشید حسن خاں

گائر ہال، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

۲۸ جولائی ۱۹۹۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باغ و بہار

واسطے زُبدۂ نوئینانِ عالیشان مُشیرِ خاص شاہِ کیواں بارگاہِ انگلستان مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام افضالہٗ کے جو حامی و حافظ مدرسے کے ہیں

ماخذ اُسکا نوطرزِ مُرصع وُہ ترجمہ کیا ہوا عطا حُسین خاں کا ہی فارسی قصۂ چار درویش سے

جانِ گلکرسٹ صاحب دام ثروتہٗ کی فرمایش سے

تالیف کیا ہوا میر امنؔ دلّی والیکا

رشتۂ نشو و نما ہوں میں الفاظ کو جس پانی سے
وُہ رود ہی آبِ گہر سا معنے اُسکے وُہ زُلال
خامہ کہتا ہی میرا ہی جو فصاحت ایک چیز
سو زبانکی ہی میری خامۂ بے زر و مال
ختم اب کرتا ہی سوزؔ دا بدُعا ای خامہ
دوست ہوں شاد تیرے اوُر ہوں دشمن پامال

ہندوستانی چھاپاخانہ
سنہ ۱۸۰۳ عیسوی مُطابق سنہ ۱۲۱۸ ہجری کے

باغ و بہار طبعِ اوّل کے سرورق کا پہلا صفحہ

نقل عرضی کی، جو مدرسے کے مختار کار صاحبوں کے حضور میں دی گئی:

صاحبانِ والاشان، نجیبوں کے قدردانوں کو خدا سلامت رکھے۔

اِس بے وطن نے حکمِ اِشتہار کا سُن کر، چار درویش کے قصّے کو، ہزار جدّ و کدّ سے اُردوئے معلّا کی زبان میں باغ و بہار بنایا۔ فضلِ اِلٰہی سے سب صاحبوں کے سیر کرنے کے باعث سرسبز ہوا۔ اب اُمّید وار ہوں کہ اِس کا پھل مجھے بھی ملے، تو میرا غنچۂ دل مانندِ گُل کے کِھلے۔ بہ قولِ حکیم فردوسی کے، کہ شاہ نامے میں کہا ہے:

بسے رنج بُردم دریں سال سی عجم زندہ کردم بہ ایں پارسی

سو اُردو کی آراستہ کر زباں کیا میں نے بنگالا، ہندوستاں

خاوند! آپ قدردان ہیں، حاجت عرض کرنے کی نہیں۔

اِلٰہی! تارا اِقبال کا چمکتا رہے۔

عرضی میر امّن دِلّی والے کی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُبحان اللہ! کیا صانع ہے کہ جس نے ایک مُٹھی خاک سے، کیا کیا صورتیں[١] اور مِٹّی کی مورتیں پیدا کیں۔ باوجود دُو رنگ کے ایک گورا، ایک کالا؛ اور یہی ناک کان، ہاتھ پانو سب کو دِیے ہیں؛ تِس پر رنگ بہ رنگ کی شکلیں جُدی جُدی بنائیں، کہ ایک کی سَج دَھج سے دوسرے[٢] کا ڈیل ڈول مِلتا نہیں۔ کروڑوں خِلقت میں جس کو چاہیے، پہچان لیجے[٣]۔ آسمان اُس کے دریائے وَحدت کا ایک بُلبُلا ہے اور زمین پانی کا بتاشا؛ لیکن یہ تماشا ہے کہ سَمندر ہزاروں لہریں مارتا ہے، پر اُس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ جس کی یہ قُدرت اور سَکت ہو، اُس کی حمد و ثنا میں زُبان اِنسان کی گُویا گونگی ہے؛ کہے تو کیا کہے! بہتر یوں ہے کہ جس[٤] بات میں دَم نہ مار سکے، چُپکا ہو رہے۔

عرش سے لے فرش تک جس کا کہ یہ سامان ہے
حمد اُس کی گر لکھا چاہوں، تو کیا اِمکان ہے
جب پیمبر نے کہا ہو: "میں نے پہچانا نہیں[٥]"
پھر جو کوئی دعویٰ کرے اِس کا، بڑا نادان ہے
رات دن یہ مِہر و مَہ پھرتے ہیں صنعت دیکھتے
پر ہر اک[٦]، واحد[٧] کی صورت، دیدۂ حیران ہے

جس[۱] کا ثانی اور مقابل ہے نہ ہووے گا کبھو
ایسے[۲] یکتا کو خدائی سب طرح شایان ہے
لیکن[۳] اتنا جانتا ہوں خالق و رازق ہے وہ
ہر طرح سے مجھ پر اُس کا لطف اور احسان ہے (۴)

اور درود اُس کے دوست پر، جس کی خاطر زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور درجہ رسالت کا دیا[۵]۔

جسمِ پاکِ مصطفیٰ اللہ کا اک[۶] نور ہے
اِس[۷] لیے پرچھائیں اُس قد کی نہ تھی، مشہور ہے
حوصلہ میرا کہاں اِتنا، جو نعت اُس کی کہوں
پر سخن گویوں کا یہ بھی قاعدہ، دستور ہے (۸)

اور اُس کی آل پر صلوٰۃ و سلام، جو ہیں بارہ اِمام[۹]۔

حمد[۱۰] حق اور نعتِ احمد[۱۱] کو یہاں کر اِنصرام
اب میں آغاز اُس کو کرتا ہوں، جو ہے منظور کام
یا الٰہی! واسطے اپنے نبی[۱۲] کی آل کے
کر یہ میری گفتگو مقبولِ طبعِ خاص[۱۳] و عام (۱۴)

منشا اِس تالیف[۱۵] کا یہ ہے کہ سنہ ایک ہزار دو سو پندرہ برس ہجری، اور اٹھارہ سے ایک سال عیسوی[۱۶]، مطابق ایک ہزار دو سو سات سنہ فصلی کے؛ عہد میں اشرف الاشراف مارکوئس[۱۷] ولزلی گورنر جنرل لارڈ مارننگٹن[۱۸] صاحب کے [جن کی تعریف میں عقل حیران[۱۹] اور فہم سرگردان ہے۔ جتنے وصف سرداروں کو چاہییں[۲۰]،

اُن کی ذات میں خُدا نے جمع کیے ہیں۔ غرض قسمت کی خوبی اِس مُلک کی تھی جو ایسا حاکم تشریف لایا، جس کے قدم کے فیض سے ایک عالَم نے آرام پایا۔ مَجال نہیں کہ کوئی کِسُو پر زبردستی کر سکے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ سارے غریب غُربا دُعا دیتے ہیں اور جیتے ہیں] چرچا عِلم کا پھیلا۔ صاحبانِ ذی شان کو شوق ہوا کہ اُردُو کی زُبان سے واقف ہو کر، ہندُوستانیوں[1] سے گفت و شنود کریں اور مُلکی کام کو بہ آگاہیِ تمام انجام دیں؛ اِس واسطے کتنی کتابیں اِسی سال بہ موجِب فرمایش کے تالیف ہوئیں۔(۲)

جو صاحب[۳] دانا اور ہندُوستان کی زُبان[۴] بولنے والے ہیں، اُن کی خدمت میں گُزارِش کرتا ہوں کہ یہ قصّہ چار دَروِیش کا اِبتِدا میں امیر خُسرو دِہلوی نے اِس تقریب سے کہا کہ حضرت نِظامُ الدّین اَولیا(۵) زری زر بَخش؛ جو اُن کے پِیر تھے، اور درگاہ اُن کی دِلّی(۶) میں قلعے سے تین کوس، لال دروازے(۷) کے باہر، مَٹیا دروازے(۸) سے آگے، لال بنگلے(۹) کے پاس ہے؛ اُن کی طبیعت ماندی ہوئی؛ تب[۱۰] مُرشِد کے دل بہلانے کے واسطے امیر خُسرو(۱۱) یہ قصّہ ہمیشہ کہتے اور بیمارداری[۱۲] میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند رُوز میں شِفا دی، تب اُنھوں نے غُسلِ صِحّت کے دِن یہ دُعا دی کہ: جو کوئی اِس قصّے کو سُنے گا، خُدا کے فَضل سے تندرُست رہے گا۔ جب سے یہ قصّہ فارسی میں مُرَوَّج[۱۳] ہوا۔

اب خُداوندِ نِعمت، صاحبِ مُرَوَّت، نَجیبوں[۱۴] کے قدردان(۱۵) جان گِل کِرِسٹ(۱۶) صاحِب نے (کہ ہمیشہ اِقبال اُن کا زیادہ رہے، جب تلک گنگا جمنا بہے[۱۷]) لُطف سے(۱۸) فرمایا کہ اِس قصّے کو ٹھیٹھ ہندُوستانی[۱۹] گُفتگو میں، جو اُردُو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد،

لڑکے بالے، خاصؔ وعام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجُمہ کرو۔ مُوافق حُکمِ حُضور کے میں نے بھی اُسی مُحاورے(۳) سے لکھنا شُروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔

پہلے اپنا اَحوال یہ عاصی، گُنہ گار میر اَمَّن دِلّی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بُزُرگ ہُمایوں بادشاہ کے عہد سے، ہر ایک بادشاہ کی رِکاب میں، پُشت بہ پُشت جاں فِشانی بجالاتے رہے۔ اور وُہ بھی پَرورِش کی نظر سے، قدر دانی جتنی چاہیے، فرماتے رہے۔ جاگیر و مَنصَب اور خِدمات کی عنایات سے سَرفَراز کرکر مالامال اور نِہال کر دیا اور "خانہ زادِ مَوروثی"(۶) اور "مَنصَب دارِ قَدِیمی" زُبانِ مُبارک سے فرمایا؛ چُناں چہ یہ لَقَب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔

جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اُس گھر کے سبب آباد تھے) یہ نَوبت پہنچی کہ ظاہر ہے، عَیاں را چِہ بیاں؛(۸) تب سُورج مَل جاٹ نے جاگیر کو ضَبط کرلیا، اور(۹) احمد شاہ دُرّانی(۱۰) نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر، ویسے شہر سے (کہ وَطَن اور جَنَم بھُوم میرا ہے اور آنوَل نال وَہیں گڑا ہے) جَلا وَطَن(۱۱) ہوا، اور ایسا جہاز (کہ جس کا ناخُدا بادشاہ تھا) غارت ہوا؛ مَیں بےکَسی کے سَمَندر میں غُوطے کھانے لگا۔ ڈُوبتے کو تِنکے کا آسرا بہت ہے؛ کتنے بَرس بُلدَۂ(۱۲) عظیم آباد میں دَم لیا۔(۱۳) کچھ بنی، کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پانْو اُکھڑے، رُوزگار نے مُوافقَت نہ کی۔ عَیال واَطفال کو چھوڑ کر، تَنِ تنہا کَشتی پر سوار ہو، اَشرَفُ البِلاد کلکتے میں آب و دانے کے زُور سے آ پہنچا۔ چَندے بےکاری گُزری۔ اِتّفاقاً نوّاب دِلاوَر جنگ نے بُلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمّد کاظم خاں کی اَتالیقی کے

واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا، لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا؛ تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر دامَ اِقبالُہٗ کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں۔ نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر، پانو پھیلا کر سو رہتا ہوں؛ اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دعا اُس قدردان کو کرتے ہیں، خدا قبول کرے۔

حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلّی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے۔ انھیں کے راجا پرجا قدیم سے رہتے تھے اور اپنی بھاکھا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اِس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ اُن کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اِس واسطے شہر کا بازار "اردو" کہلایا۔ پھر ہمایوں بادشاہ، پٹھانوں کے ہاتھ سے حیران ہو کر ولایت گئے۔ آخر وہاں سے آن کر پس ماندوں کو گوشمالی دی، کوئی مفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ و فساد برپا کرے۔

جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم، قدردانی اور فیض رسانی اِس خاندانِ لاثانی کی سن کر، حضور میں آ کر جمع

ہوئے[۱]؛ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی۔ اِکٹھّے* ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سُلف*، سوال جواب کرتے ایک زبان اُردو[۲] کی مُقرّر ہوئی۔

جب حضرت شاہِ جہاں صاحبِ قِران[۳] نے قلعۂ مُبارک[۴] اور جامع مسجد[۵] اور شہر پناہ[۶] تعمیر کروایا[۷]، اور تختِ طاؤس[۸] میں جواہِر[۹] جڑوایا، اور دَل بادَل[۱۰] سا خیمہ چوبوں پر اِستادکر طنابوں سے کھِنچوایا[۱۱]، اور نوّاب[۱۲] علی مَردان خاں نہر[۱۳] کو لے کر آیا؛ تب بادشاہ نے خوش ہو کر جَشن[۱۴] فرمایا اور شہر کو اپنا دارُ الخِلافت[۱۵] بنایا؛ تب سے شاہ جہان آباد مشہور ہوا (اگرچہ دِلّی جُدی ہے۔ وُہ[۱۶] "پُرانا شہر[۱۷]" اور یہ "نیا شہر" کہلاتا ہے) اور[۱۸] وہاں کے بازار کو "اُردوئے* مُعلّا[۱۹]" خطاب دیا۔

امیر تیمور[۲۲] کے عہد سے محمّد شاہ کی[۲۰] بادشاہت، بلکہ احمد شاہ[۲۱] اور عالم گیرِ ثانی کے وقت تک[۲۳]، پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی؛ نِدان[۲۴] زبان اُردو کی منجھتے منجھتے ایسی منجی کہ کسو شہر کی بولی اُس سے ٹکّر نہیں کھاتی؛ لیکن قدر دانِ[۲۵] مُنصِف چاہیے، جو[۲۶] تجویز کرے۔ سو اَب[۲۷] خُدا نے بعد مُدّت کے جان گِل کرِسٹ صاحِب سادانا، نکتہ رس پیدا کیا کہ جنھوں نے اپنے گیان* اور اَکت[۲۸] سے اور تلاش و محنت سے قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں؛ اِس سبب سے ہندوستان[۲۹] کی زبان کا مُلکوں میں رِواج ہوا اور نئے* سِر[۳۰] سے رونق زیادہ ہوئی۔ نہیں تو اپنی دَستار و گُفتار و رَفتار کو کوئی بُرا نہیں جانتا۔ اگر ایک گنوار سے پوچھیے تو شہر[۳۱] والے کو نام رکھتا ہے اور اپنے تئیں* سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر، عاقلاں خود می دانند۔

جب احمد شاہ اَبدالی[۳۲] کابُل[۳۳] سے آیا اور شہر کو لُٹوایا؛ شاہِ عالم پورب کی

طرف تھے، کوئی وارث اور مالک مُلک کا نہ رہا، شہر بے سر[1] ہوگیا۔ سچ ہے: بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی، ایک بارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے، مَیں کہیں تم کہیں ہوکر؛ جہاں[2] جس کے سینگ سمائے، وہاں نکل گئے۔ جس مُلک میں پہنچے، وہاں کے آدمیوں کی[3] ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا۔ اور بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسوٗ سبب سے دِلّی میں گئے اور رہے؛ وہ[4] بھی کہاں تلک بول سکیں گے، کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے۔ اور جو شخص سب آفتیں سہہ کر، دِلّی کا روڑا ہوکر رہا[5]، اور دس پانچ پشتیں[6] اُسی شہر میں گزریں، اور اُس نے دربار اُمراؤں[*] کے اور میلے ٹھیلے، عُرس، چھڑیاں، سَیر تماشا اور کوچہ گردی اُس شہر کی مُدّت تلک کی ہوگی، اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا؛ اُس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔ یہ عاجز بھی[7] ہر ایک شہر کی سَیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تلک پہنچا ہے۔

شروع قصّے کا

اب آغاز قصّے کا کرتا ہوں، ذرا کان دھر کر سُنو اور مُنصِفی کرو۔ سیر میں چار دَرویش کی یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے کہا ہے کہ آگے رُوم کے مُلک میں کوئی شَہنشاہ تھا کہ نَوشیرواں کی سی عَدالت اور حاتِم کی سی سخاوت اُس کی ذات میں تھی۔ نام اُس کا آزاد بخت اور شہر قُسطَنطُنیہ (جس کو اِستَنبُول کہتے ہیں) اُس کا پایۂ تخت تھا۔ اُس کے وقت میں رَعیّت آباد، خزانہ مَعمُور، لشکر مُرَفّہ، غریب غُربا آسودہ؛ ایسے چَین سے گُزران کرتے اور خوشی سے رہتے کہ ہر ایک کے گھر میں دن عید اور رات شبِ بَرات تھی۔ اور جتنے چُور چکار، جیب کترے، صُبح خیزیے، اُٹھائی گیرے، دَغا باز تھے؛ سب کو نیست و نابُود کر کر، نام و نِشان اُن کا اپنے مُلک بھر میں نہ رکھا تھا۔ ساری رات دروازے گھروں کے بند نہ ہوتے اور دُکانیں بازار کی کُھلی رہتیں۔ راہی، مُسافر جنگل، میدان میں سونا اُچھالتے چلے جاتے؛ کوئی نہ پوچھتا کہ تمھارے مُنہ میں کَے دانت ہیں اور کہاں جاتے ہو؟

اُس بادشاہ کے عَمَل میں ہزاروں شہر تھے اور کئی سلطان نَعل بندی دیتے۔ ایسی بڑی سلطنت پر ایک ساعت اپنے دل کو خُدا کی یاد اور بندگی سے غافل نہ کرتا۔ آرام دُنیا کا، جو چاہیے، سب موجود تھا؛ لیکن فرزند (کہ زِندگانی کا پھل ہے) اُس کی قِسمت کے باغ میں نہ تھا۔ اِس خاطر اکثر فِکرمند رہتا اور پانچوں وقت کی نماز کے بعد اپنے کریم سے کہتا کہ اَے اَللہ! مجھ عاجز کو تو نے اپنی عنایت سے سب کچھ دیا، لیکن ایک اِس اَندھیرے گھر کا دِیا نہ دیا۔ یہی اَرمان جی میں باقی ہے کہ میرا

نام لیوا اور پانی دیوا کوئی نہیں۔ اور تیرے خزانۂ غیب میں سب کچھ موجود ہے؛ ایک بیٹا جیتا جاگتا مجھے دے، تو میرا نام اور اِس سلطنت کا نشان قائم رہے۔

اِسی اُمید میں بادشاہ کی عمر چالیس برس کی ہوگئی۔ ایک دن شیش محل میں نماز ادا کر کر وظیفہ پڑھ رہے تھے؛ ایک بارگی آئینے کی طرف خیال جو کرتے ہیں، تو ایک سفید بال موچھوں میں نظر آیا کہ مانند تارِ مقیش کے چمک رہا ہے۔ بادشاہ دیکھ کر آب دیدہ ہوئے اور ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر دل میں اپنے سوچ کیا کہ افسوس! تو نے اِتنی عمر ناحق برباد دی اور اِس دُنیا کی حرص میں ایک عالَم کو زیر و زبر کیا۔ اِتنا مُلک جو لیا، اب تیرے کس کام آوے گا! آخر یہ سارا مال اسباب کوئی دوسرا اُڑا دے گا۔ تجھے تو پیغام موت کا آچکا۔ اگر کوئی دِن جیے بھی، تو بدن کی طاقت کم ہوگی؛ اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میری تقدیر میں نہیں لکھا کہ وارث چھتر اور تخت کا پیدا ہو۔ آخر ایک روز مرنا ہے اور سب کچھ چھوڑ جانا ہے؛ اِس سے یہی بہتر ہے کہ میں ہی اِسے چھوڑ دوں اور باقی زندگی اپنے خالق کی یاد میں کاٹوں۔

یہ بات اپنے دل میں ٹھہرا کر، پائیں باغ میں جا کر، سب مجرائیوں کو جواب دے کر فرمایا کہ کوئی آج سے میرے پاس نہ آوے، سب دیوانِ عام میں آیا جایا کریں اور اپنے کام میں مستعد رہیں۔ یہ کہہ کر آپ ایک مکان میں جا بیٹھے اور مُصلّا بچھا کر عبادت میں مشغول ہوئے۔ سوائے رونے اور آہ بھرنے کے کچھ کام نہ تھا۔ اِسی طرح بادشاہ آزاد بخت کو کئی دِن گزرے۔ شام کو روزہ کھولنے کے وقت ایک چھوہارا کھاتے اور تین گھونٹ پانی

پیتے[1] اور تمام دن رات جانماز[2] پر پڑے[3] رہتے۔

اِس بات کا باہر چرچا پھیلا۔ رَفتہ رَفتہ تمام مُلک میں خبر گئی کہ بادشاہ نے بادشاہت سے ہاتھ کھینچ کر* گوشہ نشینی[4] اختیار کی۔ چاروں طرف غنیموں اور مُفسِدوں نے سر اُٹھایا* اور قدم اپنی حد[5] سے بڑھایا۔ جس نے چاہا، مُلک دبا لیا اور سر انجام سرکشی کا کیا۔ جہاں کہیں حاکم تھے، اُن کے حُکم میں خلَلِ عظیم واقع ہوا۔* ہر ایک صوبے سے عَرضی بدعَملی* کی حُضور میں پہنچی۔ درباری، اُمَرا جتنے تھے، جمع* ہوئے اور صلاح مَصلَحت کرنے لگے۔ آخر یہ تجویز ٹھہری کہ نوّاب وزیر عاقِل اور دانا ہے اور بادشاہ کا مُقرّب اور مُعتمَد ہے اور درجے میں بھی سب سے بڑا ہے؛ اُس کی خدمت میں چلیں، دیکھیں وہ کیا مُناسِب جان کر کہتا ہے۔

سب عُمدہ[6]، اَمیر، وزیر کے پاس آئے اور کہا: بادشاہ کی یہ صورت اور مُلک کی وہ حقیقت؛ اگر چندے اور تغافُل ہُوا، تو اِس محنت کا مُلک لیا ہُوا مُفت میں جاتا رہے گا، پھر ہاتھ آنا بہت مشکل ہے۔ وزیر پُرانا، قدیم، نمک حلال اور عقل[7] مند، نام بھی خرد مَند، اِسم بامُسمّیٰ تھا؛ بولا: اگرچہ بادشاہ نے حُضور میں آنے کو منع[8]* کیا ہے؛ لیکن تم چلو، مَیں بھی چلتا ہوں؛ خُدا کرے بادشاہ کی مرضی آوے جو رُو بہ رُو بُلاوے۔ یہ کہ کر سب کو اپنے ساتھ دیوانِ عام تلک لایا۔ اُن کو وہاں چھوڑ کر آپ دیوانِ خاص[9] میں آیا اور بادشاہ کی خدمت میں مَحَلّی* کے ہاتھ کہلا بھیجا[10] کہ یہ پیر غلام[11] حاضر ہے، کئی دِنوں سے جمالِ جہاں آرا نہیں دیکھا؛ اُمّید وار ہوں کہ ایک نظر دیکھ کر قدم بوسی کروں تو خاطر جمع ہو۔

یہ عرض وزیر کی بادشاہ نے سُنی؛ اَز بَس کہ قدامت* اور خیرخواہی اور تدبیر اور جاں نثاری اُس کی جانتے تھے اور اکثر اُس کی بات مانتے تھے، بعد تأمّل کے فرمایا: خرد مند کو بُلالو۔ بارے جب پروانگی ہوئی، وزیر حضور میں آیا، آداب بجا لایا اور دست بستہ کھڑا رہا۔ دیکھا تو بادشاہ کی عجب صورت بن رہی ہے کہ زار بہ زار رونے اور دُبلاپے سے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں اور چہرہ زرد ہو گیا ہے۔ خرد مند کو تاب نہ رہی، بے اختیار دوڑ کر قدموں پر جا گرا۔ بادشاہ نے ہاتھ سے سر اُس کا اُٹھایا اور فرمایا: تُو مجھے دیکھا، خاطر جمع ہوئی! اب جاؤ، زیادہ مجھے نہ ستاؤ، تم سلطنت کرو۔

خرد مند سن کر، ڈاڑھ مار کر رویا اور عرض کی: غلام کو آپ کے تصدّق اور سلامتی سے ہمیشہ بادشاہت میسّر ہے؛ لیکن جہاں پناہ کی یک بہ یک اِس طرح کی گوشہ گیری سے تمام مُلک میں تہلکہ* پڑ گیا ہے، اور انجام اِس کا اچھا نہیں۔ یہ کیا خیال مزاجِ مُبارک میں آیا! اگر اِس خانہ زادِ موروثی کو بھی محرم اِس راز کا کیجے، تو بہتر ہے؛ جو کچھ عقلِ ناقص میں آوے، اِلتماس کرے۔ غلاموں کو جو یہ سرفرازیاں بخشی ہیں، اِسی دن کے واسطے کہ بادشاہ عیش و آرام کریں اور نمک پروردے تدبیریں مُلک کی رہیں۔ خدانخواستہ جب فکر مزاجِ عالی کے لاحق ہوئی، تو بندہ ہائے بادشاہی کس دن کام آویں گے!

بادشاہ نے کہا: سچ کہتا ہے؛ پر جو فکر میرے جی کے اندر ہے، سو تدبیر سے باہر ہے۔ سُن اے خرد مند! میری ساری عُمر اِسی مُلک گیری کے دردِ سر میں کٹی، اب یہ سِن⑥ و سال ہوا، آگے موت باقی ہے؛ سو اُس کا بھی پیغام آیا کہ

سیاہ بال سُفید ہو چلے۔ وہ مَثَل ہے : ساری رات سوئے، اب صُبح کو بھی نہ جاگیں!
اب تلک ایک بیٹا پیدا نہ ہوا، جو میری خاطر جمع ہوتی؛ اِس لیے دل سخت اُداس ہوا اور مَیں سب کچھ چھوڑ بیٹھا۔ جس کا جی چاہے، مُلک لے یا مال لے، مجھے کچھ کام نہیں؛ بلکہ کوئی دِن میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ سب چھوڑ چھاڑ کر، جنگل اور پہاڑوں میں نکل جاؤں اور مُنہ اپنا کسُو کو نہ دِکھاؤں، اِسی طَرح یہ چند رُوز کی زِندگی بَسر کروں۔ اگر کوئی مکان خوش آیا، تو وہاں بیٹھ کر بندگی اپنے معبُود کی بجا لاؤں گا، شاید عاقبت بہ خیر ہو۔ اور دُنیا کو تو خوب دیکھا، کچھ مزہ نہ پایا۔ اِتنی بات بول کر اور ایک آہ بھر کر بادشاہ چُپ ہوئے۔

خردمند اُن کے باپ کا وزیر تھا۔ جب سے شہ زادے تھے، تب سے مَحبّت رکھتا تھا؛ علاوہ، دانا اور نیک اَندیش تھا؛ کہنے لگا: خُدا کی جناب سے نااُمید ہونا ہرگز مُناسب نہیں۔ جس نے ہیژدَہ ہزار عالَم کو ایک حُکم میں پیدا کیا، تمھیں اَولاد دینی اُس کے نزدیک کیا بڑی بات ہے۔ قِبلۂ عالم! اِس تصوّرِ باطِل کو دل سے دور کرو، نہیں تو تمام عالَم دَرہَم بَرہَم ہو جائے گا۔ اور یہ سلطنت کس کس محنت اور مَشقّت سے تمھارے بُزرگوں نے اور تم نے پیدا کی ہے، ایک ذرا میں ہاتھ سے نکل جائے گی اور بے خَبَری سے مُلک ویران ہو جائے گا؛ خُدانخواستہ بدنامی حاصِل ہوگی۔ اِس پر بھی بازپُرس رُوزِ قیامت کی ہُوا چاہیے کہ تجھے بادشاہ بنا کر، اپنے بندوں کو تیرے حوالے کیا تھا؛ تو ہماری رحمت سے مایوس ہوا اور رَعیّت کو حَیران پرِیشان کیا؛ اِس سوال کا کیا جواب دُوگے؟ پَس عِبادت بھی اُس رُوز کام نہ آوِے گی؛ اِس واسطے کہ

آدمی کا دل خُدا کا گھر ہے؛ اور بادشاہ فقط عدل کے واسطے پوچھے جائیں گے۔
غُلام کی بے اَدَبی مُعاف ہو؛ گھر سے نکل جانا اور جنگل جنگل پھرنا، کام جوگیوں اور فقیروں کا ہے، نہ کہ بادشاہوں کا؛ تم اپنے جوگا کام کرو۔ خُدا کی یاد اور بندگی جنگل، پہاڑ پر موقوف نہیں۔ آپ نے یہ بَیت سُنی ہوگی (۳):

خُدا اِس پاس، یہ ڈھونڈھے جنگل میں
ڈھنڈھورا شہر میں، لڑکا بغل میں

اگر مُنصِفی فرمائیے اور اِس فِدوی کی عَرض قبول کیجے، تو بہتر یوں ہے کہ جہاں پناہ ہر دَم اور ہر ساعَت دھیان اپنا خُدا کی طَرف لگا کر دُعا مانگا کریں۔ اُس کی درگاہ سے کوئی محروم نہیں رہا۔ دِن کو بندوبَست مُلک کا اور اِنصاف، عَدالت غریب غُربا کی فرماویں؛ تو بندے خُدا کے دامَنِ دَولت کے سایے میں اَمن و اَمان، خوش گزران رہیں۔ اور رات کو عبادت کیجیے اور دُرُود پیغمبر کی روحِ پاک کو نیاز کرکر، دَرویشِ گوشہ نشین (۹)، مُتوکّلوں سے مدد لیجیے۔ اور روز راتِب یتیم، اَسیر، عیال داروں، محتاجوں اور رانڈ بیواؤں کو کر دیجیے۔ ایسے اچھے کاموں اور نیک نیتوں کی برکت سے، خُدا چاہے تو اُمّیدِ قوی (۱۱) ہے کہ تمھارے دل کے مقصد اور مطلب سب پورے ہوں اور جس واسطے مزاجِ عالی مُکدّر ہو رہا ہے، وہ آرزو بَر آوے اور خوشی خاطرِ شریف کو ہو جاوے۔ پَروَردگار کی عِنایَت پر نظر رکھیے کہ وہ ایک دَم میں جو چاہتا ہے، سو کرتا ہے۔ بارے خردمند وزیر کی (۱۳) ایسی ایسی عَرض معروض کرنے سے آزاد بخت کے دل کو ڈھارس بندھی، فرمایا: اچھا! تو جو کہتا ہے، بھلا یہ بھی کر دیکھیں! آگے جو اللّٰہ کی مرضی ہے، سو ہوگا۔

جب بادشاہ کے دل کو تسلّی ہوئی، تب وزیر سے پوچھا کہ اَور سب اَمیر و دَبیر کیا کرتے ہیں اور کس طَرح ہیں؟ اُس نے عَرض کی کہ سب اَرکانِ دَولت قبلۂ عالم[1] کے جان و مال کو دُعا کرتے ہیں، آپؐ کی فِکر سے سب حَیران و پَریشان ہو رہے ہیں۔ جمالِ مُبارک اپنا دِکھائیے، تو سب کی خاطِر جمع ہووے؛ چُناں چِہ اِس وقت دِیوانِ عامؐ میں حاضِر ہیں۔ یہ سُن کر بادشاہ نے حُکم کیا: اِنشاءَ اللہ تعالیٰ کل دربار کروں گا، سب کو کہ دو حاضِر رہیں۔ خِرَدمند یہ وعدہ سُن کر خوش ہوا اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر دُعا دی کہ جب تلک یہ زمین و آسمان[4] بَرپا ہیں، تمھارا تاج و تخت قائم رہے اور حُضور سے رُخصت ہو کر خوشی خوشی باہَر نکلا اور یہ خوش خَبَری اُمَراؤں سے کہی۔ سب اَمیر ہنسی خوشی گھر کو گئے۔ سارے شہر میں آنَند ہو گئی۔ رعیّت، پرجا مگن ہوئے[7] کہ کل بادشاہ بارِ عام کرے گا۔ صُبح کو سب خانہ زاد[9] اعلا اَدنا اور اَرکانِ دَولت چھوٹے بڑے اپنے اپنے پایے اور مرتبے پر آ کر کھڑے ہوئے اور مُنتَظِر جلوۂ بادشاہی کے تھے۔

جب پَہَر دِن چڑھا، ایک بارگی پردہ اُٹھا اور بادشاہ نے بَرآمد ہو کر تختِ مُبارک پر جُلوس فرمایا۔ نَوبت خانے میں شادیانے بجنے لگے۔ سبھوں نے نَذریں مُبارک بادی کی گُزرانیں اور مُجرے گاہ میں تسلیمات و کورنشات بجا لائے۔ مُوافِق قَدر و منزِلَت کے ہر ایک کو سَرفرازی ہوئی۔ سب کے دل کو خُوشی اور چَین ہوا۔ جب دو پَہَر ہوئی، بَرخاست ہو کر اَندرُونِ محل[12] داخِل ہوئے۔ خاصہ[13] نُوشِ جاں فرما کر خواب گاہ میں آرام کیا۔

اُس دن سے بادشاہ نے یہی مُقرّر کیا کہ ہمیشہ صُبح کو دربار کرنا اور تیسرے پَہَر

کتاب کا شُغل* یا وِرد وَظیفہ پڑھنا اور خُدا کی درگاہ میں توبہ اِستغفار کر کر اپنے مطلب کی دُعا مانگنی۔ ایک رُوز کتاب میں بھی لکھا دیکھا کہ اگر کسُو شخص کو غم یا فِکر ایسی لاحق ہو کہ اُس کا علاج تدبیر سے نہ ہو سکے، تو چاہیے کہ تقدیر کے حوالے کرے اور آپ گُورِستان کی طرف رُجوع کرے۔ دُرُود طُفَیل پیغمبر کی روح کے اُن کو بخشے اور اپنے تئیں نیست و نابُود سمجھ کر، دل کو اِس غفلتِ دُنیاوی سے ہُشیار رکھے اور عبرت سے رُووے اور خُدا کی قُدرت کو دیکھے کہ مجھ سے آگے کیسے کیسے صاحبِ مُلک و خزانہ اِس زمین پر پیدا ہوئے، لیکن آسمان نے سب کو اپنی گردِش میں لا کر خاک میں مِلا دیا۔ یہ کہاوَت ہے:

چلتی چکّی دیکھ کر، دِیا کبیرا رُو (۲)
دُو پاٹن کے بیچ آ، ثابت گیا نہ کو

اب جو دیکھیے، سِوائے ایک مِٹّی کے ڈِھیر کے، اُن کا کچھ نشان باقی نہیں رہا اور سب دَولتِ دُنیا، گھر بار، آل اَولاد، آشنا دوست، نوکر چاکر، ہاتھی گھوڑے چھوڑ کر اکیلے پڑے ہیں۔ یہ سب اُن کے کچھ کام نہ آیا؛ بلکہ اب کوئی نام بھی نہیں جانتا کہ یے کون تھے۔ اور قبر کے اندر کا اَحوال معلوم نہیں کہ کیڑے مَکوڑے، چیُونٹے، سانپ اُن کو کھا گئے، یا اُن پر کیا بیتی اور خُدا سے کیسی بنی! یے باتیں اپنے دل میں سُوچ کر، ساری دُنیا کو پیکھنے کا کھیل جانے؛ تب اُس کے دل کا غُنچہ ہمیشہ شگُفتہ* رہے گا، کسُو حالت میں پژمُردہ نہ ہوگا۔

یہ نصیحت جب کتاب میں مُطالعہ* کی، بادشاہ کو خردمند وزیر کا کہنا یاد آیا اور دونوں کو مُطابِق پایا۔ یہ شوق ہوا کہ اِس پر عَمَل کروں؛ لیکن سوار ہو کر اور

بھیڑ بھاڑ لے کر بادشاہوں کی طرح سے جانا اور پھرنا مناسب نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ لباس بدل کر، رات کو اکیلے مقبروں میں، یا کسی مردِ خدا گوشہ نشین[1] کی خدمت میں جایا کروں اور شب بیدار رہوں؛ شاید اِن مردوں کے وسیلے[2] سے دنیا کی مراد اور عاقبت کی نجات میسّر ہو۔

یہ بات دل میں مقرر کر کر، ایک روز رات کو موٹے[3] جھوٹے کپڑے پہن کر، کچھ روپے اشرفی لے کر، چپکے قلعے سے باہر نکلے اور میدان کی راہ لی۔ جاتے جاتے ایک گورستان میں پہنچے۔ نہایت صدقِ دل سے درود پڑھ رہے تھے، اور اُس وقت بادِ تند چل رہی تھی، بلکہ آندھی کہا چاہیے۔ ایک بارگی بادشاہ کو دور سے ایک شعلہ سا نظر آیا کہ مانند صبح کے تارے کے روشن ہے۔ دل میں اپنے خیال کیا کہ اِس آندھی اور اندھیرے میں یہ روشنی خالی حکمت سے نہیں۔ یا یہ طلسم ہے کہ اگر پھٹکری اور گندھک کو چراغ میں بتّی کے آس پاس چھڑک دیجیے؛ تو کیسی ہی ہوا چلے، چراغ گُل نہ ہوگا۔ یا کسو ولی کا چراغ ہے کہ جلتا ہے۔ جو کچھ ہو سو ہو، چل کر دیکھا چاہیے؛ شاید اِس شمع کے نور سے میرے بھی گھر کا چراغ روشن ہو اور دل کی مراد ملے۔

یہ نیّت کر کے اُس طرف کو چلے۔ جب نزدیک پہنچے؛ دیکھا تو چار فقیر بے نوا، کفنیاں گلے میں ڈالے اور سر زانو پر دھرے، عالمِ بے ہوشی میں خاموش بیٹھے ہیں اور اُن کا یہ عالم ہے جیسے کوئی مسافر اپنے ملک اور قوم سے بچھڑ کر، بے کسی اور مفلسی کے رنج و غم میں گرفتار ہو کر حیران رہ جاتا ہے؛ اِسی طرح سے[10] یہ چاروں نقشِ دیوار ہو رہے ہیں۔ اور ایک چراغ پتھر پر دھرا ٹمٹما رہا ہے،

ہرگز ہَوا اُس کو نہیں لگتی ؛ گویا فانوس (۱) اُس کی آسمان بنا ہے کہ بے خطرے (۲) جلتا ہے۔

آزاد بخت کو دیکھتے ہی یقین آیا کہ مُقرر تیری آرزو اِن مَردانِ خُدا کے قَدَم کی بَرَکت (۳) سے بَر آوے گی۔ اور تیری اُمّید کا سُوکھا درخت اِن کی تَوَجُّہ سے ہَرا ہو کر پَھلے گا۔ اِن کی خدمت میں چل کر اپنا اَحوال کہ اور مجلس کا شریک ہو؛ شاید تجھ پر رَحم کھا کر دُعا کریں، جو بے نیاز کے یہاں قُبول ہو۔ یہ ارادہ کر کر چاہا کہ قَدَم آگے دَھرے، وُہیں (۴) عقل* نے سمجھایا کہ اَے بے وُقوف! جلدی نہ کر، ذرا (۵) دیکھ لے؛ تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں اور کِدھر* جاتے ہیں! کیا جانیں یہ دِیو ہیں یا غُولِ بیابانی** ہیں کہ آدمی کی صورت بن کر باہم مِل بیٹھے ہیں۔ بہ ہر صورت، جلدی کرنا (۶) اور اِن کے درمیان جا کر مُخِل (۷) ہونا خوب نہیں۔ ابھی ایک گوشے میں چھپ* کر حقیقت اِن دَرویشوں کی جاننا (۸) چاہیے۔ آخر بادشاہ نے یہی کیا کہ ایک کونے میں اُس مکان کے چُپکا جا بیٹھا۔ کہ کسُو کو اُس کے آنے کی آہَٹ کی خبر نہ ہوئی۔ اپنا دھیان اُن کی طَرَف لگایا کہ دیکھیے آپس میں کیا بات چیت کرتے ہیں۔

اِتّفاقاً ایک فقیر کو چھینک آئی، شُکرِ خُدا کا کیا۔ وُہ تینوں قلندر اُس کی آواز سے چونک پڑے، چراغ کو اُکسایا۔ ٹھیپ* تُو روشن تھا، اپنے اپنے بستروں پر حُقّے بھر کر پینے لگے۔ ایک اُن آزادوں میں سے بُولا: اَے یارانِ ہَم دَرد و رَفیقانِ جَہاں گَرد! ہم چار صورتیں، آسمان کی گَردِش سے اور لیل و نَہار (۹) کے اِنقلاب سے، دَر بہ دَر خاک بہ سَر ایک مُدّت پھریں (۱۰)۔ اَلحمدُ لِلّٰہ! کہ (۱۱) طالع کی مدد اور قسمت کی یاوَری سے آج اِس مَقام پر باہم مُلاقات ہوئی

اور کل کا اَحوال کچھ معلوم نہیں کہ کیا پیش آوے! ایک گَمَت رہیں یا جُدا جُدا ہو جاویں۔ رات بڑی پہاڑ ہوتی ہے، ابھی سے پَڑ پَڑ رہنا خوب نہیں؛ اِس سے یہ بہتر ہے کہ اپنی اپنی سَرگُذَشت*، جو اِس دُنیا میں جس[۵] پر بیتی ہو (بہ شرطے کہ جھوٹھ اُس میں کوڑی بھر نہ ہو) بیان کرے، تو باتوں میں رات کٹ جائے۔ جب تھوڑی شب باقی رہے، تب لوٹ پوٹ رہیں گے۔ سبھوں[۶] نے کہا: یا ہادی! جو کچھ اِرشاد ہوتا ہے، ہم نے قُبول کیا؛ پہلے آپ ہی اپنا اَحوال (جو دیکھا ہے) شُروع کیجیے تو ہم مُستَفید ہوں۔

سیر[۷] پہلے دَروِیش کی

پہلا دَروِیش دو زانو ہو بیٹھا اور اپنی سَیر کا قصّہ اِس طَرَح سے کہنے لگا:
یا مَعبُودَ اللہ! ذرا[۸] اِدھر[۹] مُتَوَجِّہ ہو اور ماجرا اِس بے سَر و پا کا سُنو۔

یہ سَرگُذَشت میری ذرا[۱۰] کان دَھر سُنو! | مجھ کو فلک نے کر دیا زِیر و زَبَر، سُنو!
جو کچھ کہ پیش آئی ہے شِدّت مرے تئیں | اُس کا بیان کرتا ہوں، تم سَر بہ سَر سُنو!

اَے یاراں! میری پَیدایِش* اور وَطَن بُزُرگوں کا مُلکِ یَمَن ہے۔ والِدِ اِس عاجز کا مَلِکُ التُّجّار خواجہ احمد نام بڑا سوداگر تھا۔ اُس وقت میں کوئی مَہاجَن یا[۱۱] بَیپاری* اُن کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں، اور گُماشتے خرید و فروخت کے واسطے مُقرّر تھے اور لاکھوں روپے نَقد اور جِنس مُلک مُلک کی گھر میں مَوجود تھی[۱۲]۔ اُن کے یہاں دو لڑکے پَیدا ہوئے۔ ایک تو یہی فقیر جو کَفنی*، سیلی* پہنے ہوئے، مُرشِدوں کی حُضوری[۹] میں حاضِر اور بولتا ہے۔ دوسری ایک بَہِن*، جس کو

قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی اور شہر کے سوداگر بچے سے شادی کر دی تھی، وہ اپنی سسرال میں رہتی تھی۔

غرض جس کے گھر میں اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو، اُس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے! مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چوز سے ما باپ کے سایے میں پرورش پائی اور پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا کسب و فن، سوداگری کا بہی کھاتا، روزنامہ سیکھنے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بے فکری میں گزری، کچھ دُنیا کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یک بہ یک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی سے مرگئے۔ عجب طرح کا غم ہوا، جس کا بیان نہیں کرسکتا۔ ایک بارگی یتیم ہوگیا، کوئی سر پر بوڑھا بڑا نہ رہا۔ اِس مصیبتِ ناگہانی سے رات دن رویا کرتا، کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔

چالیس دن جُوں تُوں کر کٹے۔ چہلم میں اپنے بیگانے، چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت ہوئی، سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا: دُنیا میں سب کے ما باپ مرتے آئے ہیں اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے؛ پس صبر کرو، اپنے گھر کو دیکھو۔ اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے؛ اپنے کاروبار، لین دین سے ہُشیار رہو۔ تسلی دے کر وُہ رخصت ہوئے۔ گماشتے، کاروباری، نوکر چاکر جتنے تھے، آن کر حاضر ہوئے، نذریں دیں اور بولے: کوٹھے نقد و جنس کے اپنی نظرِ مبارک سے دیکھ لیجے۔ ایک بارگی جو اُس دولتِ بے انتہا پر نگاہ پڑی، آنکھیں کھل گئیں۔ دیوان خانے کی تیاری کو حکم کیا۔ فراشوں نے فرش فروش بچھا کر؛ چھت، پردے، چلونیں تکلف کی لگا دیں۔ اور اچھے اچھے

خدمت گار[1] دیدار رُو نوکر رکھّے، سرکار سے زَرْق بَرْق کی پُوشاکیں بنوا دیں۔ فقیر مسند پر تکیہ[2] لگا کر بیٹھا۔ وَیسے ہی آدمی غُنڈے، پھانکڑے[3]، مُفت پر کھانے پینے والے جھوٹھے، خوشامدی آکر آشنا ہوئے اور مُصاحِب بنے؛ اُن سے آٹھ پہر صُحبت رہنے لگی۔ ہر کہیں کی باتیں اور زَٹلیں* واہی تَباہی اِدھر[4] اُدھر کی کرتے اور کہتے: اِس جوانی کے عالَم میں رَنگِیْنی کی شراب یا گُلِ گُلاب کھِنچوائیے؛ ناز نیں معشوقوں کو بُلوا کر، اُن کے ساتھ پیجیے اور عیش کیجیے۔

غَرَض آدمی کا شَیطان آدمی ہے؛ ہر دَم کے کہنے سُننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔ شراب، ناچ اور جُوئے کا چرچا شُروع ہوا۔ پھر تو یہ نَوبت پہنچی کہ سَوداگری بھول کر، تَماش بِینی کا اور دِینے لینے کا سَودا ہوا۔ اپنے نوکر اور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی؛ جو جس کے ہاتھ پڑا، الگ کیا، گویا لُوٹ مچا دی۔ کچھ خبر نہ تھی* کتنا روپیا خَرچ ہوتا ہے، کہاں سے آتا[5] اور کِدھر جاتا ہے۔ مالِ مُفت دلِ بے رَحم۔ اِس وَرخَرچی* کے آگے اگر گنجِ قارُوں کا ہوتا، تو بھی وَفا نہ کرتا۔ کئی بَرَس کے عرصے میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فَقَط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ وُہ[6] آشنا (جو دانت کاٹی رُوٹی کھاتے تھے اور چمچا* بھر خون اپنا ہر بات میں زبان سے نِثار کرتے تھے) کافُور ہو گئے؛ بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ مُلاقات ہو جاتی، تو آنکھیں* چُرا کر مُنہ پھیر لیتے۔ اور نوکر چاکر، خدمت گار، بہلیے*، ڈھلیت، خاصؔ بَردار، ثابِت خانی؛ سب چھوڑ کر* کنارے لگے۔ کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا جو کہے: یہ کیا تمھارا حال ہوا؟ سِوائے غم اور افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔ اَب دَمڑی کی ٹھُڈِّیاں مُیَسَّر نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین

فاقے کڑا کے کھینچے، تاب بھوک کی نہ لاسکا؛ لاچار بے حیائی کا بُرقع مُنہ پر ڈال کر، یہ قصد کیا بہن کے پاس چلیے؛ لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سلوک کیا نہ خالی خط لکھا؛ بلکہ اُس نے دو ایک خط خطوط ماتم پرسی اور اشتیاق کے جو لکھے، اُن کا بھی جواب اُس خوابِ خرگوش میں نہ بھیجا۔ اِس شرمندگی سے جی تو نہ چاہتا تھا، پر سوائے اُس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا۔ جُوں تُوں پاپیادہ، خالی ہاتھ، گرتا پڑتا، ہزار محنت سے وُہ کئی منزلیں کاٹ کر، ہمشیر کے شہر میں جاکر اُس کے مکان پر پہنچا۔

وُہ ماجائی میرا یہ حال دیکھ کر، بلائیں لے اور گلے مل کر بہت رُوئی۔ تیل ماش اور کالے ٹکے مجھ پر سے صدقے کیے، کہنے لگی: اگرچہ مُلاقات سے دل بہت خوش ہوا، لیکن بھیّا! تیری یہ کیا صورت بنی؟ اِس کا جواب مَیں کچھ نہ دے سکا، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چُپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی خاصّی پوشاک سِلوا کر حمّام میں بھیجا۔ نہا دھو کر وُہ کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس بہت اچھا، تکلّف کا میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صُبح کو شربت اور توزیات، حلوا سوہن، پستہ، مغزی ناشتے کو؛ اور تیسرے پہر میوے خُشک و تر، پھل پھلاری؛ اور رات دن دونوں وقت پُلاو، نان، قلیے، کباب تحفہ تحفہ، مزے دار منگوا کر اپنے روبرو کھلا کر جاتی، سب طرح خاطرداری کرتی۔ میں نے ویسی تصدیع کے بعد جو یہ آرام پایا، خُدا کی درگاہ میں ہزار ہزار شکر بجا لایا۔ کئی مہینے اِس فراغت سے گزرے کہ پانو اُس خلوت سے باہر نہ رکھا۔

ایک دن وُہ بہن (جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی) کہنے لگی:

اَے بیرن! تو میری آنکھوں کی پُتلی اور ماباپ کی موئی مٹّی کی نشانی ہے، تیرے آنے سے میرا کلیجا ٹھنڈا ہوا، جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں، تو نے مجھے نہال کیا؛ لیکن مردوں کو خُدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے، گھر میں بیٹھے رہنا اُن کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹّو ہو کر گھر سیتا ہے، اُس کو دُنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں خصوص اِس شہر کے آدمی، چھوٹے بڑے، بے سبب تمھارے رہنے پر کہیں گے: اپنے باپ کی دولتِ دُنیا کھو کھا کر، بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمھاری ہنسائی اور ماباپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو؛ خُدا چاہے تو دِن پھریں اور اِس حیرانی اور مفلسی کے بدلے، خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو۔

یہ بات سُن کر مجھے بھی غیرت آئی، اُس کی نصیحت پسند کی، جواب دیا: اچھا! اب تم ماں کی جگہ ہو؛ جو کہو، سو کروں۔ یہ میری مرضی پا کر، گھر میں جا کے، بچاس توڑے اشرفی کے اصیل اور لونڈیوں کے ہاتھوں میں لوا کر میرے آگے لا رکھے اور بولی: ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے؛ تم اِن روپیوں سے جنسِ تجارت کی خرید کرو۔ ایک تاجر ایمان دار کے حوالے کر کے؛ دستاویز پکّی لکھوا لو اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو؛ اپنا مال مع منافع سمجھ بوجھ لیجو، یا آپ بیچیو۔ میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری کا خرید کر ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا، نوشت خواند سے خاطر جمع کر لی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا، فقیر نے خشکی کی راہ چلنے کی

تیّاری کی۔ جب رُخصت ہونے لگا؛ بہن نے ایک سرِ اپے پاو بھاری اور ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے تواضع کیا۔ اور مٹھائی، پکوان ایک خاص دان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا اور چھاگل پانی کی شِکاربند میں بندھوا دی۔ اِمام ضامن کا روپیا میرے بازُو پر باندھا، دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر، آنسو پی کر بُولی: سِدھارُو، تمھیں خُدا کو سونپا! پیٹھ دِکھائے جاتے ہو، اِسی طرح جلد اپنا مُنہ دِکھائیو! میں نے فاتحہ خیر کی پڑھ کر کہا: تمھارا بھی اللہ حافِظ ہے، میں نے قبُول کیا! ۔ وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور خُدا کے توکّل پر بھروسا کر کے، دُو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق[۸] کے پاس جا پہنچا۔

غرض جب شہر کے دروازے پر گیا، بہت رات جا چکی تھی، دربان اور نگاہ بانوں نے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے بہت منّت کی: مُسافر[۹] ہوں، دُور سے دھاوا مارے آتا ہوں؛ اگر کواڑ[۸] کھول دو، شہر میں جا کر دانے گھاس کا آرام پاؤں۔ اندر سے گھُڑک[۶] کر بُولے: اِس وقت دروازہ کھولنے کا حُکم نہیں، کیوں اِتنی رات گئے تم آئے؟ جب میں نے جوابِ صاف اُن سے سُنا؛ شہر پناہ کی دیوار کے تلے، گھوڑے پر سے اُتر، زِین پُوش بچھا کر بیٹھا۔ جاگنے کی خاطر اِدھر[۸] اُدھر ٹہلنے لگا۔ جس وقت آدھی رات اِدھر[۸] اور آدھی رات اُدھر ہوئی، سنّسان ہو گیا؛ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعے کی دیوار پر سے نیچے چلا آتا ہے۔ یہ دیکھ کر مَیں اَچنبھے میں ہوا کہ یہ کیا طِلسم ہے! شاید خُدا نے میری حیرانی و[۹] سرگردانی پر رحم کھا کر خزانہ[۱۰] غیب سے عِنایت کیا۔

جب وُہ صندوق زمین پر ٹھہرا، ڈرتے ڈرتے مَیں پاس گیا۔ دیکھا تو کاٹھ کا صندوق ہے۔ لالچ سے اُسے[۱۱] کھولا۔ ایک معشوقِ خوب[۱۲] صورت، کامنی سی عورت،

جس کے دیکھنے سے ہوش جاتا رہے؛ گھائل، لہو میں تر بہ تر، آنکھیں بند کیے پڑی کلبلاتی ہے۔ آہستہ آہستہ ہونٹھ ہلتے ہیں اور یہ آواز منہ سے نکلتی ہے: اے کم بخت بے وفا[1]، اے ظالمِ پُر جفا! بدلا اِس بھلائی اور محبت کا یہی تھا جو تو نے کیا! بھلا ایک زخم اور بھی لگا! میں نے اپنا تیرا انصاف خدا کو سونپا۔ یہ کہ کر، اُسی بے ہوشی کے عالم میں دوپٹے کا آنچل منہ پر لے لیا، میری طرف دھیان نہ کیا۔ فقیر اُس کو دیکھ کر اور یہ بات سُن کر سُن ہوا، جی میں آیا: کس[2] بے حیا، ظالم نے کیوں ایسے نازنین صنم کو زخمی کیا؟ کیا اُس کے دل میں آیا اور ہاتھ اِس پر کیوں کر چلایا؟ اِس کے دل میں تو محبت اب تلک باقی ہے، جو اِس جاں کندنی کی حالت میں اُس کو یاد کرتی ہے! میں آپ[3] ہی آپ یہ کہ رہا تھا، آواز اُس کے کان میں گئی؛ ایک مرتبہ کپڑا منہ سے سرکا کر مجھ کو دیکھا۔ جس وقت اُس کی نگاہیں میری نظروں سے لڑیں، مجھے غش آنے اور جی سنسنانے لگا۔ بہ زور اپنے تئیں تھانبا، جرأت کر کے پوچھا: سچ کہو، تم کون ہو اور یہ کیا ماجرا ہے؟ اگر بیان کرو، تو میرے دل کو تسلی ہو۔ یہ سُن کر، اگرچہ طاقت بولنے کی نہ تھی، آہستے[4] سے کہا: شُکر ہے، میری حالت زخموں کے مارے یہ کچھ ہو رہی ہے، کیا خاک بولوں! کوئی دم کی مہمان ہوں۔ جب میری جان نکل جاوے، تو خدا کے واسطے جواں مردی کر کے، مجھ بدبخت کو اِسی صندوق میں کسی جگہ گاڑ دیجو؛ تو میں بھلے بُرے کی زبان سے نجات پاؤں اور تو داخلِ ثواب کے ہو۔ اِتنا بول کر چُپ ہوئی۔

رات کو مجھ سے کچھ تدبیر نہ ہو سکی۔ وہ صندوق اپنے پاس اُٹھا لایا اور گھڑیاں گننے[5] لگا کہ کب اِتنی رات تمام ہو تو فجر کو شہر میں جا کر، جو کچھ علاج اِس کا ہو سکے، بہ مقدور اپنے کروں۔ وہ تھوڑی سی رات ایسی پہاڑ ہو گئی کہ دل گھبرا گیا۔ بارے

خُدا خُدا کر صُبح جب نزدیک ہوئی، مُرغ بولا، آدمیوں کی آواز آنے لگی؛ میں نے فجر کی نماز پڑھ کر صندوق کو خُورجی میں کَسا۔ جُونہیں* دروازہ شہر کا کھلا، مَیں شہر میں داخل ہوا۔ ہر ایک آدمی اور دُکان دار سے حوِیلی کرایے کی تلاش کرنے لگا۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ایک مکان خوش قَطع[1]، نیا، فَراغت کا بھاڑے لے کر جا اُترا۔ پہلے اُس معشوق کو صندوق سے نکال کر، روئی کے پہلوؤں پر مُلائم* بچھونا کر کے ایک گوشے میں لٹایا اور آدمی اِعتباری وہاں چھوڑ کر؛ فقیر، جرّاح کی تلاش میں نکلا۔ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ اِس شہر میں جرّاح کاریگر کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ ایک شخص نے کہا: ایک حجّام جرّاحی کے کَسب اور حکیمی کے فن میں یکّہ ہے اور اِس کام میں نِپٹ پکّا ہے۔ اگر مُردے کو اُس پاس لے جاؤ، خُدا کے حُکم سے ایسی تدبیر کرے کہ ایک بار وُہ بھی جی اُٹھے۔ وُہ اُس مُحلّے* میں رہتا ہے اور عیسیٰ نام ہے۔

مَیں یہ مُژدہ سُن کر بے اِختیار چلا۔ تلاش کرتے کرتے پتے سے اُس کے دروازے پر پہنچا۔ ایک مردِ سُفید ریش کو دِہلیز پر بیٹھے دیکھا اور کئی آدمی مرہم کی تیاری کے لیے کچھ پیس پاس رہے تھے۔ فقیر نے مارے خوشامد کے اَدب سے سلام کیا اور کہا: مَیں تمھارا نام اور خوبیاں سُن کر آیا ہوں۔ ماجرا یہ ہے کہ مَیں اپنے مُلک سے تجارت کے لیے چلا، قَبیلے کو بہ سبب مُحبّت کے ساتھ لیا۔ جب نزدیک اِس شہر کے آیا، تھوڑی سی دور رہا تھا جو شام پڑ گئی۔ اَن دیکھے مُلک میں رات کو چلنا مُناسب نہ جانا، مَیدان میں ایک درخت کے تلے اُتر پڑا۔ پچھلے پہر ڈاکا آیا؛ جو کچھ مال اَسباب پایا، لُوٹ لیا۔ گہنے کے لالچ سے اُس بی بی کو بھی گھائل کیا۔ مجھ

سے کچھ نہ ہوسکا۔ رات جو باقی تھی، جُوں تُوں کر کاٹی، فجر ہی شہر میں آن کر ایک مکان کرایے لیا؛ اُن کو وہاں رکھ کر میں تمھارے پاس دوڑا آیا ہوں۔ خُدا نے تمھیں یہ کمال دیا ہے؛ اِس مُسافر پر مہربانی کرو، غریب خانے تشریف لے چلو، اُس کو دیکھو۔ اگر اُس کی زندگی ہوئی، تو تمھیں بڑا جَس ہوگا اور میں ساری عُمر غُلامی کروں گا۔ عیسیٰ جَرّاح بہت رَحم دل اور خُدا پَرَست تھا؛ میری غریبی کی باتوں پر تَرَس کھا کر، میرے ساتھ اُس حَوِیلی تک آیا۔ زخموں کو دیکھتے ہی میری تسلّی کی، بُولا کہ خُدا کے کرم سے اِس بی بی کے زَخم چالیس دن میں بھر آویں گے، غُسل شِفا کا کروادوں گا۔

غَرَض اُس مَردِ خُدا نے سب زخموں کو نیم کے پانی سے دُھو دھا کر صاف کیا۔ جو لائق ٹانکوں کے پائے، اُنھیں سِیا۔ باقی گھاؤں[۱] پر، اپنے کھیسے[*] سے ایک ڈِبیا نکال کر، کتنوں میں بَتّی رکھی اور کتنوں پر پھائے[۲] چڑھا کر، پٹّی سے باندھ دیا اور نہایت شَفقت سے کہا: مَیں دونوں وقت آیا کروں گا، تو خبردار رہیو، ایسی حرکت[*] نہ کرے جو ٹانکے ٹوٹ جائیں۔ مُرغ کا شُوربا، بجائے[*] غِذا، اِس کے حَلق میں چُوائیو اور اکثر عَرَقِ بید مُشک گُلاب کے ساتھ دیا کیجو، جو قُوّت رہے۔ یہ کہہ کر رُخصت چاہی۔ میں نے بہت مِنّت کی اور ہاتھ جُوڑ کر کہا: تمھاری تَشفّی[۷] دینے سے میری بھی زِندگی ہوئی، نہیں تو سوائے مَرنے کے کچھ سوجھتا نہ تھا، خُدا تمھیں سلامت رکھّے۔ عِطر پان دے کر رُخصت کیا۔ مَیں رات دن خدمت میں اُس پری کی[*] حاضِر رہتا، آرام اپنے اوپر حرام کیا۔ خُدا کی درگاہ سے رُوز رُوز[۹] اُس کے چنگے ہونے کی دُعا مانگتا۔

اِتِّفاقاً وُہ سوداگر بھی آپہنچا اور میرا مالِ اَمانت[1] میرے حوالے کیا۔ میں نے اُسے اَونے پَونے بیچ ڈالا اور دارُو دَرمَن میں خَرچ کرنے لگا۔ وُہ مردِ جرّاح ہمیشہ آتا جاتا۔ تھوڑے عرصے میں سب زَخم بھر کر انگور کر لائے۔ بعد کئی دن کے غُسلِ شِفا کا کیا، عجَب طَرح کی خوشی حاصل ہوئی۔ خِلعت اور اَشرَفیاں عیسیٰ حَجّام کے آگے دَھریں اور اُس پری کو، مُکلّف فرش بچھا کر، مسند پر بٹھایا۔ فقیر، غریبوں کو بہت سی خَیر خیرات کی۔ اُس دن گُویا بادشاہت ہَفت اِقلیم کی اِس فقیر کے ہاتھ لگی۔ اور اُس پری کا، شِفا پانے سے، ایسا رنگ نِکھرا کہ مُکھڑا سورج کی مانِند چمکنے[2] اور کُندَن کی طَرح دَمکنے[3] لگا۔ نظر کی مجال نہ تھی جو اُس کے جمال پر ٹھہرے۔ فقیر بہ سَروچَشم اُس کے حُکم میں حاضر رہتا؛ جو فرماتی، سُو بجا لاتا۔ وُہ اپنے حُسن کے غُرور اور سرداری کے دِماغ میں، جو میری طرف کبھو دیکھتی تو فرماتی: خبردار! اگر تجھے ہماری خاطر منظور ہے تو ہرگز ہماری بات میں دَم نہ مارِیو۔ جو ہم کہیں، سُو بِلا عُذر کیے جائیو، اپنا کسی بات میں دَخل نہ کریو؛ نہیں تو پچتاوے گا۔ اُس کی وَضع[4] سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ حق میری خدمت گُزاری اور فرماں بَرداری کا اُسے البتّہ منظور ہے۔ فقیر بھی اُس کی بے مرضی ایک کام نہ کرتا۔ اُس کا فرمانا بہ سَروچَشم بجا لاتا۔

ایک مُدّت اِسی راز و نیاز میں کٹی۔ جو اُس نے فرمایش کی، وُہیں میں نے لاکر حاضِر کی۔ اِس فقیر پاس جو کچھ جِنس اور نَقد اَصل و نَفع[7] کا تھا، سب صرف ہوا۔ اُس بیگانے مُلک میں کون اِعتِبار کرے جو قَرض وام سے کام چلے، آخر تکلیف رُوز مَرّے[8] کے خَرچ کی ہونے لگی۔ اِس سے دل بہت گھبرایا، فِکر سے

دُبلا ہوتا چلا، چہرے کا رنگ کلُجھواں[١] ہوگیا؛ لیکن کس سے کہوں! جو کچھ دل پر گزرے[٢]، سو گزرے! قہرِ درویش بر جانِ درویش! ایک دن اُس پری نے اپنے شعور[*] سے دریافت کرکے کہا: اَے فُلانے! تیری خدمتوں کا حق[٣] ہمارے جی میں نقشِ کالحجر ہے، پر اُس کا عوض بِالفعل ہم سے نہیں ہوسکتا؛ اگر واسطے خرچ ضروری کے کچھ درکار ہو، تو اپنے دل میں اندیشہ[٤] نہ کر، ایک ٹکڑا کاغذ اور دَوات قلم حاضر کر۔ میں نے تب معلوم کیا کسی مُلک کی بادشاہ زادی ہے، جو اِس دل و دماغ سے گُفتگو[٥] کرتی ہے؛ فی الفور قلم دان آگے رکھ دیا۔ اُس نازنیں نے ایک شُقّہ دَستخطِ[٦] خاص سے لکھ کر میرے حوالے کیا اور کہا: قلعے کے پاس ترپَولیا[*] ہے، وہاں اُس کوچے میں ایک حَوِیلی بڑی سی ہے، اُس مکان کے مالک کا نام سیدی[*] بہار ہے؛ تو جاکر اِس رُقعے کو اُس تلک پہنچا دے۔

فقیر مُوافق فرمانے اُس کے، اُسی نام و نشان پر منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ دَربان کی زُبانی کیفیت خط[٧] کی کہلا بھیجی۔ وُہیں[٨] سُنتے ہی ایک حَبشی جوان خوب[٩] صورت، ایک پھینٹا طَرح دار سجے ہوئے باہَر نکل آیا۔ اگرچہ رنگ سانولا تھا، پَر گُویا تمام نمک بھرا ہوا۔ میرے ہاتھ سے خط[١٠] لے لیا، نہ بُولا نہ کچھ پوچھا، اُنھیں قدموں پھر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں گیارہ کِشتیاں سَر بہ مُہَر، زَر بفت کے تُورہ[١١] پُوش پڑے ہوئے، غُلاموں کے سر پر دَھرے باہَر آیا، کہا: اِس جوان کے ساتھ جاکر یہ گوشے پہنچا دو۔ میں بھی[١٢] سلام کر، رُخصت ہو، اپنے مکان میں لایا۔ آدمیوں کو دروازے کے باہَر سے رُخصت کیا، وُہ کِشتیاں امانت حضور میں اُس پری کے گُزرانیاں۔

دیکھ کر فرمایا: یہ گیارہ[1] بدرے اشرفیوں کے لے اور خرچ میں لا، خدا رزّاق ہے۔ فقیر اُس نقد کو لے کر ضروریات میں خرچ کرنے لگا۔ اگرچہ خاطر جمع ہوئی، پر دل میں یہ خلش رہی: یا الٰہی! یہ کیا صورت ہے! بغیر پوچھے گچھے اِتنا مال، نا آشنا صورت اجنبی نے، ایک پُرزے کاغذ پر میرے حوالے کیا! اگر اُس پری سے یہ بھید پوچھوں، تو اُس نے پہلے ہی منع کر رکھا تھا، مارے ڈر کے[2] دم نہیں مار سکتا تھا۔

بعد آٹھ دن کے وہ معشوقہ مجھ سے مخاطب ہوئی کہ حق[3] تعالیٰ نے آدمی کو اِنسانیت[4] کا جامہ عنایت کیا ہے کہ نہ پھٹے نہ میلا ہو؛ اگرچہ پُرانے کپڑے سے اُس کی آدمیت میں فرق نہیں آتا، پر ظاہر میں خلق اللہ کی نظروں میں اِعتبار نہیں پاتا۔ دو توڑے اشرفی کے ساتھ لے کر، چوک کے چوراہے پر، یوسف سوداگر کی دُکان میں جا اور کچھ رقم جواہر[5] کے بیش قیمت اور دو خلعتیں[6] زرق برق کی مول لے آ۔ فقیر وہیں[7] سوار ہو کر اُس کی دکان پر گیا۔ دیکھا تو ایک جوانِ[8] شکیل، زعفرانی جوڑا پہنے گدّی[9] پر بیٹھا ہے اور اُس کا یہ عالم ہے کہ ایک عالم، دیکھنے کے لیے، دُکان[10] سے بازار تک کھڑا ہے۔ فقیر کمالِ شوق سے نزدیک جاکر، سلامٌ[11] علیک کر کر بیٹھا اور جو جو چیز مطلوب تھی، طلب کی۔ میری بات چیت اُس شہر کے باشندوں کی سی نہ تھی، اُس جوان نے گرم جوشی[12] سے کہا: جو صاحب کو چاہیے، سب[13] موجود ہے؛ لیکن یہ فرمائیے کس ملک سے آنا ہوا اور اِس اجنبی شہر میں رہنے کا کیا باعث ہے؟ اگر اِس حقیقت سے مطلع کیجیے[14] تو مہربانی سے بعید نہیں۔ میرے تئیں اپنا

اَحوال ظاہر کرنا منظور نہ تھا؛ کچھ بات بنا کر اور جواہر، پوشاک لے کر اور قیمت اُس کی دے کر رُخصت چاہی۔ اُس جوان نے رُوکھے پھیکے ہو کر کہا: اَے صاحِب! اگر تم کو ایسی ہی نا آشنائی کرنی تھی، تو پہلے دوستی اِتنی گرمی سے کرنی کیا ضرور تھی! بھلے آدمیوں میں صاحِب سَلامت کا پاس بڑا ہوتا ہے۔ یہ بات اِس مزے اور انداز سے کہی، بے اِختیار دل کو بھائی اور بے مُروّت ہو کر وہاں سے اُٹھنا، اِنسانیّت کے مُناسِب نہ جانا؛ اُس کی خاطِر پھر بیٹھا اور بولا: تمھارا فرمانا سر آنکھوں پر، مَیں حاضِر ہوں۔

اِتنے کہنے سے بہت خوش ہوا، ہنس کر کہنے لگا: اگر آج کے دن غریب خانے میں کرم کیجیے، تو تمھاری بدَولت مجلسِ خوشی کی جما کر، دُو چار گھڑی دل بہلاویں اور کچھ کھانے پینے کا شُغل باہَم بیٹھ کر کریں۔ فقیر نے اُس پری کو کبھو اکیلا نہ چھوڑا تھا؛ اُس کی تنہائی یاد کر کر چند دَر چند عُذر کیے، پَر اُس جوان نے ہرگز نہ مانا۔ آخر وعدہ اُن چیزوں کو پہنچا کر میرے پھر آنے کا لے کر اور قسم کھلا کر رُخصت دی۔ مَیں دُکان سے اُٹھ کر، جواہِر اور خِلعتیں اُس پری کی خدمت میں لایا۔ اُس نے قیمت جَواہِر کی اور حقیقت جَوہَری کی پوچھی۔ میں نے سارا اَحوال مُول تُول کا اور مہمانی کے بجِد ہونے کا کہہ سُنایا۔ فرمانے لگی: آدمی کو اپنا قَول قَرار پورا کرنا واجِب ہے؛ ہمیں خُدا کی نگہ بانی میں چھوڑ کر، اپنے وعدے کو وَفا کر۔ ضِیافت قبول کرنی سُنّت رسول کی ہے۔ تب میں نے کہا: میرا دل چاہتا نہیں کہ تمھیں اکیلا چھوڑ کر جاؤں، اور حُکم یوں ہوتا ہے؛ لاچار جاتا ہوں۔ جب تلک آؤں گا، دل یہیں لگا رہے گا۔ یہ کہہ کر پھر اُس جوہَری

کی دُکان پر گیا۔ وُہ مونڈھے پر بیٹھا میرا اِنتظار کھینچ رہا تھا، دیکھتے ہی بُولا:
آؤ مہربان! بڑی راہ دِکھائی۔ وُہیں اُٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چلا۔ جاتے
جاتے ایک باغ میں لے گیا۔ وُہ بڑی بہار کا باغ تھا۔ حوض اور نہروں میں
فوّارے* چھوٹتے تھے، میوے طرح بہ طرح کے پھل رہے تھے، ہر ایک درخت
مارے بُوجھ کے جھوم رہا تھا، رنگ بہ رنگ کے جانور اُن پر بیٹھے چہچہے کر رہے تھے؛
اور ہر مکانِ عالی شان میں فرش سُتھرا بِچھا تھا۔ وَہاں لبِ نہر ایک بنگلے میں جاکر
بیٹھا۔ ایک دم کے بعد آپ اُٹھ کر چلا گیا، پھر دوسری پُوشاک(۴) معقول پہن کر آیا۔
میں نے دیکھ کر کہا: سُبْحانَ اللہ! چَشْمِ بَد دُور! سُن کر مُسکرایا اور بُولا: مُناسِب
یہ ہے کہ صاحِب بھی اپنا لِباس بدل ڈالیں۔ اُس کی خاطر میں نے بھی دوسرے
کپڑے پہنے۔

اُس جوان نے بڑی ٹیپ ٹاپ سے تیّاری ضِیافت کی کی اور سامان خوشی
کا، جیسا چاہیے، مَوجود کیا اور فقیر سے صُحبت بہت گرم کر، مزے کی باتیں کرنے
لگا۔ اِتنے میں ساقی صُراحی و پیالہ بِلَّور* کا لے کر حاضِر ہوا اور گزک کئی قسم کی
لا رکھی، نمک دان چُن دِیے۔ دَور شراب کا شُرُوع ہوا۔ جب دُو چار جام
کی نَوبت پہنچی؛ چار لڑکے اَمرَد، صاحِب(۸) جمال، زُلفیں کھولے ہوئے مجلس
میں آئے، گانے بجانے لگے۔ یہ عالَم ہوا اور ایسا سماں بندھا: اگر تان سین
اُس گھڑی ہوتا، تو اپنی تان بھول جاتا اور بیجو باورا سُن کر باولا ہو جاتا۔ اِس
مزے میں ایک بارگی وُہ جوان آنسو بھر لایا، دُو چار قطرے بے اِختیار نکل
پڑے اور فقیر سے بُولا: اَب ہمارے تمھارے دُوستی(۹) جانی ہوئی، پس دل کا بھید

دوستوں سے چھپانا کسو مذہب میں دُرست نہیں۔ ایک بات بے تکلّف، آشنائی کے بھروسے کہتا ہوں، اگر حکم کرو، تو اپنی معشوقہ کو بُلوا کر اِس مجلس میں تسلّی اپنے دل کی کروں؛ اُس کی جُدائی سے جی نہیں لگتا۔ یہ بات ایسے اِشتیاق سے کہی کہ بغیر دیکھے بھالے فقیر کا دل بھی مُشتاق ہوا۔ میں نے کہا: مجھے تمھاری خوشی دَرکار ہے، اِس سے کیا بہتر، دیر نہ کیجیے؛ سچ ہے: معشوق بِن کچھ اچھا نہیں لگتا۔

اُس جوان نے چِلوَن کی طرف اِشارَت کی۔ وُونہیں* ایک عورت کالی کلوٹی، بھتنی سی؛ جس کے دیکھنے سے انسان بے اَجَل مرجاوے، جوان کے پاس آن بیٹھی۔ فقیر اُس کے دیکھنے سے ڈر گیا، دل میں کہا: یہی بَلا محبوبہ ایسے جَوانِ پری زاد کی ہے، جس کی اِتنی تعریف اور اِشتیاق ظاہر کیا! مَیں لاحَول پڑھ کر چُپ ہو رہا۔ اُسی عالَم میں تین دن رات مجلس شراب اور راگ رنگ کی جَمی رہی۔ چَوتھی شب کو غَلَبہ* نشے اور نیند کا ہوا، مَیں خوابِ غفلت میں بے اِختیار سو گیا۔ جب صبح ہوئی، اُس جوان نے جگایا؛ کئی پیالے خُمار شکنی کے پِلا کر، اپنی معشوقہ سے کہا: اَب زیادہ تکلیف مہمان کو دینی خوب نہیں۔

دونوں ہاتھ پکڑ کے اُٹھے۔ میں نے رُخصت مانگی، خوشی بہ خوشی اِجازت دی۔ تب میں نے جلد اپنے قدیمی کپڑے پہن لیے، اپنے گھر کی راہ لی اور اُس پری کی خدمت میں جا حاضر ہوا۔ مگر ایسا اِتّفاق کبھو نہ ہوا تھا کہ اُسے تنہا چھوڑ کر، شب باش کہیں ہوا ہوں؛ اِس تین دن کی غیر حاضری سے نہایت خَجِل ہو کر عُذر کیا اور قصّہ ضِیافت کا اور اُس کے نہ رُخصت

کرنے کا سارا عرض کیا۔ وُہ ایک دانا زمانے کی تھی، تبسّم کرکے بُولی: کیا مُضایِقہ* اگر ایک دُوست کی خاطِر رہنا ہوا، ہم نے مُعاف کیا، تیری کیا تقصیر ہے! جب آدمی کِسُو کے گھر جاتا ہے، تب اُس کی مرضی سے پھر آتا ہے۔ لیکن یہ مُفت کی مہمانیاں کھا پی کر چُپکے ہو رہو گے، یا اِس کا بدلا[1] بھی اُتارو گے؟ اَب یہ لازِم ہے کہ جاکر اُس سَوداگر بچّے کو اپنے ساتھ لے آؤ اور اُس سے دو چَند[2] ضِیافَت کرو۔ اور اَسباب کا کچھ اندیشہ نہیں، خُدا کے کرم سے ایک دَم میں سب نَوازِمہ تیّار ہو جاوِے گا اور بہ خوبی مجلس ضِیافَت کی رَونق پاوِے گی۔

فقیر مُوافِق حُکُم کے جَوہَری پاس گیا اور کہا: تمھارا فرمانا مَیں[3] تو سِر آنکھوں سے بجا لایا؛ اب تم بھی، مِہربانی کی راہ سے، میری عَرض قُبول کرو۔ اُس نے کہا: جان و دل سے حاضِر ہوں۔ تب میں نے کہا: اگر اِس بندے کے گھر تشریف لے چلو، عَین غریب نَوازی ہے۔ اُس جوان نے بہت عُذر اور حِیلے کیے، پَر میں نے پِنڈ نہ چھوڑا، جب تلک وُہ راضی ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ اُس کو اپنے مکان پر لے چلا؛ لیکن راہ میں یِہی فِکر کرتا آتا[4] تھا کہ اگر آج اپنے تئیں مَقدُور ہوتا تو ایسی تَواضُع کرتا کہ یہ بھی خوش ہوتا۔ اب مَیں اِسے لِیے جاتا ہوں، دیکھیے کیا اِتّفاق ہوتا ہے! اِسی حَیص بَیص[5] میں گھر کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے پر دھُوم دھام ہو رہی ہے، گلیارے میں جھاڑو دے کر چھِڑکاو کیا ہے، یَساوَل* اور عَصے* بَردار کھڑے ہیں۔ مَیں حَیران ہوا، لیکن اپنا گھر جان کر قدم اندر رکھا۔ دیکھا تو تمام حَوِیلی میں

فرشِ مُکلّف، لائق ہر مکان کے، جا بہ جا بچھا ہے اور مَسندیں لگیں[1] ہیں۔ پان دان، گُلاب پاش، عطردان، پیک دان، چنگیریں، نرگس دان قرینے سے دَھریں[2] ہیں۔ طاقوں[3] پر رنگترے، کَنوَلے[4]، نارنگیاں اور گُلابیاں رنگ بہ رنگ کی چُنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز ابرک کی ٹٹّیوں میں چراغاں* کی بہار ہے، ایک طرف جھاڑ اور سروکنول کے روشن ہیں اور تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمع دانوں[5] پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور جڑاؤ فانوسیں اوپر دَھری ہیں۔ سب آدمی اپنے اپنے عُہدوں پر مُستعد ہیں۔ باورچی خانے میں دیگیں ٹھنٹھنا رہیں[6] ہیں۔ آب دار خانے کی ویسی ہی تیاری ہے۔ کوری کوری ٹھلیاں روپے کی گھڑونچیوں پر، صافیوں سے بندھیں[7] اور جُھجھروں سے ڈھکی[8] رکھی ہیں۔ آگے چوکی پر ڈونگے[9]، کٹورے بہ مع[10] تھالی، سرپوش دَھرے۔ برف کے آب خورے لگ رہیں[11] ہیں اور شورے کی صُراحیاں ہِل رہی ہیں۔ غرض سب اسبابِ بادشاہانہ موجود ہے۔ اور کنچنیاں، بھانڈ، بھگتیے، کلانونت*، قوال، اچھی پوشاک پہنے، ساز[12] کے سُر ملائے حاضر ہیں۔

فقیر نے اُس جوان کو لے جا کر مَسند پر بٹھایا اور دل میں حیران تھا کہ یا الٰہی! اتنے عرصے میں یہ سب تیاری کیوں کر ہوئی! ہر طرف دیکھتا پھرتا تھا لیکن اُس پری کا نشان کہیں نہ پایا۔ اِسی جُستجو میں ایک مرتبہ باورچی خانے کی طرف جا نکلا۔ دیکھتا ہوں تو وُہ نازنیں ایک مکان میں گلے میں کُرتی، پانوں میں تہ پوشی، سر پر سفید رومالی اوڑھے[13] ہوئے، سادی خُوزادی[14] بن گہنے پاتے بنی[15] ہوئی،

(نہیں مُحتاج زیور کا" جسے خوبی خُدا نے دی
کہ جیسے خوش نُما لگتا ہے دیکھو، چاند بِن گہنے)[1]

خبر گیری میں ضیافت کی لگ رہی ہے اور تاکید ہر ایک کھانے کی کر رہی ہے کہ خبردار! بامزہ ہو اور آب و نمک، بُو باس دُرُست رہے۔ اِس محنت سے وُہ گُلاب سا بدن سارا پسینے پسینے ہو رہا ہے۔ مَیں پاس جا کر تصدّق ہوا اور اِس شعور و لیاقت کو سَراہ کر دُعائیں دینے لگا۔ یہ خوشامد سُن کر، تیوری چڑھا کر بولی: آدمی سے ایسے[2] ایسے کام ہوتے ہیں کہ فرشتے کی مجال نہیں۔ میں نے ایسا کیا کیا ہے جو تُو اِتنا حَیران ہو رہا ہے؟ بس، بہت باتیں بنا نہیں مجھے خوش نہیں آتیں۔ بھلا کہہ تو، یہ کون آدمیت[3] ہے کہ مہمان کو اکیلا بِٹھا کر اِدھر اُدھر پَڑے پِھرے! وُہ اپنے جی میں کیا کہتا ہوگا! جلد جا، مجلس میں بیٹھ کر مہمان کی خاطر داری کر اور اُس کی معشوقہ کو بھی بُلوا کر اُس کے پاس بِٹھلا۔ فقیر دَو نہیں اُس جوان کے پاس گیا اور گرم جوشی کرنے لگا۔ اِتنے میں دُو غُلام صاحبِ[7] جمال صُراحی اور جام جَڑاؤ ہاتھ میں لیے رُو بہ رُو آئے، شراب پِلانے لگے۔ اِس میں میں نے اُس جوان سے کہا: مَیں سب طَرح مُخلص اور خادِم ہوں؛ بہتر یہ ہے کہ وُہ صاحبِ[8] جمال، کہ جس کی طرف دل صاحب کا مائل ہے، تشریف لاوے تو بڑی بات ہے۔ اگر فرماؤ تو آدمی بُلانے کی خاطر جاوے۔ یہ سُنتے ہی خوش ہو کر بولا: بہت اچھا، اِس وقت تم نے میرے دل کی بات کہی۔ میں نے ایک خوجے کو بھیجا۔ جب آدھی رات گئی، وُہ چُڑَیل خاصّے چَوڈول پر سوار ہو کر بَلائے ناگہانی سی آپہنچی۔

فقیر نے لاچار خاطر سے مہمان کی اِستقبال کر کر، نہایت تپاک سے برابر اُس جوان کے لا بٹھایا۔ جوان اُس کے دیکھتے ہی ایسا خوش ہوا جیسے دُنیا کی نعمت ملی۔ وُہ بھتنی بھی اُس جوانِ پری زاد کے گلے لپٹ گئی۔ سچ مچ یہ تماشا ہُوا جیسے چودھویں رات کے چاند کو گہن لگتا ہے۔ جتنے مجلس میں آدمی تھے، اپنی اپنی اُنگلیاں دانتوں میں دابنے لگے کہ کیا کوئی بلا اِس جوان پر مُسلّط ہوئی! سب کی نگاہ اُسی طرف تھی۔ تماشا مجلس کا بھول کر، اُس کا تماشا دیکھنے لگے۔ ایک شخص کنارے سے بُولا: یارو! عشق اور عقل میں ضِدّ ہے۔ جو کچھ عقل میں نہ آدے، یہ کافر عشق کر دِکھادے۔ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھو۔ سبھوں نے کہا: آمنّا، یہی بات ہے۔

یہ فقیر بہ موجِب حُکم کے مہمان داری میں حاضر تھا۔ ہر چند جوان ہم پیالہ، ہم نوالہ ہونے کو مُجوّز ہوتا تھا؛ پر میں ہرگز، اُس پری کے خوف کے مارے، اپنا دِل کھانے پینے یا سیر تماشے کی طرف رجوع نہ کرتا تھا اور عُذر مہمان داری کا کر کے، اُس کے شامل نہ ہوتا۔ اِسی کیفیت (٦) سے تین شبانہ روز گزرے۔ چوتھی رات وُہ جوان نہایت جوشش سے مجھے بُلا کر کہنے لگا: اَب ہم بھی رُخصت ہوں گے، تمھاری خاطر اپنا سب کاروبار چھوڑ چھاڑ کر، تین دِن سے تمھاری خدمت میں حاضر ہیں؛ تم بھی تو ہمارے پاس ایک دَم بیٹھ کر ہمارا دل خوش کرو۔ میں نے اپنے جی میں خیال کیا: اگر اِس وقت کہنا اِس کا نہیں مانتا، تو آزردہ* ہوگا؛ پس نئے دوست اور مہمان کی خاطر رکھنی ضرور ہے، تب یہ کہا: صاحب کا حُکم بجا لانا منظور کہ اَلْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَب۔ سُنتے ہی اِس کو، جوان نے پیالہ تواضع کیا

اور میں نے پی لیا۔ پھر تو ایسا یہ ہم دَور چلا کہ تھوڑی دیر میں سب آدمی مجلس کے کیفی ہو کر بے خبر ہو گئے اور میںؔ بھی بے ہوش ہو گیا۔

جب صبح ہوئی اور آفتاب دو نیزے بلند ہوا، تب میری آنکھ کھلی، تو دیکھا میں نے نہ وہ تیاری ہے، نہ وہ مجلس، نہ وہ پری؛ فقط خالی حویلی پڑی ہے؛ مگر ایک کونے میں کمَلؔ لپٹا ہوا دھرا ہے۔ جو اُس کو کھول کر دیکھا تو وہ جوان اور اُس کی رنڈی، دونوں سر کٹے پڑے ہیں۔ یہ حالت دیکھتے ہی حواسؔ جاتے رہے۔ عقل کچھ کام نہیں کرتی کہ یہ کیا تھا اور کیا ہوا! حیرانی سے ہر طرف تک رہا تھا، اتنے میں ایک خواجہ سرا (جسے ضیافت کے کام کاج میں دیکھا تھا) نظر پڑا۔ فقیر کو اُس کے دیکھنے سے کچھ تسلی ہوئی، احوال اِس وارداتؔ کا پوچھا۔ اُس نے جواب دیا: تجھے اِس بات کے تحقیقؔ کرنے سے کیا حاصلؔ جو تو پوچھتا ہے؟ میں نے بھی اپنے دل میں غور کی کہ سچ تو کہتا ہے۔ پھر ایکؔ ذرا تامل کر کے میں بولا: خیر نہ کہو، بھلا یہ تو بتاؤ وہ معشوقہ کس مکان میں ہے؟ تب اُس نے کہا: البتہ جو میں جانتا ہوں، سو کہہ دوں گا؛ لیکن تجھ سا آدمی عقل مند، بے مرضی حضور کے، دو دن کی دوستی پر بے محابا بے تکلف ہو کر صحبت مے نوشی کی باہم گرم کرے، یہ کیا معنے رکھتا ہے!

فقیر اپنی حرکت اور اُس کی نصیحت سے بہت نادمؔ ہوا، سوائے اِسؔ بات کے زبان سے کچھ نہ نکلا: فی الحقیقت اب تو تقصیر ہوئی، معاف کیجیے۔ بارے، محلّیؔ نے مہربان ہو کر اُس پری کے مکان کا نشان بتایا اور مجھے

رُخصت کیا؛ آپ اُن دونوں زخمیوں کے گاڑنے دابنے کی فکر میں رہا۔ مَیں تُہمَت سے اُس فَساد کی[۴] الگ ہُوا اور اِشتِیاق میں اُس پری کے ملنے کے لیے، گھبرایا ہوا، گرتا پڑتا، ڈھونڈھتا، شام کے وقت اُس کوچے میں اُسی پتے پر جا پہنچا اور نزدیک دروازے کے ایک گوشے میں ساری رات تلملاتے کٹی۔ کِسُو کی آمد و رَفت کی آہٹ نہ ملی اور کوئی اَحوال پُرساں میرا نہ ہوا۔ اُسی بے کسی کی حالت میں صبح ہوگئی۔ جب سورج نکلا، اُس مکان کے بالاخانے کی ایک کھڑکی سے وہ ماہ رُو میری طرف دیکھنے لگی۔ اُس وقت عالم خوشی کا جو مجھ پر گزرا، دل ہی جانتا ہے، شُکر خُدا کا کیا۔

اِتنے میں ایک خُوجے نے میرے پاس آکر کہا: اُس مسجد میں تو جا کر بیٹھ، شاید تیرا مطلب اُس جگہ بَرآوے اور اپنے دل کی مُراد پاوے۔ فقیر، فرمانے سے اُس کے، وہاں سے اُٹھ کر اُسی مسجد میں جا رہا؛ لیکن آنکھیں دروازے کی طرف لگ رہیں[۳] تھیں کہ دیکھیے پردۂ غَیب سے کیا ظاہِر ہوتا ہے! تمام دن جیسے رُوزہ دار شام ہونے کا اِنتِظار کھینچتا ہے، میں نے بھی وہ[۳] رُوز ویسی ہی بے قَراری میں کاٹا۔ بارے جس تِس طَرح سے شام ہوئی اور دن پہاڑ سا چھاتی پر سے ٹَلا؛ ایک بارگی وُہی خواجہ سَرا (جن نے اُس پَری کے مکان کا پتا دیا[۴] تھا) مسجد میں آیا۔ بعد فَراغَت[۵] نمازِ مَغرِب کے، میرے پاس آکر اُس شفیق نے (کہ سب راز و نیاز کا مَحرَم تھا) نہایَت تَسلّی دے کر ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے چلا۔ رَفتہ رَفتہ ایک باغیچے[۶] میں مجھے بِٹھا کر کہا: یہاں رہو، جب تلک تمھاری آرزو بَر آوے اور آپ رُخصت ہو کر، شاید میری حقیقت حُضور میں

کہنے گیا۔ مَیں اُس باغ کے پھولوں کی بہار اور چاندنی کا عالَم اور حَوض، نہروں میں فُوّارے، ساوَن بھادوں کے اُچھلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا؛ لیکن جب پھولوں کو دیکھتا، تب اُس گُل بدن کا خیال آتا۔ جب چاند پر نَظَر پڑتی، تب اُس مَہ رُو کا مُکھڑا یاد کرتا۔ یہ سب بہار اُس کے بَغَیر میری آنکھوں میں خار تھی۔

بارے خُدا نے اُس کے دل کو مہربان کیا۔ ایک دم کے بعد وُہ پری دروازے سے، جیسے چَودھویں رات کا چاند، بَناو کیے؛ گلے میں پِشْواز(۱) باڈلے(۲) کی سنجاف* کی، مُوتیوں کا دَر دامن ٹکا ہوا اور سِر پر اُوڑھنی؛ جس میں آنچل پَلّو، لَہر، گوکھرو لگا ہوا؛ سِر سے پانو تک مُوتیوں میں جڑی، رَوِش پر آکر کھڑی ہوئی۔ اُس کے آنے سے تَرو تازگی(۳) نئے سِرے اُس باغ کو اور اِس فقیر کے دل کو ہو گئی۔ ایک دم اِدھر اُدھر سَیر کر کر، شَہ نَشین(۴) میں مُغرَّق مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھی۔ مَیں دَوڑ کر پروانے کی طَرح (جیسے شَمع(۵) کے گِرد پھرتا ہے) تَصَدُّق ہوا اور غُلام(۶) کی مانند دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا(۷) ہوا۔ اِس میں وُہ خُوجہ میری خاطر بہ طَور سِفارِش* کے عرض کرنے لگا۔ میں نے اُس مَحَلّی(۸) سے کہا: بندہ گُنہ گار، تقصیر وار ہے؛ جو کچھ سزا میرے لائق ٹھہرے، سُو ہو۔ وُہ پَری اَزبس کہ ناخوش تھی، بد دِماغی سے بُولی کہ اَب اِس کے حق(۹) میں یِہی بھلا ہے کہ سَو توڑے اَشَرفی کے لیوے، اپنا اَسباب دُرُست کرکے وَطَن کو سِدھارے۔

مَیں یِہ بات سُنتے ہی کاٹھ ہو گیا اور سُوکھ گیا کہ اگر کوئی میرے بدن کو کاٹے، تو ایک بوُند لُہو کی نہ نکلے اور تمام دُنیا آنکھوں کے آگے اَندھیری لگنے لگی اور ایک آہ نامُرادی کی بے اِختیار جگر سے نکلی، آنسو بھی ٹپکنے لگے۔ سِوائے خُدا کے

اُس وقت کسو کی توقّع نہ رہی، مایوسِ محض ہو کر اِتنا بولا: بھلا ٹک اپنے دل میں غور فرمائیے اگر مجھ کم نصیب کو دُنیا کا لالچ ہوتا، تو اپنا جان و مال حضور میں نہ کھوتا۔ کیا ایک بارگی حق خدمت گزاری اور جاں نثاری کا عالم سے اُٹھ گیا، جو مجھ سے کم بخت پر اِتنی بے مِہری فرمائی! خیر، اب میرے تئیں بھی زندگی سے کچھ کام نہیں۔ معشوقوں کی بے وفائی سے بے چارے عاشقِ نیم جاں کا نِباہ نہیں ہوتا۔

یہ سُن کر تیکھی ہو، تیوری چڑھا کر خفگی* سے بولی: چہ خوش! آپ ہمارے عاشق ہیں! مینڈکی کو بھی زکام ہوا! اَے بے وُقوف! اپنے حوصلے سے زیادہ باتیں بنانیں (۲) خیالِ خام ہے۔ چھوٹا منہ، بڑی بات! بس چُپ رہ، یہ نکمّی بات چیت مت کر۔ اگر کسی اَور نے یہ حرکتِ (۳) بے معنی کی ہوتی؛ پروردگار کی سوں، اُس کی بوٹیاں کٹوا چیلوں کو بانٹتی۔ پَر کیا کروں، تیری خدمت یاد آتی ہے۔ اب اِسی میں بھلائی ہے کہ اپنی راہ لے۔ تیری قسمت کا (۴) دانا پانی ہماری سرکار میں یہیں تلک تھا۔ پھر میں نے روتے بسورتے کہا: اگر میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ اپنے دل کے مقصد کو نہ پہنچوں اور جنگل پہاڑ میں سر ٹکراتا پھروں، تو لاچار ہوں۔ اِس بات سے بھی دِق (۵) ہو کہنے لگی: میرے تئیں یے (۶) پھساہندے چوچلے اور رمز کی باتیں پسند نہیں آتیں۔ اِس (۷) اِشارے کی گفتگو کے جو لائق ہو، اُس سے جا کر کر۔ پھر اُسی خفگی کے عالم میں اُٹھ کر اپنے دولت خانے کو چلی۔ مَیں نے بہتیرا* سر پٹکا، متوجّہ نہ ہوئی۔ لاچار میں بھی اُس مکان سے اُداس اور نااُمید ہو کر نکلا۔

غَرَض[1] چالیس دن تک یہی نَوبَت رہی۔ جب شہر کی کوچہ گردی سے اُکتاتا، جنگل میں نکل جاتا۔ جب وہاں سے گھبراتا، پھر شہر کی گلیوں میں دیوانہ سا آتا۔ نہ دِن کو کھاتا، نہ رات کو سوتا[2]؛ جیسے دُھوبی کا کُتّا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ زِندگی انسان کی کھانے پینے سے ہے، آدمی اَناج کا کیڑا ہے؛ طاقت بدن میں مُطلَق نہ رہی، اَپاہَج ہوکر اُسی مسجد کی دیوار کے تلے جا پڑا؛ کہ ایک رُوز وُہی خواجہ سَرا جُمعے کی نماز پڑھنے آیا، میرے پاس سے ہوکر چلا۔ مَیں یہ شعر آہستہ ناطاقتی سے پڑھ رہا تھا[3]:

اِس دردِ دل سے مَوت ہو، یا دل کو تاب ہو
قسمت میں جو لکھا ہو، اِلٰہی! شِتاب ہو[4]

اگرچہ ظاہِر میں صورت میری بِالکُل[5] تبدیل ہوگئی تھی؛ چہرے کی یہ شکل بنی تھی کہ جن نے مجھے پہلے دیکھا تھا، وُہ بھی نہ پہچان سکتا کہ یہ وُہی آدمی ہے؛ لیکن وُہ مَحَلّی[6] آواز درد کی سُن کر مُتَوَجّہ ہوا۔ میرے تَئیں بہ غَور[7] دیکھ کر افسوس کیا اور شَفقَت سے مُخاطِب ہوا کہ آخر یہ حالت اپنی پہنچائی! میں نے کہا: اَب تُو جو ہُوا سو ہُوا۔ مال سے بھی حاضِر تھا، جان بھی تَصَدُّق کی؛ اُس کی خوشی یوں ہی ہوئی، تو کیا کروں! یہ سُن کر، ایک خدمت گار میرے پاس چھوڑ کر مسجد میں گیا۔ نماز اور خُطبے سے فَراغَت کر کر جب باہَر نکلا؛ فقیر کو ایک میانے[8] میں ڈال کر، اپنے ساتھ خدمت میں اُس پَری[9] بے پروا کی لے جاکر چِق کے باہَر بِٹھایا[10]۔ اگرچہ میری رُؤیَت[11] کچھ باقی نہ رہی تھی، پَر مُدّت تلک شب و رُوز اُس پری کے پاس اِتّفاق رہنے کا ہوا تھا؛ جان بوجھ کر بے گانی ہوکر خوجے[12] سے پوچھنے لگی:

یہ کون ہے؟ اُس مردِ آدمی نے کہا: یہ وُہی کم بخت، بدنصیب ہے جو حضور کی خفگی اور عتاب میں پڑا تھا؛ اُسی سبب سے اِس کی یہ صورت بنی ہے۔ عشق کی آگ سے جلا جاتا ہے۔ ہر چند آنسوؤں کے پانی سے بجھاتا ہے؛ پَر وہ دُونی بھڑکتی ہے، کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ عَلاوہ، اپنی تقصیر کی خجالت سے مُوا جاتا ہے۔

پری نے ٹھٹھولی سے فرمایا: کیُوں جھوٹھ بکتا ہے! بہت دِن ہوئے اُس کی خبر وَطن پہنچنے کی مجھے خبرداروں نے دی ہے، وَاللہُ اَعْلَم یہ کون ہے اور تو کس کا ذِکر کرتا ہے! اُس دم خواجہ سرا نے ہاتھ جوڑ کر اِلتماس کیا: اگر جان کی اَمان پاؤں، تو عَرض کروں۔ فرمایا: کہہ، تیری جان تجھے بخشی۔ خوجا بولا: آپ کی ذات قدردان ہے؛ واسطے خُدا کے چلوَن کو درمیان سے اُٹھوا کر پہچانیے اور اِس کی بے کسی کی حالت پر رَحم کیجیے، ناحق شناسی خوب نہیں۔ اب اِس کے اَحوال پر جو کچھ تَرس کھائیے، بجا ہے اور جائے ثواب ہے، آگے حدِّ اَدَب؛ جو مزاجِ مُبارَک میں آوے، سُو ہی بہتر ہے۔

اِتنے کہنے پر مُسکرا کر فرمایا: بھلا کوئی ہو، اِسے دارُالشِّفا میں رکھو؛ جب بھلا چنگا ہوگا، تب اِس کے اَحوال کی پُرسش کی جائے گی۔ خوجے نے کہا: اگر اپنے دستِ خاص سے گُلاب اِس پر چھڑکیے اور زَبان سے کچھ فرمائیے، تو اِس کو اپنے جینے کا بھروسا بندھے۔ نااُمّیدی بُری چیز ہے، دُنیا بہ اُمّید قائم ہے۔ اِس پر بھی اُس پری نے کچھ نہ کہا۔ یہ سوال جواب سُن کر مَیں بھی اپنے جی سے اُکتا رہا تھا، نِدھڑک بُول اُٹھا کہ اب اِس طَور کی زِندگی کو دل نہیں

چاہتا، پانو تو گور میں لٹکا چکا ہوں، ایک رُوز مرنا ہے؛ اور علاج میرا بادشاہ زادی کے ہاتھ میں ہے، کریں یا نہ کریں، وُو جانیں۔

بارے مُقلِّبُ القلوب نے اُس سنگ دل کے دل کو نرم کیا، مہربان ہوکر فرمایا: جلد بادشاہی حکیموں کو حاضر کرو۔ وُونہیں طبیب آکر جمع ہوئے، نبض، قارورہ دیکھ کر بہت غور کی۔ آخر ش تشخیص میں ٹھہرا کہ یہ شخص کہیں عاشق ہوا ہے؛ سوائے وصلِ معشوق کے اِس کا کچھ علاج نہیں۔ جس وقت وُہ ملے، یہ صحت پاوے۔ جب حکیموں کی بھی زبانی یہی مرض میرا ثابت ہوا، حکم کیا: اِس جوان کو گرمابے میں لے جاؤ؛ نہلا کر، خاصی پوشاک پہنا کر حضور میں لے آؤ۔ وُونہیں مجھے باہر لے گئے۔ حمّام کروا، اچھے کپڑے پہنا، خدمت میں پری کی حاضر کیا۔ تب وُہ نازنین تپاک سے بولی: تو نے مجھے بیٹھے بٹھائے ناحق بدنام اور رُسوا کیا، اب اور کیا کیا چاہتا ہے؟ جو تیرے دل میں ہے، صاف صاف بیان کر۔

یا فقرا! اُس وقت یہ عالم ہوا کہ شادی مرگ ہو جاؤں۔ خوشی کے مارے ایسا پھولا کہ جامے میں نہ سماتا تھا اور صورت شکل بدل گئی۔ شکر خدا کا کیا اور اُس سے کہا: اِس دم ساری حکیمی آپ پر ختم ہوئی کہ مجھ سے مُردے کو ایک بات میں زندہ کیا۔ دیکھو تو اُس وقت سے اِس وقت تک میرے احوال میں کیا فرق ہو گیا! یہ کہ کر، تین بار گرد پھرا اور سامنے آکر کھڑا ہوا اور کہا: حضور سے یوں حکم ہوتا ہے کہ جو تیرے جی میں ہو، سو کہ؛ بندے کو ہفت اِقلیم کی سلطنت سے زیادہ یہ ہے کہ غریب نوازی کر کر اِس عاجز کو قبول کیجیے اور

اپنی قَدَم بُوسی سے سَرفَرازی دیجیے۔ ایک لمحہ تو سُن کر غُوطے میں گئی، پھر کَن اَنکھیوں (۱) سے دیکھ کر کہا: بیٹھو، تم نے خِدمت اور وَفاداری ایسی ہی کی ہے؛ جو کچھ کہو، سو پھَبے ہے اور اپنے بھی دل پر نَقش ہے؛ خَیر، ہم نے قبُول کیا۔

اُسی دن اچھّی ساعت، شُبھ لگن میں چُپکے چُپکے قاضی نے نکاح پڑھ دیا۔ بعد اِتنی محنت اور آفت کے خُدا نے یہ دن دِکھایا کہ میں نے اپنے دل کا مُدّعا پایا؛ لیکن جیسی دل میں آرزو اُس پری سے ہَم بِستر ہونے کی تھی، ویسی ہی جی میں بے کلی اُس وارِداتِ عجیب کے معلوم کرنے کی تھی، کہ آج تک میں نے کچھ نہ سمجھا کہ یہ پری کون ہے؟ اور وُہ حَبشی سانولا، سجیلا (جس نے ایک پُرزے کاغذ پر اِتنی اَشرَفیوں کے بَدلے میرے حوالے کیے) کون تھا؟ اور تیّاری ضِیافت کی بادشاہوں کے لائق ایک پَہَر میں کیوں کر ہوئی؟ اور وِے (۵) دونوں بے گُناہ اُس مجلس میں کس لیے مارے گئے؟ اور سبب خَفگی اور بے مُرَوّتی کا، باوُجُود خِدمت گُزاری اور ناز بَرداری کے، مجھ پر کیا ہوا؟ اور پھر ایک بارگی اِس عاجز کو یوں سَربَلند کیا! غَرَض اِسی واسطے بعد رَسم رُسُوماتِ عَقد کے، آٹھ دن تلک، باوَصفِ اِس اِشتیاق کے قَصدِ مُباشَرَت کا نہ کیا۔ رات کو ساتھ سُوتا، دن کو یوں ہیں اُٹھ کھڑا ہوتا۔

ایک دن غُسل کرنے کے لیے میں نے خَواص کو کہا کہ تھوڑا پانی گرم کر دے تو نہاؤں۔ مَلکہ مُسکرا کر بولی: کس بِرتے پر تَتّا پانی؟ مَیں خاموش ہو رہا؛ لیکن وُہ پری میری حرکت سے حَیران ہوئی، بلکہ چہرے پر آثار خَفگی کے نمُود ہوئے۔ یہاں تلک کہ ایک رُوز بولی: تم بھی عَجَب آدمی ہو! یا اُتنے گرم،

یا ایسے ٹھنڈے! اِس کو کیا کہتے ہیں؟ اگر تم میں قوّت نہ تھی، تو کیوں ایسی کچّی ہَوَس پکائی! اُس وقت میں نے بے دَھڑَک ہوکر کہا: اَے جانی! مُنصِفی شرط ہے، آدمی کو چاہیے کہ اِنصاف سے نہ چوُکے۔ بُولی: اَب کیا اِنصاف رہ گیا ہے؟ جو کچھ ہونا تھا، سُو ہوچکا۔ فقیر نے کہا: واقعی بڑی آرزو اور مُراد میری یِہی تھی، سُو مجھے ملی؛ لیکن دل میرا دُبدِھے[۱] میں ہے اور دُودِلے آدمی کی خاطِر پَرِیشان رہتی ہے، اُس سے کچھ ہو نہیں سکتا، اِنسانیت سے خارِج ہوجاتا ہے۔ میں نے اپنے دل میں یِہ قَول کیا تھا کہ بعد اِس نکاح کے (کہ عَین دل کی شادی ہے) بعضی بعضی باتیں (جو خیال میں نہیں آتیں اور نہیں کُھلتیں) حُضور میں پوچھوں گا کہ زُبانِ مُبارَک سے اُس کا بیان سُنوں، تو جی کو تسکین ہو۔ اُس پری نے چِیں بہ جَبِیں ہوکر کہا: کیا خوب! ابھی سے بھول گئے! یاد کرو، بارْہا ہم نے کہا ہے کہ ہمارے کام میں ہرگز دَخل نہ کیجو[۲] اور کسی بات کے مُتَعَرِض نہ ہوجو[۳]؛ خلافِ مَعمُول یِہ بے اَدَبی کرنی کیا لازِم ہے! فقیر نے ہَنس کر کہا: جیسی[۵] اَور بے اَدَبیاں مُعاف کرنے کا حُکم ہے، ایک یِہ بھی سہی۔ وُہ پری نظریں بدل کر، تیہے میں آکر، آگ کا بگولا بن گئی اور بُولی: اَب تو بہت سر چڑھا؛ جا اپنا کام کر، اِن باتوں سے تجھے کیا فائدہ ہوگا؟ میں نے کہا: دُنیا میں اپنے بدن کی شرم سب سے زِیادہ ہوتی ہے، لیکن ایک دوسرے کا واقِف کار ہوتا ہے؛ پس جب ایسی چیز دل پر رَوا رکھی، تو اَور کون سا بِھید چھپانے کے لائق ہے؟

میری اِس رَمز کو وُہ پری[۶] وُقوف سے دریافت کرکر کہنے لگی: یِہ بات

سچ ہے، پَر جی میں یہ سوچ آتا ہے کہ اگر مجھ نگوڑی کا راز فاش ہو، تو بڑی قیامت ہے مجھے۔ مَیں بولا: یہ کیا مذکور ہے! بندے کی طرف سے یہ خیال دل میں نہ لاؤ اور خوشی سے، ساری کیفیت[1] جو بیتی ہے، فرماؤ۔ ہرگز ہرگز مَیں دل سے زُبان تک نہ لاؤں گا، کسو کے کان پڑنا کیا اِمکان ہے۔ جب اُس نے دیکھا کہ اَب سِوائے کہنے کے اِس عزیز سے چھٹکارا نہیں، لاچار ہوکر بولی: اِن باتوں کے کہنے میں بہت سی خرابیاں ہیں، تو خواہ نخواہ دَرپے ہوا۔ خَیر تیری خاطر عزیز ہے، اِس لیے اپنی سَرگُذشت بیان کرتی ہوں؛ تجھے بھی اِس کا پوشیدہ رکھنا ضرور ہے، خبر شرط[2]!

غَرَض بہت سی تاکید کر کر کہنے لگی کہ مَیں بَدبَخت مُلکِ دَمِشق کے سلطان کی بیٹی ہوں اور وہ سَلاطِینوں سے بڑا بادشاہ ہے۔ سِوائے میرے، کوئی لڑکا بالا اُس کے یہاں نہیں ہوا۔ جس دن سے مَیں پیدا ہوئی، ما[3] باپ کے سایے میں ناز و نعمت اور خوشی خُرّمی سے پَلی۔ جب ہوش آیا، تب اپنے دل کو خوب صورتوں اور نازنینوں کے ساتھ لگایا؛ چُناں چہ سُتھری سُتھری[4] پری زاد ہمجولی اُمَرازادیاں مُصاحبَت[*] میں اور اچھی اچھی قبول صورت ہم عُمر خواصیں[5]، سہیلیاں خدمت میں رہتی[6] تھیں۔ تماشا ناچ[7] اور راگ رنگ کا ہمیشہ دیکھا کرتی۔ دُنیا کے بھلے بُرے سے کچھ سَروکار نہ تھا۔ اپنی بے فِکری کے عالَم کو دیکھ کر، سِوائے خُدا کے شُکر کے کچھ مُنہ سے نہ نکلتا تھا۔

اِتّفاقاً طبیعت خود بہ خود ایسی بے مزہ ہوئی کہ نہ مُصاحبَت کسو کی بھاوے، نہ مجلس خوشی کی خوش آوے۔ سَودائی سا مزاج[8] ہوگیا، دل

اُداس اور حیران۔ نہ کسو کی صورت اچھی لگے، نہ بات کہنے سُننے کو جی چاہے۔ میری یہ حالت دیکھ کر دائی، دَدا، چھوچھو، اَنگا؛ سب کی سب مُتفکّر ہوئیں اور قدم پر گرنے لگیں۔ یہی خواجہ سرا نمک حلال قدیم سے میرا مَحرَم اور ہَم راز ہے، اِس سے کوئی بات مخفی نہیں؛ میری وَحشت دیکھ کر بولا: اگر بادشاہ زادی تھوڑا سا شربت وَرَقُ الخیال کا نُوشِ جاں فرماویں، تو اَغلَب ہے کہ طبیعت بحال ہو جاوے اور فرحت مزاج میں آوے۔ اِس کے اِس طرح کے کہنے سے مجھے بھی شوق ہوا، تب میں نے فرمایا: جلد حاضر کر۔ مَحلی باہر گیا؛ ایک صُراحی اُسی شربت کی تکلُّف سے بنا کر، بَرف میں لگا کر، لڑکے کے ہاتھ لِوا کر آیا۔ میں نے پیا۔ جو کچھ اُس کا فائدہ بیان کیا تھا، وَیسا ہی دیکھا۔ اُس وقت اِس خدمت کے اِنعام میں ایک بھاری خِلعَت خوجے کو عنایت کی اور حُکم کیا کہ ایک صُراحی ہمیشہ بِلا ناغہ اِسی وقت حاضر کیا کر۔

اُس دن سے یہ مقرر ہوا کہ خواجہ سرا صُراحی اُسی چھوکرے کے ہاتھ لِوا لاوے اور بندی پی جاوے۔ جب اُس کا نَشہ طلوع ہوتا، تو اُس کی لہر میں اُس لڑکے سے ٹھٹھا، مزاخ کر کر دل بہلاتی تھی۔ وُہ بھی جب ڈھیٹھ ہوا، تب اچھی اچھی، میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا اور اَچنبھے کی نقلیں لانے، بلکہ آہ اَوہی بھی بھرنے اور سِسکیاں لینے۔ صورت تو اُس کی طرح دار، لائق دیکھنے کے تھی؛ بے اِختیار جی چاہنے لگا۔ مَیں دل کے شوق سے اور اَٹھکھیلیوں کے ذَوق سے ہر رُوز اِنعام، بخشش دینے لگی؛ پَر

وہ کم بخت ویسے کپڑوں سے (جیسے ہمیشہ پہنے رہتا تھا) حضور میں آتا، بلکہ وہ لباس بھی میلا کچیلا ہوجاتا۔ ایک دن پوچھا: تجھے سرکار سے اِتنا کچھ مِلا، پر تو نے اپنی صورت ویسی کی ویسی ہی پریشان بنا رکھی، کیا سبب ہے؟ وے روپے کہاں خرچ کیے، یا جمع کر رکھے؟

لڑکے نے یہ خاطر داری کی باتیں جو سنیں اور مجھے اپنا احوال پُرساں پایا، آنسو ڈبڈبا کر کہنے لگا: جو کچھ آپ نے اِس غلام کو عنایت کیا، سب اُستاد نے لے لیا، مجھے ایک پیسا نہیں دیا۔ کہاں سے دوسرے کپڑے بناؤں، جو پہن کر حضور میں آؤں۔ اِس میں میری تقصیر نہیں، مَیں لاچار ہوں۔ اِس غریبی کے کہنے پر اُس کے ترس آیا، وونہیں خواجہ سرا کو فرمایا: آج سے اِس لڑکے کو اپنی صحبت میں تربیت کر اور لباس اچھا تیار کروا کر پہنا اور لونڈوں میں بے فائدہ کھیلنے کودنے نہ دے؛ بلکہ اپنی خوشی یہ ہے کہ آداب لائق حضور کی خدمت کے سیکھے اور حاضر رہے۔ خواجہ سرا موافق فرمانے کے بجالایا اور میری مرضی جو اُدھر دیکھی، نہایت اُس کی خبرگیری کرنے لگا۔ تھوڑے دنوں میں، فراغت اور خوش خوری کے سبب سے، اُس کا رنگ رَدغن کچھ کا کچھ ہوگیا اور کینچلی سی ڈال دی۔ میں اپنے دل کو ہرچند سنبھالتی، پر اُس کافر کی صورت جی میں ایسی کھب گئی تھی، یہی جی چاہتا تھا کہ مارے پیار کے اُسے کلیجے میں ڈال رکھوں اور اپنی آنکھوں سے ایک پل جدا نہ کروں۔ آخر اُس کو مصاحبت میں داخل کیا، اور خلعتیں طرح بہ طرح کی اور جواہر رنگ بہ رنگ کے پہنا کر دیکھا کرتی۔ بارے اُس کے نزدیک

رہنے سے آنکھوں کو سکھ، کلیجے کو ٹھنڈک[۱] ہوئی۔ ہر دم اُس کی خاطرداری کرتی۔ آخر کو میری یہ حالت پہنچی کہ اگر ایک دم کچھ ضروری کام کو میرے سامنے[۲] سے[۳] جاتا، تو چین نہ آتا۔

بعد کئی برس کے وہ بالغ ہوا، مسیں بھیگنے لگیں، چھب تختی دُرست ہوئی؛ تب اُس کا چرچا باہر درباریوں میں ہونے لگا۔ دربان اور رَوَتے، میوڑے*، باری دار اور یساول، چوبدار اُس کو محل[۴] کے اندر آنے جانے سے منع کرنے لگے۔ آخر اُس کا آنا موقوف ہوا۔ مجھے تو اُس بغیر کل نہ پڑتی تھی، ایک دم پہاڑ تھا؛ جب یہ احوال نااُمیدی کا سنا، ایسی بدحواس[۵] ہو گئی گویا مجھ پر قیامت ٹوٹی اور یہ حالت ہوئی کہ نہ کچھ کہہ سکتی ہوں، نہ اُس بن رہ سکتی ہوں۔ کچھ بس نہیں چل سکتا، الٰہی کیا کروں! عجب طرح کا قلق ہوا۔ مارے بےقراری کے اُسی محلّی[۶] کو (جو میرا بھیدو تھا) بُلا کر کہا کہ مجھے غور اور پرداخت اِس لڑکے کی منظور ہے؛ بالفعل صلاحِ وقت یہ ہے کہ ہزار اشرفی پونجی دے کر، چوک کے چوراہے میں دُکان[۷] جوہری کی کروادو؛ تو تجارت کر کے، اُس کے نفع سے اپنی گزران فراغت سے کیا کرے۔ اور میرے محل[۸] کے قریب ایک حویلی اچھے نقشے کی، رہنے کے لیے بنوادو۔ لونڈی غلام، نوکر چاکر جو ضرور ہوں؛ مول لے کر اور درماہا[۹] مقرر کر کر اُس پاس[۱۰] رکھوادو کہ کسو طرح بےآرام نہ ہو۔ خواجہ سرا نے اُس کی بود و باش کی اور جوہری پنے اور تجارت کی سب تیاری کر دی۔ تھوڑے عرصے میں اُس کی دُکان[۱۱] ایسی چمکی اور نمود ہوئی کہ جو خلعتیں فاخرہ اور جواہر[۱۲] بیش قیمت،

سرکار میں بادشاہ کی اور امیروں کی درکار و مطلوب ہوتے، اُسی کے یہاں بہم
پہنچتے۔ آہستہ آہستہ یہ دُکان جمی کہ جو تحفہ ہر ایک مُلک کا چاہیے، وہیں ملے۔
سب جوہریوں کا رُوزگار اُس کے آگے مندا ہو گیا۔ غرض اُس شہر میں کوئی
برابری اُس کی نہ کر سکتا، بلکہ کسی مُلک میں ویسا کوئی نہ تھا۔

اِسی کاروبار میں اُس نے تو لاکھوں روپے کمائے، پر جُدائی اُس کی
رُوز بہ رُوز نقصان میرے تن بدن کا کرنے لگی۔ کوئی تدبیر نہ بن آئی کہ اُس کو
دیکھ کر اپنے دل کی تسلی کروں۔ نِدان صلاح کی خاطر اُسی واقف کار محلی کو
بلایا اور کہا: کوئی ایسی صورت بن نہیں آتی کہ ذرا اُس کی صورت میں دیکھوں
اور اپنی جان کو صبر دوں؛ مگر یہ طرح ہے کہ ایک سُرنگ اُس کی حویلی سے
کھدوا کر محل میں مِلا دو۔ حکم کرتے ہی، کئی دِنوں میں ایسی نقب تیار ہوئی
کہ جب سہی سانجھ ہوتی، چپکے ہی وہ خواجہ سرا اُس جوان کو اُسی راہ
سے لے آتا۔ تمام شب شراب کباب، عیش و عشرت میں کٹتی۔ میں اُس کے
ملنے سے آرام پاتی، وہ میرے دیکھنے سے خوش ہوتا۔ جب فجر کا تارا نکلتا
اور مؤذن اذان دیتا؛ محلی اُسی راہ سے اُس جوان کو اُس کے گھر پہنچا
دیتا۔ اِن باتوں سے سوائے اُس خوجے کے اور دو دائیوں کے (جنھوں
نے مجھے دودھ پلایا اور پالا تھا) چوتھا آدمی کوئی واقف نہ تھا۔

ایک مدت اِس طرح سے گزری۔ ایک رُوز کا یہ ذکر ہے کہ موافق
معمول کے خوجہ جو اُس کو بلانے گیا؛ دیکھے تو وہ جوان فکر مند سا چپکا بیٹھا
ہے۔ محلی نے پوچھا: آج خیر ہے، کیوں ایسے دِل گیر ہو رہے ہو؟ چلو،

حُضور میں یاد فرمایا ہے۔ اُس نے ہرگز کچھ جواب نہ دیا، زُبانؔ نہ ہِلائی۔
خواجہ سَرا اپنا سا مُنہ لے کر اکیلا پھر آیا اوؔر اَحوال اُس کا عرض کیا۔
میرے تئیں شیطان جو خراب کرے، اِس پر بھی مَحبّت اُس کی دل سے
نہ بھولی۔ اگر یہ جانتی کہ عشق اور چاہ ایسے نمکؔ حرام، بے وَفا کی آخر کو
بدنام اور رُسوا کرے گی اور نَنگ و ناموس سب ٹھکانے لگے گا؛ تو اُسی
دَم اُس کام سے باز آتی اور توبہ کرتی، پھر اُس کا نام نہ لیتی، نہ اپنا دل
اُس بے حیا کو دیتی۔ پَر ہونا تُو یوں تھا، اِس لیے حرکتِ بے جا اُس کی
خاطِر میں نہ لائی اور اُس کے نہ آنے کو، معشوقوں کا چُوچلا اور ناز سمجھا؛ اُس
کا نتیجہ یہ دیکھا کہ اِس سَرگُذشت سے، بَغَیر دیکھے بھالے، تؤ بھی واقِف
ہوا۔ نہیں تو مَیں کہاں اور تؤ کہاں! خَیر، جو ہوا سُو ہوا!

اِس خَر دِماغی پر اُس گدھے کی خیال نہ کر، دوؔبارہ خُوجے کے ہاتھ پَیغام
بھیجا کہ اگر تؤ اِس وقت نہیں آوِےؔ گا، تو مَیں کسو نہ کسو ڈھب سے وَہیں
آتی ہوں؛ لیکن میرے آنے میں بڑی قَباحَت ہے۔ اگر یہ راز فاش ہوا،
تو تیرے حقؔ میں بہت بُرا ہے۔ ایسؔا کام نہ کر جس میں سوائے رُسوائی کے
اَور کچھ پھَل نہ ملے۔ بہتر یہی ہےؔ جلد چلا آ، نہیں تو مجھے پہنچا جان۔

جب یہ سَندیسا گیا اور اِشتِیاق میرا نِپَٹ دیکھا؛ بھونڈی سی صورت
بنائے ہوئے، ناز نخرے سے آیا۔ جب میرے پاس بیٹھا، تب میں نے
اُس سے پوچھا کہ آج رُکاوَٹ اور خَفگی کا کیا باعث ہے؟ اِتنی شُوخی
اور گُستاخی تو نے کبھوؔ نہ کی تھی، ہمیشہ بِلا عُذر حاضِر ہوتا تھا۔ تب اُس نے

کہا کہ مَیں گُم نام، غریب، حُضور کی توجّہ سے اور دامنِ دولت کے باعث اِس مَقدُور کو پہنچا، بہت آرام سے زِندگی کٹتی ہے، آپ کے[1] جان و مال کو دُعا کرتا ہوں۔ یہ تقصیر، بادشاہ زادی کے مُعاف کرنے کے بھروسے، اِس گُنہ گار سے سَرزَد ہوئی؛ اُمید وار عَفو کا ہوں۔ میں تو جان و دل سے اُسے چاہتی تھی، اُس کی بناوَٹ کی باتوں کو مان لیا اور شرارت پر نظر نہ کی؛ بلکہ پھر دِل داری سے پوچھا: کیا[2] تجھ کو ایسی مُشکل کٹھن* پیش آئی جو ایسا مُتفکِّر ہو رہا ہے؟ اُس کو عرض کر، اُس کی بھی تدبیر ہو جائے گی۔

غَرَض اُس نے اپنی خاکساری کی راہ سے یہی کہا کہ مجھ کو سب مشکل ہے اور[3] آپ کے رُو بہ رُو سب آسان ہے۔ آخر اُس کے فَحوائے کلام اور بَت کہاؤ* سے یہ کُھلا کہ ایک باغ نہایت سَرسَبز اور عمارتِ[4] عالی، حَوض، تالاب، کُنوئیں[5] پختہ سَمیت*، غُلام کی حویلی کے نزدیک، نافِ شہر میں بِکاؤ ہے؛ اور اُس باغ کے ساتھ ایک لَونڈی بھی گائن، کہ عِلمِ موسِقی* میں خوب سلیقہ رکھتی ہے؛ لیکن یے دونوں باہَم بِکتے ہیں، نہ اکیلا باغ؛ جیسے اونٹ کے گلے میں بِلّی۔ جو کوئی وُہ باغ لیوے، اُس کنیز کی بھی قیمت دیوے۔ اور تماشا[6] یہ ہے باغ کا مُول لاکھ[7] روپے اور اُس باندی کا بَہا پانچ لاکھ۔ فِدوی سے اِتنے روپے بِالفِعل سَرانجام نہیں ہو سکتے۔ میں نے اُس کا دِل بہت بے اِختِیار شوق میں اُن کی خریداری کے پایا کہ[8] اِسی واسطے دل حَیران اور خاطِر پَریشان تھا۔ باوُجودے کہ رُو بہ رُو میرے پاس[9] بیٹھا تھا، تب بھی اُس کا چہرہ مَلین[10] اور جی اُداس تھا۔ مجھے تو خاطِر داری اُس کی ہر گھڑی

اور ہر پل منظور تھی؛ اُسی وقت خواجہ سَرا کو حُکم کیا کہ کل صُبح کو قیمت اُس باغ کی لونڈی سمیت* چُکا کر، قبالہ باغ کا اور خطِ کنیزک کا لکھوا کر اِس شخص کے حوالے کرو، اور مالک کو زرِ قیمت خزانۂ عامرہ سے دِلوا دو۔ اِس پَروانگی کے سُنتے ہی آداب بجالایا اور مُنہ پر رونَق آئی۔ ساری رات اُسی قاعدے سے (جیسے ہمیشہ گزرتی تھی) ہنسی خوشی سے کٹی۔ فجر ہوتے ہی وہ رُخصت ہوا۔ خوجے نے مُوافِق فرمانے کے، اُس باغ کو اور لونڈی کو خرید کر دیا۔ پھر وہ جوان رات کو مُوافِق معمول کے آیا جایا کرتا۔

ایک رُوز بہار کے موسم* میں کہ مکان بھی دِل چسپ تھا، بَدلی گھُمنڈ رہی تھی، پھوُئیاں پڑ رہی تھیں، بجلی بھی کوندھ رہی تھی اور ہَوا نَرم نَرم بہتی تھی، غَرَض عجیب کیفیت اُس دم تھی؛ جو نہیں رنگ بہ رنگ کے حُباب* اور گلابیاں طاقوں پہ چُنیں ہوئیں نظر پڑیں، دِل للچایا کہ ایک گھونٹ لوں۔ جب دو تین پیالوں کی نَوبت پہنچی، دو نہیں خیال اُس باغِ نو خرید کا گزرا۔ کمال شَوق ہُوا کہ ایک دَم اِس عالَم میں وہاں کی سَیر کیا چاہیے۔ کم بختی جو آوے، اونٹ چڑھے کُتا کاٹے؛ اچھی طَرح بیٹھے بٹھائے، ایک دائی کو ساتھ لے کر، سُرنگ کی راہ سے اُس جوان کے مکان میں گئی، وہاں سے باغ کی طرف چلی۔ دیکھا تو ٹھیک اُس باغ کی بہار بہشت* کی بَرابَری کر رہی ہے۔ قطرے مینہ کے درختوں کے سَبز سَبز پتّوں پر جو پڑے ہیں، گویا زُمرّد* کی پٹڑیوں پر موتی جڑے ہیں۔ اور سُرخی پھولوں کی اُس اَبر میں ایسی بھلی لگتی ہے، جیسے شام کو شفق پھولے ہے اور نہریں لبالب،

مانندِ فرشِ آئینے (۱) کے نظر آتی ہیں اور موجیں لہراتی ہیں۔

غرض اُس باغ میں ہر طرف سیر کرتی پھرتی تھی کہ دِن ہو چکا، سیاہی شام کی نمود ہوئی۔ اِتنے میں وُہ جوان ایک رَوِش پر نظر آیا اور مجھے دیکھ، بہت اَدَب اور گرم جوشی سے آگے بڑھ کے، میرا ہاتھ اپنے ہاتھ پر دھر کر بارہ دَری کی طرف لے چلا۔ جب وہاں مَیں گئی، تو وہاں کے عالَم نے سارے باغ کی کیفیت کو دل سے بُھلا دیا، یہ روشنی کا ٹھاٹھ تھا۔ جا بہ جا قُمقُمے، سَروِ چراغاں، کنوَل اور فانوسِ خیال، شمعِ مجلس حَیران (۷) اور فانوسیں روشن تھیں، کہ شبِ برات (۸)، باوُجُود چاندنی اور چراغاں کے، اُس کے آگے اَندھیری لگتی۔ ایک طرف آتش بازی، پُھل جھڑی، اَنار، داؤدی، بُھچنیا (۹)، مَروارید، مہتابی، ہوائی، چرخی، ہتھ پھول، جاہی جوہی، پٹاخے، ستارے چُھٹتے تھے۔

اِس عرصے میں بادل پھٹ گیا اور چاند نکل آیا، بِعَینِہٖ جیسے نافرمانی جوڑا پہنے ہوئے کوئی معشوق نظر آجاتا ہے۔ بڑی کیفیت (۱۱) ہوئی۔ (۱۲) چاندنی چِھٹکتے ہی جوان نے کہا: اب چل کر باغ کے بالاخانے پر بیٹھیے۔ مَیں ایسی اَحمق ہو گئی تھی کہ جو وُہ نگوڑا کہتا، سو مَیں مان لیتی۔ اب یہ ناچ نچایا کہ مجھ کو اوپر لے گیا۔ وُہ کوٹھا ایسا بلند تھا کہ تمام شہر کے مکان اور بازار کے چراغاں گویا اُس (۱۳) کے پائیں باغ تھے۔ مَیں اُس جوان کے گلے میں بانہہ ڈالے ہوئے خوشی کے عالَم میں بیٹھی تھی؛ اِتنے میں ایک رنڈی نہایت بھونڈی سی، صورت نہ شکل (۱۴) چولھے میں سے نکل، شراب کا شیشہ ہاتھ میں لیے ہوئے آپہنچی۔

مجھے اُس وقت اُس کا آنا نپٹ بُرا لگا اور اُس کی صورت دیکھنے سے دل میں ہَول اُٹھی؛ تب میں نے گھبرا کر جوان سے پوچھا: "یہ تحفہ علّت کون ہے، تو نے کہاں سے پیدا کی؟ وُہ جوان ہاتھ باندھ کر کہنے لگا: "یہ وُہی لونڈی ہے جو اِس باغ کے ساتھ، حُضور کی عِنایت سے خَرید ہوئی۔"

میں نے معلوم کیا کہ اِس اَحمَق نے بڑی خواہِش سے اِس کو لیا ہے، شاید اِس کا دل اِس پر مائل ہے؛ اِسی خاطِر سے، پیچ تاب کھا کر میں چُپکی ہو رہی؛ لیکن دل اُسی وقت سے مُکَدَّر ہوا اور ناخوشی مِزاج پر چھا گئی۔ تِس پر قیامت اُس اَیسے تَیسے نے یہ کی کہ ساقی اُسی چِھنال کو بنایا۔ اُس وقت میں اپنا لُہو پیتی تھی اور جیسے طُوطی کو کوئی کوّے کے ساتھ ایک پنجرے میں بند کر! ہے، نہ جانے کی فُرصت پاتی تھی اور نہ بیٹھنے کو جی چاہتا تھا۔

قِصّہ مُختَصَر، وُہ شراب بوند کی بوند تھی، جس کے پینے سے آدمی حَیوان ہوجائے۔ دُو چار جام پے دَرپے اُسی تیز آب (۸) کے جوان کو دِیے اور آدھا پیالہ، جوان کی مِنّت سے میں نے بھی زَہر مار کیا۔ آخر وُہ پلشت * بے حیا بھی بدمست ہوکر اُس مَردُود سے بے ہُودہ اَدائیں کرنے لگی اور وُہ چِبلا * بھی نشے میں بے لحاظ ہوچلا اور نامعقول حرکتیں کرنے لگا۔ مجھے یہ غَیرت آئی اگر اِس وقت زمین پھاٹے، تو مَیں سما جاؤں؛ لیکن اُس کی دُوستی کے باعث مَیں بِلَلّی اِس پر بھی چُپ ہو رہی۔ پَر وُہ تو اَصل کا پاجی تھا؛ میرے اِس دَرگُذر کرنے کو نہ سمجھا، نشے کی لَہریں اَور بھی دُو پیالے چڑھا گیا کہ رَہتا سَہتا ہُوش جو تھا، وُہ بھی گُم ہوا اور میری طرف سے،

مُطلق دَھڑ کا جی سے اٹھا دیا۔ بے شرمی سے، شَہوَت کے غَلَبے میں، میرے رُو بہ رُو اُس بے حیا نے اُس بَندُوڑ سے صُحبت کی۔ اور وُہ پچھل پائی بھی اُس حالت میں نیچے پڑی ہوئی نَخرے* تِلّے کرنے لگی اور دونوں میں چوُماچاٹی ہونے لگی۔ نہ اِس بے وَفا میں وَفا، نہ اُس بے حیا میں حیا۔ جیسی روح، ویسے فرشتے۔

میری اُس وقت یہ حالت تھی جیسی (۱) اَوسَر چوُکی ڈُومنی گاوے تال بے تال۔ اپنے اوپر لعنت کرتی تھی کہ کیوں تو یہاں آئی، جس کی یہ سزا پائی۔ آخر کہاں تک سہوں، میرے سر سے پانوتک آگ لگ گئی اور انگاروں پر لُوٹنے لگی۔ اِس غُصّے اور طَیش میں یہ کہاوَت (بَیل نہ کوُدا، کوُدی (۲) گُون؛ یہ تماشا دیکھے کون (۳)) کہتی ہوئی وہاں سے اُٹھی۔

وُہ شرابی اپنی خرابی دِل میں سُوچا کہ اگر باشاہ زادی اِس وقت ناخوش ہوئی، تو کل میرا کیا حال ہوگا اور صبح کو کیا قِیامت مچے گی! اب (۴) بَنے تو اِس کا کام تمام کر ڈالوں۔ یہ ارادہ اُس غَیبانی کی صَلاح سے جی میں ٹھہرا کر؛ گلے میں پٹکا ڈال، میرے پانو آکر پڑا اور پگڑی سر سے اُتار کر مِنّت وزاری کرنے لگا۔ میرا دل تو اُس پر لَٹُّو ہُوئی (۵) رہا تھا؛ جِدھر لیے پھرتا تھا، پھرتی تھی اور چکئی (۶) کی طَرح مَیں اُس کے اِختیار میں تھی؛ جو کہتا تھا، سُو کرتی تھی۔ جوُں توُں (۷) مجھے پھُسلا پَندھلا کر پھر بِٹھلایا اور اُسی شرابِ دو آتشہ کے (۸) دُو چار پیالے بھر بھر کر آپ بھی پیے اور مجھے بھی دِیے۔ ایک تو غُصّے کے مارے جَل بھُن کر کباب ہو رہی تھی، دوسرے ایسی شراب پی؛ جلد بے ہوش ہو گئی، کچھ حَواس باقی نہ رہے۔ تب اُس بے رَحم، نمک حرام، کٹر*، سنگ دل

نے تلوار سے مجھے گھائل کیا، بلکہ اپنی دانست میں مار چکا۔ اُس دم میری آنکھ کھلی تو مُنہ سے یہی نکلا: خیر! جیسا ہم نے کیا، ویسا پایا؛ لیکن تو اپنے تئیں میرے اِس خونِ ناحق سے بچائیو۔

مبادا! ہو کوئی، ظالم! ترا گریباں گیر ۳

مرے لہو کو تو دامن سے دھو، ہوا سو ہوا

کسی سے یہ بھید ظاہر نہ کیجیو، اور ہم نے تو تجھ سے جان تک بھی درگذر نہ کی۔ پھر اُس کو خدا کے حوالے کر کر میرا جی ڈوب گیا، مجھے اپنی سدھ بدھ کچھ نہ رہی۔ شاید اُس قصائی نے مجھے مُردہ خیال کر، اُس صندوق میں ڈال کر قلعے کی دیوار کے تلے لٹکا دیا؛ سو تو نے دیکھا۔ میں کسو کا بُرا نہ چاہتی تھی، لیکن یہ خرابیاں قسمت میں لکھی تھیں۔ مٹتی نہیں کرم کی ریکھا۔ اِن آنکھوں کے سبب یہ کچھ دیکھا۔ اگر خوب صورتوں کے دیکھنے کا دل میں شوق نہ ہوتا، تو وہ بدبخت میرے گلے کا طوق نہ ہوتا۔ اللہ نے یہ کام کیا کہ تجھ کو وہاں پہنچا دیا اور سبب میری زندگی کا کیا۔ اب حیا جی میں آتی ہے کہ یہ رسوائیاں کھینچ کر اپنے تئیں جیتا نہ رکھوں، یا کسو کو منہ نہ دکھاؤں؛ پر کیا کروں، مرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں۔ خدا نے مار کر پھر جلایا، آگے دیکھیے کیا قسمت میں بدا ہے۔ ظاہر میں تو تیری دوڑ دھوپ اور خدمت کام آئی، جو ویسے زخموں سے شفا پائی۔ تو نے جان و مال سے میری خاطر کی اور جو کچھ اپنی بساط تھی، حاضر کی۔ اُن دنوں تجھے بے خرچ اور دودلا دیکھ کر، وہ شُقّہ سیدی بہار کو (جو میرا خزانچی ہے) لکھا۔ اُس میں یہی مضمون تھا کہ

مَیں خَیر و عافیت سے اب فُلانے مکان میں ہوں، مجھ بدطالع کی خبر والدۂ شریفہ کی خدمت میں پہنچائیو۔ اُس نے تیرے ساتھ دُو کشتیاں نقد کی خرچ کی خاطر بھیج دیں۔ اور جب تجھے خِلعت اور جَواہر کے خرید کرنے کو یوسف سوداگر بچّے کی دُکان پر بھیجا؛ مجھے یہ بھروسا تھا کہ وُہ کم حَوصلہ ہر ایک سے جلد آشنا ہو بیٹھتا ہے؛ تجھے بھی اجنبی جان کر، اَغلَب ہے کہ دوستی کرنے کے لیے، اِترا کر دعوت اور ضیافت کرے گا۔ سو میرا منصوبہ ٹھیک بیٹھا۔ جو کچھ میرے دل میں خیال آیا تھا، اُس نے وَیسا ہی کیا۔ تو جب اُس سے قول قرار پھر آنے کا کر کر میرے پاس آیا اور مہمانی کی حقیقت اور اُس کا بجِّد ہونا مجھ سے کہا؛ مَیں دل میں خوش ہوئی کہ جب تو اُس کے گھر میں جاکر کھاوے پیوے گا، تب اگر تو بھی اُس کو مہمانی کی خاطر بُلاوے گا، وُہ دَوڑا چلا آوے گا؛ اِس لیے تجھے جلد رُخصت کیا۔ تین دن کے پیچھے جب تو وہاں سے فراغت کرکے آیا اور میرے رو بہ رو عُذرِ غَیر حاضری کا شرمندگی سے لایا، میں نے تیری تشفّی کے لیے فرمایا: کچھ مُضایقہ نہیں، جب اُس نے رَضا دی، تب تو آیا؛ لیکن بے شرمی خوب نہیں کہ دوسرے کا اِحسان اپنے سر پر رکھیے اور اُس کا بدلا نہ کیجیے۔ اب تو بھی جاکر اُس کی (۷) اِستِدعا کر اور اپنے ساتھ ہی ساتھ لے آ۔

جب تو اُس کے گھر گیا، تب میں نے دیکھا کہ یہاں کچھ اَسباب مہمان داری کا تیار نہیں۔ اگر وُہ آجاوے تو کیا کروں۔ لیکن یہ فرصت پائی کہ اِس مُلک میں قدیم سے بادشاہوں کا یہ معمول ہے کہ آٹھ مہینے کاروبارِ مُلکی اور مالی کے واسطے مُلک گیری میں باہر رہتے ہیں اور چار مہینے موسمِ برسات کے قلعۂ مبارک

میں جُلوس فرماتے ہیں۔ اُن دِنوں دُو چار مہینے سے بادشاہ، یعنی وَلی نعمت مجھ بدبخت کے، بَندوبَست کی خاطِر مُلک گیری کو تشریف لے گئے تھے۔ جب تک تو اُس جوان کو ساتھ لے کر آوے کہ سیدی بہار نے میرا اَحوال خدمت میں بادشاہ بیگم کی (کہ والدہ مجھ ناپاک کی ہیں) عرض کیا۔ پھر میں، اپنی تقصیر اور گُناہ سے خَجِل ہوکر، اُن کے رُو بہ رُو جاکر کھڑی ہوئی اور جو سَرگُذَشت تھی، سب بیان کی۔ ہر چند اُنھوں نے میرے غائب ہونے کی کیفیّت، دُوراَندیشی اور مِہرِ مادَری سے، چھپا رکّھی تھی کہ خُدا جانے اِس کا انجام کیا ہو، ابھی یہ رُسوائی ظاہر کرنی خوب نہیں۔ میرے بدلے میرے عَیبوں کو اپنے پیٹ میں رکھ چھوڑا تھا، لیکن میری تلاش میں تھیں۔ جب مجھے اُس حالت میں دیکھا اور سب ماجرا سُنا؛ آنسو بھر لائیں اور فرمایا: اَے کم بخت، ناشُدَنی! تو نے جان بُوجھ کر نام و نشان بادشاہت کا سارا کھویا، ہزار افسوس! اور اپنی زِندَگی سے بھی ہاتھ دُھویا! کاشکے تیرے عِوَض مَیں پتّھر جَنتی تو صبر آتا! اب بھی توبہ کر۔ جو قسمت میں تھا، سُو ہوا؛ اَب آگے کیا کرے گی؟ جیوے گی یا مرے گی؟ میں نے نہایَت شرمندَگی سے کہا: مجھ بے حیا کے نصیبوں میں یہی لکھا تھا جو اِس بدنامی اور خرابی میں ایسی ایسی آفتوں سے بچ کر جیتی رہوں، اِس سے مرنا ہی بَھلا تھا۔ اگرچہ کَلَنک کا ٹیکا میرے ماتھے پر لگا، پَر ایسا کام نہیں کیا جس میں ماباپ کے نام کو عیب لگے۔

اب یہ بڑا دُکھ ہے کہ وِے دونوں بے حیا میرے ہاتھ سے بچ جاویں اور آپس میں رنگ رَلیاں مَناویں، اور مَیں اُن کے ہاتھوں سے یہ کچھ دُکھ

دیکھوںؒ ؛ حیف ہے کہ مجھ سے کچھ نہ ہو سکے ! یہ اُمّیدوار ہوں کہ خانساماں⑵ کو پَروانگی ہو تو اَسبابِ ضِیافت کا بہ خوبیِ⑶ تمام اِس کم بخت کے مکان میں تیّار کرے ؛ تو مَیں دعوت کے بہانے سے اُن دونوں بدبختوں کو بُلوا کر، اُن کے عَملوں⑷ کی سزا دوں اور اپنا عِوَض لوں ۔ جس طرح اُس نے مجھ پر ہاتھ چھوڑا اور گھائل کیا، مَیں بھی دونوں کے پُرزے پُرزے کروں ؛ تب میرا کلیجا ٹھنڈا ہو۔ نہیں تو اِس غُصّے کی آگ میں پُھک* رہی ہوں، آخرش جَل بَل کر بھوبَھل ہو جاؤں گی ۔

یہ سُن کر اَمّاںؒ نے، آتما کے درد سے مِہربان ہو کر، میری عَیب پوشی کی اور سارا لَوازِمہ ضِیافت کا اُسی خواجہ سَرا کے ساتھ (جو میرا مَحرَم ہے) کر دیا۔ سب اپنے اپنے کارخانے میں آ کر حاضِر ہوئے ۔ شام کے وقت تُو اُس مُوے کو لے کر آیا۔ مجھے اُس قَحبَہ باندی کا بھی آنا منظور تھا، چُناں چِہ پھر تجھ کو تَقیّد کر کر اُسے بھی بُلوایا۔ جب وُہ بھی آئی اور مجلس جَمی ؛ شراب پی پی کر سب بدمست اور بے ہُوش ہوئے اور اُن کے ساتھ تُو بھی کَیفی ہو کر مُردہؒ سا پڑا ؛ میں نے قِلماقنی کو حُکم کیاؒ کہ اُن دونوں کا سِر تلوار سے کاٹ ڈال ۔ اُس نے وُونہیں ایک دَم میں شمشیر نکالؒ ، دونوں کے سر کاٹ ، بدن لال کر دیے۔ اور تجھ پر غُصّے کا یہ باعث تھا کہ میں نے اِجازت ضِیافت کی دی تھی، نہ دُو دن کی دُوستی پر اِعتماد کر کے شریک مے خوری⑽ کا ہو۔ البتّہ یہ تیری حماقت* اپنے تئیں پسند نہ آئی ۔ اِس واسطے کہ جب تُو پی پا کر بے ہُوش ہوا، تب تَوَقُّع *رِفاقت کی تجھ سے کیا رہی ! پَر تیری خدمت کے حقؒ ایسے میری گردن پر ہیں کہ

جو تجھ سے ایسی حرکت ہوتی ہے، تو مُعاف کرتی ہوں۔

لے، میں نے اپنی حقیقت اِبتِدا سے اِنتہا تک کہہ سُنائی۔ اب بھی دل میں کچھ اَور ہَوَس باقی ہے؟ جیسے میں نے تیری خاطِر کر کے، تیرے کہنے کو سب طَرح قُبول کیا؛ تو بھی میرا فرمانا اِسی صورت سے عَمَل میں لا۔ صَلاحِ وقت یہ ہے کہ اَب اِس شہر میں رہنا میرے اور تیرے حقّ میں بھلا نہیں؛ آگے تو مُختار ہے۔

یا معبوُدَ اللہ! شہ زادی اِتنا فرما کر چُپ رہی۔ فقیر تُو دل و جاں سے اُس کے حُکم کو سب چیز پر مُقدَّم جانتا تھا اور اُس کی مَحبّت کے جال میں پھنسا تھا، بُولا: جو مرضیِ مُبارَک میں آوے، سُو بہتر ہے، یہ فِدوی بے عُذر بجا لاوے گا۔ جب شہ زادی نے میرے تئیں فرماں بَردار و خِدمت گار اپنا پورا سمجھا، فرمایا: دُو گھوڑے چالاک اور جانباز (کہ چلنے میں ہَوا سے باتیں کریں) بادشاہ کے خاص اَصطَبَل* سے منگوا کر تیّار رکھ۔ میں نے وَیسے ہی پَری زاد، چار گُردِے کے گھوڑے چُن کر، زین بندھوا کر منگوائے۔ جب تھوڑی سی رات باقی رہی، بادشاہ زادی مردانہ لباس پہن اور پانچوں ہتھیار باندھ کر ایک گھوڑے پر سوار ہوئی اور دوسرے مَرکَب پر مَیں مُسلّح ہو کر چڑھ بیٹھا اور ایک طرف کی راہ لی۔

جب شب تمام ہوئی اور پَرچھا ہونے لگا، تب ایک پُوکھَر کے کنارے پہنچے۔ اُتر کر مُنہ ہاتھ دھوئے۔ جلدی جلدی کچھ ناشتا کر کے، پھر سوار ہو کر چلے۔ کبھو مَلِکہ کچھ کچھ باتیں کرتی اَور یوں کہتی کہ ہم نے تیری خاطِر شرم حیا،

مُلک[۲] مال، ماباپ سب چھوڑا؛ ایسا نہ ہو کہ تو بھی اُس ظالمِ بے وَفا کی طَرح سُلوک کرے۔ کدھو مَیں کچھ اَحوال اِدھر اُدھر کا راہ کٹنے کے لیے کہتا اور اُس کا بھی جواب دیتا کہ بادشاہ زادی! سب آدمی ایک سے نہیں ہوتے۔ اُس پاجی کے نُطفے میں کچھ خَلَل ہوگا، جو اُس سے ایسی حرکت واقع ہوئی۔ اور میں نے تو جان و مال تم پر تَصَدُّق کیا اور تم نے مجھے ہر طَرح سَرفَرازی بخشی؛ اب مَیں بندہ بَغَیر داموں کا ہوں۔ میرے چمڑے کی اگر جوتیاں بنوا کر پہنو تو مَیں آہ نہ کروں۔ ایسی ایسی باتیں باہَم ہوتی تھیں اور رات دن چلنے سے کام تھا۔ کبھو جو ماندگی[۳] کے سبب کہیں اُترتے، تو جنگل کے چَرِند[۴] و پَرِند شکار کرتے۔ حلال کر کے، نمک دان سے نُون نکال، چَقمَک[۵] سے آگ جھاڑ، بھون بھان کر کھا لیتے۔ اور گھوڑوں کو چھوڑ دیتے، وِے[۶] اپنے مُنہ سے گھاس پات چَر چُگ کر اپنا پیٹ بھر لیتے۔

ایک رُوز ایسے کَفِ دَست میدان میں جا نکلے کہ جہاں بَستی کا نام نہ تھا اور آدمی کی صورت نظر نہ آتی تھی؛ اِس پر بھی، بادشاہ زادی کی رِفاقت کے سبب سے دن عید اور رات شبِ بَرات معلوم ہوتی تھی۔ جاتے جاتے، اَن چِت ایک دریا (کہ جس کے دیکھنے سے کلیجا[۷] پانی ہو) راہ میں مِلا۔ کِنارے[۸] پر کھڑے ہو کر جو دیکھا تو جہاں تلک نگاہ نے کام کیا، پانی ہی تھا، کچھ تھَل بیڑا نہ پایا۔ یا[۹] اِلٰہی! اب اِس سَمَندر سے کیوں کر پار اُتریں! ایک دَم اِسی سوچ میں کھڑے رہے۔ آخر یہ دل میں لَہر آئی کہ مَلِکہ کو یہیں بِٹھا[۱۰] کر، مَیں تلاش میں ناو، نواڑے[۱۱] کی جاؤں۔ جب تلک اَسباب گُزارے[۱۲] کا ہاتھ آوے، تب تلک وُہ

نازنین بھی آرام پاوے۔ تب میں نے کہا: اَے مَلِکہ! اگر حُکم ہو تو گھاٹ باٹ اِس دریا کا دیکھوں۔ فرمانے لگی: مَیں بہت تھک گئی ہوں اور بھوکھی پیاسی[1] ہو رہی ہوں؛ مَیں ذرا دَم لے لوں، جب تئیں تو پار چلنے کی کچھ تدبیر کر۔

اُس جگہ ایک درخت پیپل کا تھا بڑا چھتر باندھے ہوئے، کہ اگر ہزار سوار آوے، تو دھوپ اور مینہ میں اُس کے تلے آرام پاوے۔ وَہاں اُس کو بٹھا کر مَیں چلا اور چاروں طرف دیکھتا تھا کہ کہیں بھی زمین پر یا دریا میں نشان اِنسان کا پاؤں۔ بہتیرا سر مارا، پَر کہیں نہ پایا۔ آخر مایوس ہو کر وَہاں سے پھر آیا، تو اُس پَری کو پیڑ کے نیچے نہ پایا۔ اُس وقت کی حالت کیا کہوں کہ سُرت جاتی رہی، دیوانہ باولا ہو گیا۔ کبھو درخت پر چڑھ جاتا اور ڈال ڈال، پات پات پھرتا۔ کبھو ہاتھ پانو چھوڑ کر زمین میں گرتا اور اُس درخت کی جڑ کے آس پاس تَصَدُّق ہوتا۔ کَدھو چنگھاڑ مار کر اپنی بے بَسی پر رُوتا۔ کبھو پَچّھم[۳] سے پُورب کو دَوڑا جاتا، کَدھو اُتّر سے دَکّھن[۵] کو پھر آتا۔ غَرض بہتیری خاک چھانی، لیکن اُس گوہرِ نایاب کی نشانی نہ پائی۔ جب میرا کچھ بَس نہ چلا، تب رُوتا اور خاک سر پر اُڑاتا ہوا تلاش ہر کہیں کرنے لگا۔

دل میں یہی خیال آیا کہ شاید کوئی جِن اُس پَری کو اُٹھا کر لے گیا اور مجھے یہ داغ دے گیا۔ یا اُس کے مُلک سے کوئی اُس کے پیچھے لگا چلا آتا تھا؛ اِس وقت اکیلا پاکر، مَنا مَنوکر پھر شام کی طرف لے اُبھرا۔ ایسے خیالوں میں گھبرا کر کپڑے وپڑے پھینک پھانک دِیے؛ ننگا مُنگا فقیر بن کر، شام کے مُلک میں صُبح سے شام تک ڈھونڈھتا پھرتا اور رات کو کہیں پڑ رہتا۔ سارا جہان

رَوندتہ مارا، پَر اپنی بادشاہ زادی کا نام و نشان کسی سے نہ سُنا، نہ سبب غائب ہونے کا معلوم ہوا؛ تب دل میں یہ آیا کہ جب اُس جان کا تو نے کچھ پتا نہ پایا، تو اَب جینا بھی حیف ہے۔ کسّی جنگل میں ایک پہاڑ نظر آیا، تب اُس پر چڑھ گیا اور یہ اِرادہ کیا کہ اپنے تَئیں گِرا دوں؛ کہ ایک دَم میں سر، مُنہ پتھروں سے ٹکراتے پھوٹ جاوے گا، تو ایسی مصیبت سے جی چھوٹ جاوے گا۔ یہ دل میں کہہ کر، چاہتا ہوں کہ اپنے تَئیں گراؤں، بلکہ پانو بھی اُٹھ چکے تھے، کہ کِسُو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اِتنے میں ہوش آ گیا۔ دیکھتا ہوں تو ایک سوار سبز پوش، مُنہ پر نقاب ڈالے، مجھے فرماتا ہے کہ کیُوں تُو اپنے مرنے کا قَصد کرتا ہے! خُدا کے فَضل سے نااُمّید ہونا کُفر ہے۔ جب تلک سانس ہے، تب تلک آس ہے۔ اَب تھوڑے دنوں میں رُوم کے مُلک میں تین دَرویش تجھ سار کے، ایسی ہی مصیبت میں پھنسے ہوئے اور ایسے ہی تماشے دیکھے ہوئے، تجھ سے مُلاقات کریں گے۔ اور وہاں کے بادشاہ کا آزاد بخت نام ہے، اُس کو بھی ایک بڑی مُشکل دَرپیش ہے۔ جب وُہ بھی تم چاروں فقیروں کے ساتھ ملے گا، تو ہر ایک کے دل کا مطلب اور مُراد جو ہے، بہ خوبی حاصل ہو گی۔

میں نے رِکاب پکڑ کر بوسہ دیا اور کہا: اے خُدا کے وَلی! تمھارے اِتنے ہی فرمانے سے میرے دلِ پُر اِضطِرار کو تسلّی ہوئی؛ لیکن خُدا کے واسطے یہ فرمائیے کہ آپ کون ہیں اور اِسمِ شریف کیا ہے؟ تب اُنھوں نے فرمایا کہ مُرتضیٰ علی میرا نام ہے اور میرا یہی کام ہے کہ جس کو جو مُشکل کٹھن پیش آوے، تو

مَیں اُس کو آسان کر دوں۔ اِتنا فرما کر نظروں سے پوشیدہ ہو گئے۔ بارے اِس فقیر نے اپنے مَولا مُشکل کُشا کی بَشارت* سے خاطِر جمع کر، قصد قسطنطنیہ کا کیا۔ راہ میں جو کچھ مُصیبتیں قسمت میں لکھی تھیں، کھینچتا ہوا؛ اُس بادشاہ زادی کی مُلاقات کے بھروسے، خُدا کے فَضل سے یہاں تک آ پہنچا اور اپنی خوش نصیبی سے تمھاری خِدمت میں مُشرّف ہوا۔ ہمارے تمھارے آپس میں مُلاقات تو ہوئی، باہم صُحبت اور بات چیت مُیسّر آئی؛ اَب چاہیے کہ بادشاہ آزاد بخت سے بھی روشناس اور جان پہچان ہو۔ بعد اُس کے مُقرّر ہم پانچوں اپنے مقصدِ دِلی کو پہنچیں گے۔ تم بھی دُعا مانگو اور آمین کہو۔ یا ہادی! اِس حَیران، سَرگرداں کی سَرگُذشت یہ تھی، جو حُضوری میں دَرویشوں کی کہ سُنائی۔ اب آگے دیکھیے کہ کب یہ محنت اور غم ہمارا، بادشاہ زادی کے ملنے سے، خوشی و خُرّمی سے بَدل ہو!

آزاد بخت ایک کونے میں چِھپا ہوا، چُپکا، دھیان لگائے، پہلے دَروِیش کا ماجرا سُن کر خوش ہوا؛ پھر دوسرے دَروِیش کی حقیقت کو سُننے لگا۔

سَیر دوسرے دَرویش کی

جب① دوسرے دَرویش کے کہنے کی نوبت پہنچی، وُہ چار زانو ہو بیٹھا اور بولا②:

اَے یارو! اِس فقیر کا ٹک ماجرا سُنو ‏ ‏ ‏ میں اِبتدا سے کہتا ہوں تا اِنتہا، سُنو!

جس کا علاج کر نہیں سکتا کوئی حکیم ‏ ‏ ‏ ہے گا ہمارا درد نپٹ لا دَوا، سُنو!

اَے دَلق پوشو! یہ عاجز، بادشاہ زادہ فارِس③ کے مُلک کا ہے۔ ہر فن کے آدمی وہاں پیدا ہوتے ہیں، چُناں چہ "اِصفہان④ نِصفِ جہاں" مشہور ہے۔ ہَفت اِقلیم میں اُس اِقلیم کے برابر کوئی وِلایَت نہیں، کہ وہاں کا ستارہ آفتاب ہے اور وُہ، ساتوں کَواکِب میں، نیّرِ اَعظَم⑤ ہے۔ آب و ہَوا وہاں کی خوش، اور لوگ روشن طَبع⑥ اور صاحِبِ سلیقہ⑦ ہوتے ہیں۔ میرے قِبلہ گاہ نے (جو بادشاہ اُس مُلک کے تھے) لڑکپن سے، قاعدے اور قانونِ سلطنت کے تربیّت⑧ کرنے کے واسطے، بڑے بڑے دانا اُستاد ہر ایک عِلم اور کَسب⑨ کے چُن کر میری اَتالیقی کے لیے مُقرّر کیے تھے؛ تو تعلیمِ کامِل ہر نَوع کی پاکر قابِل ہوں۔ خُدا کے فَضل سے چودہ بَرَس کے سِن⑩ و سال میں سب عِلم⑪ سے ماہِر ہُوا۔ گُفتگو معقول، نِشَست⑫ و بَرخاست پسندیدہ، اور جو کچھ بادشاہوں کو لائق اور دَرکار ہے، سب حاصِل کیا۔ اور یِہی شَوق شب و روز تھا کہ قابِلوں کی صُحبت میں، قِصّے ہر ایک مُلک کے اور اَحوال اُولُو العَزم⑬ بادشاہوں اور نام آوَروں کا سُنا کروں۔

ایک رُوز ایک مُصاحِبِ دانا نے، کہ خوب تَوارِیخ داں اور جہاں دیدہ تھا، مَذکُور کیا کہ اگرچہ آدمی کی زِندَگی کا کچھ بھروسا نہیں؛ لیکن اکثر وَصف ایسے ہیں کہ اُن کے سبب سے اِنسان کا نام قِیامت تک زُبانوں پر بہ خوبی چلا جائے گا۔ میں نے کہا: اگر تھوڑا سا اَحوال اُس کا مُفَصَّل[1] بیان کرو، تو مَیں بھی سُنوں اور اُس پر عَمَل کروں۔ تب وُہ شخص حاتِم طائی کا ماجرا اِس طَرح سے کہنے لگا کہ حاتِم کے وقت میں ایک بادشاہ عَرَب کا نَوفَل[2] نام تھا؛ اُس کو حاتِم کے ساتھ، بہ سبب نام آوَری کے، دشمنی کمال[3] ہوئی۔ بہت سا لشکر، فَوج جمع کرکر لڑائی کی خاطِر چڑھ آیا۔ حاتِم تو خُدا ترس اور نیک مرد تھا؛ یہ سمجھا کہ اگر مَیں بھی جنگ کی تیاری کروں، تو خُدا کے بندے مارے جائیں گے اور بڑی خوں رِیزی ہوگی؛ اُس کا عذاب میرے نام لکھا جائے گا۔ یہ بات سُوچ کر، تَنِ تنہا اپنی جان لے کر، ایک پہاڑ کی کھوہ میں جا چِھپا۔ جب حاتِم کے غائب ہونے کی خبر نَوفَل کو معلوم ہوئی؛ سب اَسباب، گھر بار حاتِم کا قُرق کیا اور مُنادی کروادی کہ جو کوئی ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر پکڑ لاوے، پان سَے اَشرَفی بادشاہ کی سرکار سے اِنعام پاوے۔ یہ سُن کر سب کو لالچ آیا اور جُستجو حاتِم کی کرنے لگے۔

ایک رُوز ایک بُڈھا اور اُس کی بُڑھیا، دو تین بچّے چُھوٹے چُھوٹے ساتھ لیے ہوئے، لکڑیاں تُوڑنے کے واسطے اُس غار کے پاس، جہاں حاتِم پُوشیدہ تھا، پہنچے اور لکڑیاں اُس جنگل سے چُننے لگے۔ بُڑھیا بُولی کہ اگر ہمارے دن کچھ بھلے آتے، تو حاتِم کو کہیں ہم دیکھ پاتے اور اُس کو پکڑ کر

نَوفَل کے پاس لے جاتے، تو وُہ پانچ سَو اَشَرفی دیتا ؛ ہم آرام سے کھاتے، اِس دُکھ دَھندِھے (۱) سے چھوٹ جاتے۔ بوڑھے نے کہا : کیا ٹَرٹَر کرتی ہے ! ہمارے طالِع میں یہی لکھا (۲) ہے کہ رُوز لکڑیاں توڑیں اور سر پر دَھر کر بازار میں بیچیں، تب نُون، رُوٹی مُیَسَّر آوِے ؛ یا ایک رُوز جنگل سے باگھ* لے جاوِے۔ لے اپنا کام کر۔ ہمارے ہاتھ حاتَم کاہے کو آوِے گا اور بادشاہ [سے] (۳) اِتنے روپَے دِلاوِے گا ! عَورت نے ٹھنڈی سانس بھری اور چُپکی ہو رہی۔

یِہ (۴) دونوں کی باتیں حاتَم نے سُنیں ؛ مَردُمی اور مُرَوَّت سے بَعید جانا کہ اپنے تئیں چِھپائے اور جان کو بچائے اور اِن دونوں بےچاروں کو مطلَب تک نہ پہنچائے۔ سچ ہے : اگر آدمی میں رَحم نہیں، تو وُہ اِنسان نہیں اور جس کے جی میں درد نہیں، وُہ قصائی* (۵) ہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں (۶)

غَرَض حاتَم کی جواں مَردی نے نہ قُبول کیا کہ اپنے کانوں سے سُن کر چُپکا ہو رہے، وُو نہیں باہَر نکل آیا اور اُس بوڑھے سے کہا کہ اَے عزیز ! حاتَم مَیں ہی ہوں، میرے تئیں نَوفَل کے پاس لے چل۔ وُہ مجھے دیکھے گا ؛ جو کچھ روپَے دینے کا قَرار کیا ہے، تجھے دیوِے گا۔ پیر مرد نے کہا : سچ ہے اِس صورت میں بَھلائی اور بَہبُودی میری البتّہ ہے ؛ لیکن وُہ، کیا جانیے تجھ سے کیا سُلوک کرے ! اگر مار ڈالے، تو مَیں کیا کروں ! یِہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا کہ تجھ سے انسان کو، اپنی طَمَع کی خاطِر، دُشمن کے حوالے کروں۔

وہ مال کتّے دِن کھاؤں گا اور کب تک جیوں گا! آخر مر جاؤں گا، تب خُدا کو کیا جواب دوں گا؟

حاتم نے بہتیری منّت کی کہ مجھے لے چل، مَیں اپنی خوشی سے کہتا ہوں اور ہمیشہ اِسی آرزو میں رہتا ہوں کہ میرا جان و مال کِسو کے کام آوِے تو بہتر ہے؛ لیکن وُہ بوڑھا کسو طَرح راضی نہ ہوا کہ حاتم کو لے جاوِے اور اِنعام پاوِے۔ آخر لاچار ہوکر حاتم نے کہا: اگر تو مجھے یوں نہیں لے جاتا، تو مَیں آپ سے آپ بادشاہ پاس جاکر کہتا ہوں کہ اِس بوڑھے نے مجھے جنگل میں ایک پہاڑ کی کھوہ میں چھپا رکّھا تھا۔ وُہ بوڑھا ہنسا اور بُولا: بھلائی کے بدلے بُرائی ملے تو یا نصیب! اِس رَدّ و بَدَل کے سوال جواب میں آدمی اَور بھی آن پہنچے، بھیڑ لگ گئی۔ اُنھوں نے معلوم کیا کہ حاتم یہی ہے؛ تُرت پکڑ لیا اور حاتم کو لے چلے۔ وُہ بوڑھا بھی افسوس کرتا ہوا پیچھے پیچھے ساتھ ہو لیا۔ جب نوفَل کے رُوبہ رُو لے گئے، اُس نے پوچھا کہ اِس کو کون پکڑ لایا؟ ایک بد ذات، سنگ دِل بولا کہ ایسا کام سِوائے ہمارے کوَن کر سکتا ہے؟ یہ فتح ہمارے نام ہے، ہم نے عرش پر جھنڈا گاڑا ہے۔ ایک اور لَن ترانی والا ڈینگ مارنے لگا کہ مَیں کئی دن سے دَوڑ دھوپ کر جنگل سے پکڑ لایا ہوں۔ میری محنت پر نظر کیجیے اور جو قرار ہے، سُو دیجیے۔ اِسی طَرح، اَشرَفیوں کے لالچ سے، ہر کوئی کہتا تھا کہ یہ کام مجھ سے ہوا۔ وُہ بوڑھا چُپکا ایک

کونے میں لگا ہوا، سب کی شیخیاں سن رہا تھا اور حاتم کی خاطر کھڑا روتا تھا۔

جب اپنی اپنی دلاوری اور مردانگی سب کہہ چکے، تب حاتم نے بادشاہ سے کہا: اگر سچ بات پوچھو تو یہ ہے کہ وہ بوڑھا، جو الگ سب سے کھڑا ہے، مجھ کو لایا ہے۔ اگر قیافہ پہچان جانتے ہو، تو دریافت کرو اور میرے پکڑنے کی خاطر جو قبول کیا ہے، پورا کرو؛ کہ سارے ڈپل بیس (۱) (۲) زبان حلال ہے۔ مرد کو چاہیے: جو کہے، سو کرے؛ نہیں تو جیبھ حیوان کو بھی خدا نے دی ہے، پھر حیوان اور انسان میں کیا تفاوت ہے! نوفل نے اُس لکڑ ہارے بوڑھے کو پاس بُلا کر پوچھا کہ سچ کہہ اصل کیا ہے؟ حاتم کو کون پکڑ لایا؟ اُس بیچارے نے، سر سے پانو تک جو گزرا تھا، راست کہہ سنایا اور کہا: حاتم میری خاطر آپ سے آپ چلا آیا ہے۔ نوفل یہ ہمت حاتم کی سن کر متعجب ہوا کہ بل بے تیری سخاوت! اپنی جان کا بھی خطرہ نہ کیا! جتنے جھوٹھ دعوے حاتم کے پکڑ لانے کے کرتے تھے، حکم کیا کہ اِن کی مُشکیں کس کر؛ پان سو اشرفی کے بدلے، پان پان سے جوتیاں اِن کے سر پر لگاؤ، کہ اِن کی بھی جان نکل پڑے۔ وونہیں تڑ تڑ پیزاریں پڑنے لگیں، کہ ایک دم میں سر اُن کے گنجے ہو گئے۔ سچ ہے: جھوٹھ بولنا ایسا ہی گناہ ہے کہ کوئی گناہ اُس کو نہیں پہنچتا۔ خدا سب کو اِس بلا سے محفوظ رکھے (۹) اور جھوٹھ بولنے کا چسکا نہ دے۔ بہت آدمی جھوٹھ موٹھ (۱۱) بکے جاتے ہیں لیکن آزمایش کے وقت سزا پاتے ہیں۔

غرض اُن سب کو موافق اُن کے اِنعام دے کر، نَوفَل نے اپنے دل میں خیال کیا کہ حاتم سے شخص سے (کہ ایک عالَم کو اُس سے فَیض پہنچتا ہے، اور محتاجوں کی خاطِر جان اپنی دَرِیغ* نہیں کرتا، اور خُدا کی راہ میں سَرتاپا حاضِر ہے) دُشمنی رکھنی[۱] اور اُس کا مُدّعی ہونا مرو آدمیّت* اور جواں مَردی سے بَعید ہے۔ دونہیں حاتم کا ہاتھ بڑی دوستی اور گرم جوشی سے پکڑ لیا اور کہا: کیوں نہ ہو؛ جب ایسے ہو، تب ایسے ہو۔ تَواضع، تعظیم کر کر پاس بِٹھلایا اور حاتم کا مُلک[۲] و اِملاک* اور مال واَسباب جو کچھ ضَبط کیا تھا، دونہیں چھوڑ دیا۔ نئے سَر[۳] سے سرداری قبیلۂ طَے کی اُسے دی۔ اور اُس بوڑھے کو پانچ سَو اَشرفیاں اپنے خزانے سے دِلوا دیں۔ وہ دُعا دیتا ہوا چلا گیا۔

جب یہ ماجرا حاتم کا میں نے تمام سُنا، جی میں غیرت آئی اور یہ خیال گزرا کہ حاتم اپنی قوم کا فقط رئیس تھا، جن نے ایک سخاوت کے باعث یہ نام پیدا کیا کہ آج تلک مشہور ہے؛ مَیں خُدا کے حُکم سے بادشاہ تمام ایران کا ہوں؛ اگر اِس نعمت سے محروم رہوں، تو بڑا افسوس ہے۔ فِی الواقع دُنیا میں کوئی کام بڑا داد و دِہش سے نہیں؛ اِس واسطے کہ آدمی جو کچھ دُنیا میں دیتا ہے، اُس کا عِوَض عاقبت میں لیتا ہے۔ اگر کوئی ایک دانہ[۴] بوتا ہے، تو اُس سے کتنا کچھ پیدا ہوتا ہے! یہ بات دل میں ٹھہرا کر، میرِ عمارت[۵] کو بُلوا کر حُکم کیا کہ ایک مکانِ[۶] عالی شان، جس کے چالیس دروازے بلند اور بہت کُشادہ ہوں، باہر شہر کے

جلد بنواؤ۔ تھوڑے عرصے میں ویسی ہی عمارتِ وسیع، جیسا دل چاہتا تھا، بن کر تیار ہوئی۔ اور اُس مکان میں ہر روز، ہر وقت فجر سے شام تک، محتاجوں اور بے کسوں کے تئیں روپے، اشرفیاں دیتا۔ اور جو کوئی جس چیز کا سوال کرتا، میں اُسے مالا مال کرتا۔

غرض چالیسوں دروازے سے حاجت مند آتے اور جو چاہتے، سو لے جاتے۔ ایک روز کا یہ ذکر ہے کہ ایک فقیر سامھنے کے دروازے سے آیا اور سوال کیا۔ میں نے اُسے ایک اشرفی دی۔ پھر وہی دوسرے دروازے سے ہو کر آیا، دو اشرفیاں مانگیں؛ میں نے پہچان کر درگزر کی اور دیں۔ اسی طرح اُن نے ہر ایک دروازے سے آنا اور ایک ایک اشرفی بڑھانا شروع کیا، اور میں بھی جان بوجھ کر اَن جان ہوا اور اُس کے سوال کے موافق دیا کیا۔ آخر چالیسویں دروازے کی راہ سے آکر چالیس اشرفیاں مانگیں۔ وہ بھی میں نے دلوا دیں۔ اتنا کچھ لے کر، وہ درویش پھر پہلے دروازے سے گھس آیا اور سوال کیا۔ مجھے بہت بُرا معلوم ہوا، میں نے کہا: سُن اے لالچی(۳)! تو کیسا فقیر ہے کہ ہرگز فقر کے تینوں حرفوں سے بھی واقف نہیں! فقیر کا عمل اُن پر چاہیے۔ فقیر بولا: بھلا داتا! تمھیں بتاؤ۔ میں نے کہا: ف سے فاقہ، ق سے قناعت*، ر سے ریاضت نکلتی ہے؛ جس میں یہ باتیں نہ ہوں، وہ فقیر نہیں۔ اتنا جو تجھے ملا ہے، اس کو کھا پی کر پھر آئیو اور جو مانگے گا، لے جائیو۔ یہ خیرات، احتیاج* رفع کرنے کے واسطے ہے، نہ جمع کرنے کے لیے۔ اے حریص! چالیس

دروازوں سے تو نے ایک اَشرفی سے چالیس اَشرفیوں تک لیں؛ اِس کا
حساب تُو کر، کہ رِیوڑی* کے پھیر کی طَرح کتنی اَشرفیاں ہوئیں! اور اِس پر
بھی تجھے حرص پھر پہلے دروازے سے لے آئی! اِتنا مال جمع کر کر کیا کرے گا؟
فقیر کو چاہیے کہ ایک رُوز کی فکر کرے، دوسرے دن پھر نئی۔ رُوزی
رَزّاق دینے والا موجود ہے۔ اب حیا و شَرم پکڑ اور صَبر و قناعت کو کام فرما۔
یہ کیسی فقیری ہے جو تجھے مُرشد نے بتائی ہے!

یہ میری بات سُن کر خَفا اور بَد دِماغ ہوا اور جتنا مجھ سے لے کر جمع
کیا تھا، سب زمین میں ڈال دیا اور بُولا: بس بابا! اِتنے گرم مت ہو،
اپنی کائنات لے کر رکھ چھوڑو، پھر سَخاوَت کا نام نہ لیجو، سخی ہونا بہت
مُشکل ہے۔ تم سَخاوَت کا بُوجھ نہیں اُٹھا سکتے، اُس منزل کو کب پہنچو گے!
ابھی دِلّی دور ہے! "سخی" کے بھی تین حرف ہیں؛ پہلے اُن پر عَمَل کرو، تب
سخی کہلاؤ۔ تب تو مَیں ڈرا اور کہا: بھلا داتا! اِس کے معنے مجھے سمجھاؤ۔
کہنے لگا: سؔ سے سَمائی، اور خؔ سے خوفِ اِلٰہی، اور یؔ سے یاد رکھنا
اپنی پَیدایِش اور مرنے کو۔ جب تلک اِتنا نہ ہُولے، تو سَخاوَت کا نام نہ
لے۔ اور سخی کا یہ دَرجہ ہے کہ اگر بدکار ہو، تو بھی دُوست خُدا کا ہے۔
اِس فقیر نے بہت مُلکوں کی سَیر کی ہے؛ لیکن سِوائے بَصرے کی
بادشاہ زادی کے، کوئی سخی دیکھنے میں نہ آیا۔ سَخاوَت کا جامہ خُدا نے
اُس عَورت پر قطع[2] کیا ہے۔ اَور سب نام چاہتے ہیں، پَر وَیسا کام نہیں
کرتے۔ یہ سُن کر میں نے بہت مِنَّت کی اور قسمیں[3] دیں کہ میری تقصیر

مُعاف کرو اور جو چاہیے، سُو لُو۔ میرا دِیا ہرگز نہ لیا اور یہ بات کہتا ہوا چلا : اب اگر اپنی ساری بادشاہت مجھے دے، تو اُس پر بھی نہ تھوکُوں اور نہ دَھر ماروں[1]۔ وُہ تُو چلا گیا، پَر بَصرِے کی بادشاہ زادی کی یہ تعریف سُننے سے دِل بے کل ہوا، کسی طَرح کل نہ تھی۔ اب یہ آرزو ہوئی کہ کِسُو صورت سے بَصرِے چل کر اُس کو دیکھا چاہیے۔

اِس عرصے میں بادشاہ نے وَفات پائی اور تخت پر مَیں بیٹھا۔ سلطنت ملی، پَر وُہ خیال نہ گیا۔ وزیر اور امیروں سے (جو پایۂ تختِ سلطنت کے اور اَرْکان، مُملکَت کے تھے) مَشْوَرَت کی کہ سفر بَصرِے کا کیا چاہتا ہوں، تم اپنے کام میں مُستَعِد رہو؛ اگر زِندَگی ہے، تو سفر کی عُمر کُوتاہ ہوتی ہے، جلد پھر آتا ہوں۔ کوئی میرے جانے پر راضی نہ ہوا۔ لاچار، دل تُو اُداس ہو رہا تھا؛ ایک دِن بَغیر سب کے کہے سُنے، چُپکے[5]، وزیرِ باتدبیر کو بُلا کر مُختار اور وَکیلِ مُطلق اپنا کیا اور سلطنت کا مَدارُالمُہام بنایا۔ پھر میں نے گیروا بَسْتَر پہن، فقیری بھیس کر، اکیلے راہ بَصرِے کی لی۔ تھوڑے دِنوں میں اُس کی سَرحَد میں جا پہنچا؛ تب سے یہ تماشا دیکھنے لگا کہ جہاں رات کو جا کر مُقام کرتا؛ نَوکر چاکر اُسی مَلِکہ کے، اِستِقبال کر کر ایک مکانِ معقول میں اُتارتے اور جِتنا لَوازِمہ ضِیافَت کا ہوتا ہے، بہ خوبی مَوجود کرتے اور خِدمت میں دَست بَستہ تمام رات حاضر رہتے۔ دوسرے دن دوسری منزل میں یہی صورت پیش آتی۔ اِس آرام سے مہینوں کی راہ طَے کی۔ آخر بَصرِے میں داخل ہوا؛ وُونہیں ایک

جوانِ[1] شکیل، خوش لباس، نیک خو، صاحبِ مُرَوَّت[2] (کہ دانائی اُس کے قیافے سے ظاہر تھی) میرے پاس آیا اور نپٹ شیریں زبانی سے کہنے لگا کہ مَیں فقیروں کا خادم ہوں، ہمیشہ اِسی تلاش میں رہتا ہوں کہ جو کوئی مُسافر، فقیر یا دُنیا دار، اِس شہر میں آوے، میرے گھر میں قدم رنجہ فرماوے۔ سوائے ایک مکان کے، یہاں اور بدیسی[4] کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ آپ تشریف لے چلیے اور اُس مقام کو زینت بخشیے اور مجھے سرفراز کیجیے۔

فقیر نے پوچھا: صاحب کا اِسمِ شریف[5] کیا ہے؟ بولا: اِس گُم نام کا نام بیدار بخت کہتے ہیں۔ اُس کی خوبی اور تملّق دیکھ کر یہ عاجز اُس کے ساتھ چلا اور اُس کے مکان میں گیا۔ دیکھا تو ایک عمارتِ عالی لوازمِ شاہانہ سے تیّار ہے۔ ایک دالان میں اُس نے لے جا کر بٹھایا[6] اور گرم پانی منگوا کر ہاتھ پانو[7] دُھلوائے اور دسترخوان بچھوا کر، مجھ تنِ تنہا کے رُو بہ رُو بکاوَل* نے ایک توڑے کا توڑا* چُن دیا۔ چار مُشقاب*: ایک میں یخنی پُلاو، دوسری میں قورما* پُلاو، اور تیسری میں مُتنجّن پُلاو، چوتھی میں کوکو* پُلاو۔ اور ایک قاب زردے کی۔ اور کئی طرح کے قلیے[9]: دو پیازہ، نرگسی، بادامی، روغن جوش[10]۔ اور رُوٹیاں کئی قسم کی: باقرخانی[11]، تُنکی، شیرمال، گاو دیدہ، گاو زبان[12]، نانِ نعمت، پراٹھے۔ اور کباب: کوفتے کے، تکّے کے، مُرغ کے۔ خاگینہ، ملغوبہ*، شب دیگ، دم پُخت، حلیم[13]، ہریسا*، سموسے ورقی[14]، قبولی، فرنی، شیر برنج، ملائی، حلوا، فالودہ،

پَن بَھتا، نَمِش، آبْشورہ، ساقِ عُروُس*، نَوزِیات، مُربّا (۱)، اَچار دان، دَہی کی قُلْفِیاں۔ یہ نعمتیں دیکھ کر روح بھر گئی۔ جب ایک ایک نوالہ* ہر ایک سے لیا، پیٹ بھی بھر گیا؛ تب ہاتھ کھانے سے کھینچا۔ وُہ شخص مُجَوِّز ہوا کہ صاحِب نے کیا کھایا! کھانا تُو سب اَمانت دَھرا ہے! بے تکلّف اَور نُوشِ جاں فرمائیے۔ میں نے کہا: کھانے میں شَرم کیا ہے! خُدا تمھارا خانہ آباد رکھے؛ جو کچھ میرے پیٹ میں سَمایا، سُو میں نے کھایا۔ اور ذائقے کی اِس کے کیا تعریف کروں کہ اب تک زُبان چاٹتا ہوں اور جو ڈَکار آتی ہے، سُو مُعَطَّر۔ تُو اَب مَزید کرو۔

جب دسترخوان اُٹھا؛ زیر اَنداز کاشانی مخمل کا مُقَیَّشی (۳) بچھا کر، چلمچی* آفتابہ طلائی لاکر، بیسن دان میں سے خوش بو بیسن دے کر گرم پانی سے میرے ہاتھ دُھلائے۔ پھر پان دان جڑاؤ میں گلوریاں (۴) سُونے کے ورقوں (۵) میں بَندھی ہوئیں، اور چَوگھَڑوں* (۶) میں کھلوریاں اور چکنی سُپیاریاں* اور لَونگ، اِلاچیاں رُوپے (۷) کے وَرقوں (۸) میں مَڑھی ہوئیں لاکر رکھیں۔ جب مَیں پانی پینے کو مانگتا، تب صُراحی بَرف میں لگی ہوئی آب دار لے آتا۔ جب شام ہوئی، فانُوسوں میں کافوری شمعیں روشن ہوئیں۔ وُہ عزیز بیٹھا ہوا باتیں کرتا رہا۔ جب پہر رات گئی، بُولا: اب اِس چَھپَر کھٹ میں (کہ جس کے آگے دَلدا پیش گیر کھڑا ہے) آرام کیجیے۔ فقیر نے کہا: اَے صاحِب! ہم فقیروں کو ایک بُوریا یا (۹) مرگ چھالا بستر کے لیے بہت ہے؛ یہ خُدا نے تم دُنیا داروں کے واسطے بنایا ہے۔ کہنے لگا: یہ سب

اَسباب درویشوں کی خاطِر ہے، کچھ میرا مال نہیں۔ اُس کے بجِد ہونے سے، اُن بچھونوں پر (کہ پھولوں کی سیج سے بھی نرم تھے) جا کر لیٹا۔ دونوں پٹّیوں کی طرف گُل دان اور چنگیریں پھولوں کی چُنی ہوئیں، اور عود سوز اور لَخلَخے روشن تھے۔ جِدھر کی کروٹ لیتا، دِماغ مُعطّر ہو جاتا۔ اِس عالَم میں سُو رہا۔ جب صُبح ہوئی، ناشتے کو بھی بادام، پِستے، انگور، اَنجیر، ناشپاتی، اَنار، کِشمِش، چُھہارے اور میوے کا شربت لا حاضِر کیا۔

اِسی طَور سے تین دن رات رہا۔ چوتھے رُوز میں نے رُخصت مانگی۔ ہاتھ جُوڑ کر کہنے لگا: شاید اِس گُنہ گار سے صاحِب کی خِدمت گاری میں کچھ قُصور ہوا کہ جس کے باعِث مِزاج تمھارا مُکدّر ہوا! میں نے حیران ہو کر کہا: بَرائے خُدا یہ کیا مَذکُور ہے! لیکن مہمانی کی شرط تین دن تلک ہے، سُو میں رہا؛ زِیادہ رہنا خوب نہیں۔ اور عَلاوَہ، یہ فقیر واسطے سَیر کے نکلا ہے؛ اگر ایک ہی جگہ رہ جاوے، تو مُناسب نہیں۔ اِس لیے اِجازت چاہتا ہے؛ نہیں تو تمھاری خوبیاں ایسی نہیں کہ جُدا ہونے کو جی چاہے۔ تب وُہ بُولا: جیسی مرضی! لیکن ایک ساعَت تَوَقُّف کیجے کہ بادشاہ زادی کے حضُور جا کر عَرض کروں۔ اور تم جُو جایا چاہتے ہو؛ تو جو کچھ اَسباب اُوڑھنے بِچھانے کا اور کھانے کے باسَن رُوپے سُونے کے اور جَڑاؤ کے اِس مہمان خانے میں ہیں، یہ سب تمھارا مال ہے؛ اِس کے ساتھ لے جانے کی خاطِر جو فرماؤ، تدبیر کی جائے۔ میں نے کہا: لاحَول پڑھو! ہم فقیر نہ ہوئے، بھاٹ ہوئے! اگر یہی حِرص دل میں ہوتی، تو فقیر کاہے کو ہوتے،

دُنیا داری کیا بُری تھی! اُس عزیز نے کہا: اگر یہ اَحوال بلکہ سُنے، تو خُدا جانے مجھے اِس خدمت سے تغیّر کر کر کیا سُلوک کرے! اگر تمھیں ایسی ہی بے پرواہی ہے؛ تو اِن سب کو ایک کوٹھری میں امانت بند کر کر، دروازے کو سر بہ مُہر کر دو؛ پھر جو چاہو، سُو کیجو۔

مَیں نہ قبول کرتا تھا اور وُہ بھی نہ مانتا تھا۔ لاچار یہی صَلاح ٹھہری کہ سب اَسباب کو بند کر کر قُفل کر دیا اور مُنتظِر رُخصت کا ہوا۔ اِتنے میں ایک خواجہ سَرا مُعتبر، سر پر سَرپیچ اور گُوش پیچ اور کمر میں بَندی باندھے، ایک عَصا سونے کا جَڑاؤ ہاتھ میں، اور ساتھ اُس کے کئی خدمت گار معقول، عُہدے لیے ہوئے؛ اِس شان و شَوکت سے میرے نزدیک آیا۔ ایسی، ایسی مِہربانگی اور مُلائمت سے گُفتگو کرنے لگا کہ جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ پھر بُولا کہ اَے میاں! اگر توَجُّہ اور کرم کر کر اِس مُشتاق کے غریب خانے کو اپنے قَدَم کی بَرَکت سے رَونق بخشو، تو بندہ نوازی اور غریب پَرَوری سے بَعید نہیں۔ شاید شہ زادی سُنے کہ کوئی مُسافر یہاں آیا تھا؛ اُس کی تَواضُع، مُدارات کِسُو نے نہ کی، وُہ یُونہیں چلا گیا؛ اِس واسطے، وَاللہ اَعْلَم مجھ پر کیا آفت لاوِے اور کیسی قِیامت اُٹھاوِے! بلکہ حَرف زِندگی پر ہے۔ میں نے اِن باتوں کو نہ مانا۔ تب خواہ مخواہ مِنّتیں کر کے، میرے تئیں اَور ایک حَوِیلی میں (کہ پہلے مکان سے بہتر تھی) لے گیا۔ اُسی پہلے میزبان کی مانند تین دن رات، دونوں وقت، وَیسے ہی کھانے اور صُبح اور تیسرے پَہَر شربت اور تَفَنُّن کی خاطر میوے کِھلائے؛ اور باسَن نُقرئی و طلائی

اور فَرش فُرُوش اور اَسباب، جو کچھ وہاں تھا، مجھ سے کہنے لگا کہ اِن سب کے تم مالک مُختار ہو[1]؛ جو چاہو، سُو کرو۔

مَیں یِہ[2] باتیں سُن کر حَیران ہوا اور چاہا کہ کسی نہ کسی طَرح یہاں سے رُخصت ہو کر بھاگوں۔ میرے بَشرِے* کو دیکھ کر وُہ مَحَلّی[3] بُولا: اَے خُدا کے بندے! جو تیرا مطلب یا آرزو ہو، سُو مجھ سے کہہ؛ تُو حضور میں مَلکہ کے جا کر عَرض کروں۔ میں نے کہا: مَیں فقیری کے لِباس میں دُنیا کا مال کیا مانگوں، کہ تم بَغَیر مانگے[4] دیتے ہو اور مَیں اِنکار کرتا ہوں۔ تب وُہ کہنے لگا کہ حِرص دُنیا کی کسی کے جی سے نہیں گئی، چُناں چہ کِسُو کَبْ[5] نے یہ کَبِت کہا ہے:

نکھ بِن کٹا دیکھے، سِیس بھاری جٹا دیکھے، جُوگی کن پھٹا دیکھے چھار لائے تَن[5] میں
مُونی اَن بُول دیکھے، سیوڑا[6] سر چھول دیکھے، کَرَت کلُول دیکھے بَن کھنڈی بَن میں
بِیر دیکھے، سُور دیکھے، سب گُنی اور کُوڑھ دیکھے، مایا کے پُور دیکھے بھول رہے دَھن میں
آدِ اَنْت سُکھی دیکھے، جنم ہی کے دُکھی دیکھے؛ پَر وِے نہ دیکھے جن کے لُوبھ ناہِ مَن میں

میں نے یہ سُن کر جواب دیا کہ یہ سچ ہے، پَر مَیں کچھ نہیں چاہتا۔ اگر فرماؤ تو ایک رُقعہ سَربہ مُہر* اپنے مطلب کا لکھ کر دوں، جو حُضور مَلِکہ کے پہنچا دو، تو بڑی مِہربانی[7] ہے؛ گُویا تمام دُنیا کا مال مجھ کو دیا۔ بُولا: بہ سَر و چَشم، کیا مُضائقہ۔ میں نے ایک رُقعہ لکھا۔ پہلے شُکر خُدا کا، بہ بعد اَحوال، کہ یہ بندہ خُدا کا کئی رُوز سے اِس شہر میں وارِد ہے اور سرکار سے سب طَرح کی خبر گیری ہوتی ہے۔ جیسی خوبیاں اور نیک نامیاں مَلِکہ

کی سُن کر اِشتیاق دیکھنے کا ہوا تھا، اُس سے چار چَند پایا۔ اب حُضور کے اَرکانِ دَولت یوں کہتے ہیں کہ جو مطلب اور تمنّا تیری ہو، سُو ظاہر کر؛ اِس واسطے بے حجابانہ، جو دل کی آرزو ہے، سُو عرض کرتا ہوں کہ مَیں دُنیا کے مال کا مُحتاج نہیں، اپنے مُلک کا مَیں بھی بادشاہ ہوں؛ فَقَط یہاں تلک آنا اور محنت اُٹھانا آپ کے اِشتیاق کے سبب سے ہوا، جو تَنِ تنہا اِس صورت سے آ پہنچا ہوں۔ اب اُمّید ہے کہ حُضور کی توجّہ سے یہ خاک نشیں مطلبِ دِلی کو پہنچے، تو لائق ہے؛ آگے جو مرضیِ مُبارک۔ لیکن اگر یہ اِلتماس خاکسار کا قبول نہ ہوگا، تو اِسی طَرح خاک چھانتا پھرے گا اور اِس جانِ بے قرار کو آپ کے عشق میں نثار کرے گا؛ مجنوں اور فرہاد کی مانند جنگل میں یا پہاڑ پر مَر رہے گا۔ یہی مُدّعا لکھ کر اُس خُوجے کو دیا۔ اُس نے بادشاہ زادی تلک پہنچایا۔ بعد ایک دَم کے پھر آیا اور میرے تئیں بُلایا اور اپنے ساتھ محل کی ڈِیوڑھی پر لے گیا۔ وہاں جا کر دیکھا تو ایک بوڑھی سی عورت صاحبِ لیاقت، سنہری کُرسی پر، گہنا پاتا پہنے ہوئے بیٹھی ہے اور کئی خُوجے، خدمت گار تکلّف کے لباس پہنے ہوئے، ہاتھ باندھے سامھنے کھڑے ہیں۔ مَیں، اُسے مُختار کار جان کر اور دیرینہ سمجھ کر، دست بہ سَر ہوا۔ اُس ماما نے بہت مِہربانی سے سلام کیا اور حُکم کیا کہ آؤ بیٹھو، خوب ہُوا تم آئے؛ تُمھیں نے مَلکہ کے اِشتیاق کا رُقعہ لکھا تھا؟ مَیں شَرم کھا کر چُپ ہو رہا اور سر نیچا کر کے بیٹھا۔

ایک ساعت کے بعد بولی کہ اَے جوان! بادشاہ زادی نے سلام کہا

ہے اور فرمایا ہے کہ مجھ کو خاوند کرنے سے عیب نہیں۔ تم نے میری درخواست کی؛ لیکن اپنی بادشاہت کا بیان کرنا اور اِس فقیری میں اپنے تئیں بادشاہ سمجھنا اور اُس کا غرور کرنا نِہایت بے جا ہے؛ اِس واسطے کہ سب آدمی آپس میں فی الحقیقت ایک ہیں، لیکن فضیلت دینِ(۱) اِسلام کی البتّہ ہے۔ اور مَیں بھی ایک مُدّت سے شادی کرنے کی آرزومند ہوں۔ اور جیسے تم دولتِ دُنیا سے بے پروا(۲) ہو؛ میرے تئیں بھی حق(۳) تعالیٰ نے اِتنا مال دیا ہے کہ جس کا کچھ حساب نہیں۔ پَر ایک شرط ہے کہ پہلے مَہر اَدا کرلو، اور مَہر شہ زادی کا: ایک بات ہے، جو(۴) تم سے ہو سکے۔ میں نے کہا: مَیں سب طرح حاضر ہوں، جان و مال سے دَریغ نہیں کرنے کا؛ وُہ بات کیا ہے؟ کہو تو مَیں سُنوں۔ تب اُس نے کہا: آج کے دن رہ جاؤ، کل تُمھیں کہ دوں گی۔ میں نے خوشی سے قُبول کیا اور رُخصت ہو کر باہر آیا۔

دن تو گزرا۔ جب شام ہوئی، مجھے ایک خواجہ سَرا محل(۵) میں بُلا کر لے گیا۔ جا کر دیکھا تو اَکابرِ عالِم اور فاضل صاحبِ شرع حاضر ہیں۔ مَیں بھی اُسی جلسے میں جا کر بیٹھا، کہ اِتنے میں دستر خوان بچھایا گیا اور کھانے اَقسام اَقسام کے شِیریں اور نَمکین* چُنے گئے۔ وِے(۶) سب کھانے لگے اور مجھے بھی تَواضُع کر کر شریک کیا۔ جب کھانے سے فراغت ہوئی، ایک دائی اندر سے آئی اور بولی کہ بَہرور(۷) کہاں ہے؟ اُسے بُلاؤ۔ یساوَلوں نے وُو نہیں حاضر کیا۔ اُس کی صورت بہت مردِ آدمی کی سی، اور بہت سی کُنجیاں روپے(۸)، سونے کی کمر میں لٹکتیں ہوئیں۔ سلامٌ علیک کر کر میرے

پاس آکر بیٹھا۔ وُہیؔ دائی کہنے لگی کہ اَے بَہرؔ وَر! تو نے جو کچھ دیکھا ہے، مُفَصّل اُس کا بیان کر۔ بَہرؔ وَر نے یہ داستان کہنی شُروع کی اور مجھ سے مُخاطِب ہو کر بُولا: اَے عزیز! ہماری بادشاہ زادی کی سرکار میں ہزاروں غُلام ہیں کہ سَوداگری کے کام میں مُتعَیِّن ہیں، اُن میں سے ایک مَیں بھی اَدناؔ خانہ زاد ہوں۔ ہر ایک مُلک کی طرف لاکھوں روپَے کا اَسباب اَوؔر جِنس دے کر رُخصت فرماتی ہیں۔ جب وُہ وہاں سے پھر آتا ہے، تب اُس سے اُس دِیس کا اَحوال اپنے حُضور میں پوچھتی ہیںؔ اور سُنتی ہیں۔

ایک بار یہ اِتّفاق ہوا کہ یہ کم ترین تِجارت کی خاطِر چلا اور شَہرِ نیم رُوز (5)(6) میں پہنچا۔ وہاں کے باشندوں کو دیکھا تو سب کا لِباس سِیاہ ہے اور ہر دم نالہ و آہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن پر کچھ بڑی مصیبت پڑی ہے۔ اِس کا سبب جس سے مَیں پوچھتا، کوئی جواب میرا نہ دیتا۔ اِسی حیرت میں کئی رُوز گُزرے۔ ایک دن جُونہیں صُبح ہوئی؛ تمام آدمی چھوٹے بڑے، لڑکے بوڑھے، غریب غَنی شہر کے باہَر چلے، ایک میدان میں جا کر جمع ہوئے، اور اُس مُلک کا بادشاہ بھی، سب امیروں کو ساتھ لے کر، سوار ہوا اور وہاں گیا؛ تب سب برابر قطار باندھ کر کھڑے ہوئے۔

مَیں بھی اُن کے درمیان کھڑا تماشا دیکھتا تھا؛ پَر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وے سب کِسُو کا اِنتِظار کھینچ رہے ہیں۔ ایک گھڑی کے عرصے میں دُور سے ایک جوانِ پری زاد (7)، صاحِبِ جمال، پندرہ سُولہ بَرس کا سِنّ وسال (8)؛ غُل اور شُور کرتا ہوا اور کف مُنہ سے جاری، زَرد بَیل کی سواری، ایک ہاتھ میں کچھ

لیے، مُقابِل خلقُ اللہ[1] کے آیا اور اپنے بَیل پر سے اُترا۔ ایک ہاتھ میں ناتھ اور ایک ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر دو زانو بیٹھا۔ ایک گُل اَندام، پری چہرہ اُس کے ہمراہ تھا؛ اُس کو اُس جوان نے، وُہ چیز جو ہاتھ میں تھی، دی۔ وُہ یتیم، لے کر، ایک سرے سے ہر ایک کو دِکھاتا جاتا تھا۔ لیکن یہ حالت تھی کہ جو کوئی دیکھتا تھا، بے اِختیار ڈاڑھ مار کر رَوتا تھا۔ اِسی طَرح سب کو دِکھاتا اور رُلاتا ہوا، سب کے سامھنے سے ہو کر اپنے خاوِند کے پاس پھر گیا۔ اُس کے جاتے ہی وُہ جوان اُٹھا اور اُس غُلام کا سر شمشیر* سے کاٹ کر اور سوار ہو کر، جِدھر سے آیا تھا، اُدھر کو چلا۔ سب کھڑے دیکھا کیے۔ جب نظروں سے غائب ہوا، لوگ شہر کی طرف پھرے۔

مَیں ہر ایک سے اِس ماجرے کی حقیقت پوچھتا تھا، بلکہ روپیوں کا لالچ دیتا اور خوشامد، مِنّت کرتا کہ مجھے ذرا بتا دو کہ یہ جوان کون ہے، اور اِس نے یہ کیا حرکت کی، اور کہاں سے آیا اور کہاں گیا؛ ہرگز کسی نے نہ بتلایا اور نہ کچھ میرے خیال میں آیا۔ یہ تعجّب دیکھ کر، جب مَیں یہاں آیا اور مَلِکہ کے رُو بہ رُو اِظہار کیا؛ تب سے بادشاہ زادی بھی حَیران ہو رہی ہے اور اُس کے تحقیق کرنے کی خاطِر دُو دِلی ہو رہی ہے؛ لِہٰذا مَہر اپنا یہی مُقرّر کیا ہے کہ جو اُس عَجُوبے* کی کَمَا حَقُّہٗ[2]، خبر لاوِے، اُس کو پسند فرماوِے اور وُہی مالک سارے مال، مُلک کا اور مَلِکہ کا ہووِے۔

یہ ماجرا تم نے سب سُنا، اپنے دل میں غَور کرو؛ اگر تم اُس جوان کی خبر لا سکو، تو قَصد مُلکِ نیم رُوز کا کرو اور جلد روانہ ہو۔ نہیں تو، اِنکار کر کر اپنے گھر کی راہ لو۔

میں نے جواب دیا کہ اگر خُدا چاہے تو جلد اُس کا اَحوال سِر سے پانْو[1] تک دریافت کر کر، بادشاہ زادی کے پاس آ پہنچتا[2] ہوں اور کام یاب ہوتا ہوں۔ اور جو میری قسمت بَد ہے، تو اِس کا کچھ علاج نہیں؛ لیکن مَلِکہ اِس کا قَول[3] قرار کریں کہ اپنے کہنے سے نہ پھریں۔ اور بالفعل **ایک اندیشۂ مشکل میرے دل میں خلش کر رہا ہے؛** اگر مَلِکہ، غریب نَوازی اور مسافر پَروَری سے، حضور میں بلاویں اور پردے کے باہر بٹھلاویں اور میرا اِلتماس اپنے کانوں[4] سُنیں اور اُس کا جواب اپنی زُبان سے فرماویں؛ تو میری خاطِر جمع ہو اور مجھ سے سب کچھ ہو سکے۔

یہ میرے مطلب کی بات اُس ماما[5] نے رُو بہ رُو اُس پری پَیکر کے عَرض کی۔ بارے قدردانی کی راہ سے حُکم کیا کہ انھیں[6] بُلاؤ۔ دائی پھر باہَر آئی اور مجھے اپنے ساتھ، جس محل[9] میں بادشاہ زادی تھی، لے گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دو رُویہ صَف[10] باندھے، دَست بَستہ سَہیلیاں اور خَواصیں[11] اور اُردا بیگنیاں، قلما قنیاں، تُرکَنیاں، حَبَشنیاں، اُذبَکنیاں[12]، کشمیرنیاں؛ جواہِر میں جَڑی، عُہدے لیے کھڑی ہیں۔ اِندَر کا اَکھاڑا کہوں یا پریوں کا اُتارا! بے اِختیار ایک آہ، بے خودی سے، زُبان تک آئی اور کلیجا تھلکنے لگا؛ پَر بہ زُور اپنے تئیں تھانبا۔ اُن کو دیکھتا بھالتا اور سَیر کرتا ہوا آگے چلا، لیکن پانْو[13] سَو سَو مَن کے ہو گئے۔ جس کو دیکھوں، پھر یہ نہ جی چاہے کہ آگے جاؤں۔ ایک طرف چِلوَن پڑی تھی اور مُونڈھا جَڑاؤ بچھوا رکھا تھا اور ایک چوکی بھی صَندل کی بچھی تھی۔ دائی نے مجھے بیٹھنے کی اِشارَت کی۔ مَیں مُونڈھے پر بَیٹھ گیا اور وُہ چوکی پر۔ کہنے لگی: تو اَب جو کہنا ہے، سو جی بھر کر کہہ۔ میں[14] نے مَلِکہ کی خوبیوں کی اور عَدل و اِنصاف،

دادِ دِہش کی پہلے تعریف کی، پھر کہنے لگا: جب سے مَیں اِس مُلک کی سَرحد میں آیا، ہر ایک منزل میں یہی دیکھا کہ جا بہ جا مُسافِر خانے اور عمارتیں عالی بنی ہوئی ہیں، اور آدمی ہر ایک عُہدے کے تعیناتؔ ہیں، کہ خبر گیری مسافروں اور مُحتاجوں کی کرتے ہیں۔ مجھے بھی تین تین دن ہر ایک مقام میں گُزرے۔ چَوتھے رُوز جب رُخصت ہونے لگا، تب بھی کِسوُ نے خوشی سے نہ کہا کہ جاؤ۔ اور جتنا اَسباب اُس مکان میں تھا: شَطرنجی، چاندنی، قالینیں، سِیتَل پاٹی، مَنگل کوٹی، دیوار گیری، چھت، پردے، چِلوَنیں، سایبان، نَم گیرے، چھپَر کھٹ مَعَ غِلافؔ، اَدَقچہ، تُوشک، بالاپُوش، سیج بَند، چادر، تکیے، تکینی، گَل تکیے، مَسنَد، گاؤ تکیے، دِیگ، دِیگچے، پتیلے، طباق، رکابی، بادِیے، تَشتَری، چمچے، بَکاوَلی، کَف گیر، طَعام بَخش، سَرپُوش، سِینی، خوان پُوش، تُورَہ پُوش، آبخُورے، بجھرے، صُراحی، لگن، پان دان، چَوگھَرے، چَنگیر، گُلاب پاش، عُود سُوز، آفتابہ، چِلمچی؛ سب میرے حوالے کیے کہ یہ تمھارا مال ہے۔ چاہو ابؔ لے جاؤ، نہیں تو ایک کوٹھری میں بند کر کر اپنی مُہر کرو۔ جب تمھاری خوشی ہوگی، پھرتے ہوئے لیتےؔ جائیو۔ میں نے یوں نہیں کیا۔ پَر یہ حیرت ہے کہ جب مجھ سے فقیرِ تنہا سے یہ سُلوک ہوا، تو ایسے غریب ہزاروں تمھارے مُلکوں میں آتے جاتے ہوں گے؛ پَس اگر ہر ایک سے یہی مہمان داری کا طَور رہتا ہوگا، تو مَبلغ[11] بے حساب خَرچ ہوتے ہوں گے۔ پَس اِتنی دَولت کہ جس کا یہ صَرف ہے، کہاں سے آئی اور کیسی ہے؟ اگر گَنجِ[12] قارُوں ہو، تو بھی وَفا نہ کرے۔ اور ظاہر میں اگر مَلِکہ کی سلطنت پر نگاہ کیجے، تو اُس کی آمَدؔ،

فَقَط باوَرچی خانے کے خَرچ کو بھی کِفایَت نہ کرتی ہوگی، اَور خرچوں[۱] کا تو کیا ذِکر ہے۔
اگر اِس کا بیان مَلِکہ کی زُبان سے سُنوں، تو خاطِر جمع ہو، قَصدِ مُلکِ نیم رُوز کا کروں
اور جُوں تُوں وہاں جا پہنچوں۔ پھر سب اَحوال دریافت کر کے مَلِکہ کی خدمت میں،
بہ شرطِ زِندگی، بارِ دِگَر حاضِر ہوں، اپنے دل کی مُراد پاؤں۔
یہ سُن کر، مَلِکہ نے اپنی زُبان سے کہا کہ اَے جوان! اگر تجھے آرزو کمال ہے
کہ یہ ماہیَت[۲] دریافت کرے، تو آج کے دن بھی مُقام کر۔ شام کو تجھے حُضور میں
طَلَب کر کر؛ جو کچھ اَحوال اِس دَولَتِ بے زَوال کا ہے، بے کم و کاست کہا جائے گا۔
مَیں یہ تسلّی پا کر، اپنی اِستِقامَت کے مکان پر آکر مُنتَظِر تھا کہ کب شام ہو، جو
میرا مطلب تمام ہو۔ اِتنے میں خواجہ سَرا کئی چَوگوشے تُورہ پُوش پڑے، بھوئیوں
کے سر پر دَھرے آکر مَوجود ہوا اور بُولا کہ حُضور سے اُلشِ*[۳] خاص عِنایَت ہوا
ہے، اِس کو تَناوُل کرو۔ جس وقت میرے سامھنے کھولے، بو باس سے دِماغ
مُعَطَّر ہوا اور روح بھر گئی۔ جتنا کھا سکا کھالیا، باقی اُن سبھوں کو اُٹھا دیا اور
شُکرِ نِعمت کہہ بھیجا۔ بارے جب آفتاب، تمام دن کا مُسافِر تھکا ہوا، گرتا پڑتا
اپنے محَلّ[۴] میں داخِل ہوا اور ماہتاب، دیوان خانے میں اپنے مُصاحبوں کو ساتھ
لے کر نکل بیٹھا؛ اُس وقت دائی آئی اور مجھ سے کہنے لگی کہ چلو، بادشاہ زادی
نے یاد فرمایا ہے۔ مَیں اُس کے ہم راہ ہولیا۔ خِلوَتِ*[۵] خاص میں لے گئی۔ روشنی
کا یہ عالَم تھا کہ شبِ قَدر کو وہاں قَدر نہ تھی۔ اور بادشاہی فرش پر مسندِ
مُغرَّق بچھی، مُرَصَّع کا تکیہ لگا ہوا، اور اُس پر ایک شَمیانہ مُوتیوں کی جھالر
کا، جَڑاؤ اِستادوں پر کھڑا ہوا۔ اور سامھنے مسند کے جَواہِر کے درخت

پھول پات[۱] لگے ہوئے، گویا عین بین قُدرتی ہیں، سونے کی کیاریوں[۲] میں جمے ہوئے اور دونوں طرف دستِ راست اور دستِ چپ شاگرد پیشے اور مُجرائی دست بستہ، با اَدب، آنکھیں نیچی کیے ہوئے حاضِر تھے۔ اور طوائِف اور گائنیں ساروں کے سُر بنائے مُنتظِر۔ یہ سماں[۳] اور یہ تیاری کرّ و فر[۴] کی دیکھ کر عقل ٹھکانے نہ رہی۔ دائی سے پوچھا کہ دن کو وہ زیبایش اور رات کو یہ آرایش[۵] کہ دِن عید اور رات شبِ برات کہا چاہیے، بلکہ دُنیا میں بادشاہِ ہفت اِقلیم کو یہ عیش مُیسّر نہ ہوگا؛ ہمیشہ یہی صورت رہتی ہے؟ دائی کہنے لگی کہ ہماری مَلِکہ کا جتنا کارخانہ تم نے دیکھا، یہ سب اِسی دستور سے جاری ہے، اِس میں ہرگز خلل نہیں، بلکہ اَفزوں ہے۔ تم یہاں بیٹھو؛ مَلِکہ دوسرے مکان میں تشریف رکھتیں ہیں، جاکر خبر کروں۔

دائی یہ کہ کر گئی اور اُنھیں پانو[۶] پھر آئی کہ چلو حضور میں۔ یہ مُجرّد اُس مکان میں جاتے ہی بھیچک[۷] رہ گیا۔ نہ معلوم ہوا کہ دروازہ کہاں اور دیوار کِدھر ہے؛ اِس واسطے کہ حلبی[۸] آئینے قدِ آدم چاروں طرف لگے اور اُن کی پَردازوں میں ہیرے اور موتی جڑے ہوئے تھے۔ ایک کا عکس ایک میں نظر آتا تو یہ معلوم ہوتا کہ جواہر[۹] کا سارا مکان ہے۔ ایک طرف پردہ پڑا تھا، اُس کے پیچھے مَلِکہ بیٹھیں تھیں۔ وہ دائی پردے سے لگ کر بیٹھی اور مجھے بھی بیٹھنے کو کہا۔ تب دائی، مَلِکہ کے فرمانے سے، اِس طور[۱۰] بیان کرنے لگی کہ سُن اَے جوانِ دانا! سلطان اِس اِقلیم کا بڑا بادشاہ تھا۔ اُن کے گھر میں سات بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ایک روز بادشاہ نے جشن فرمایا۔ یے ساتوں لڑکیاں سولہ سنگار،

بارہ اَبھرن، بال بال گَج مُوتی پِرو کر بادشاہ کے حضور کھڑی[1] تھیں۔ سلطان کے کچھ جی میں آیا تو بیٹیوں کی طرف دیکھ کر فرمایا: اگر تمھارا باپ بادشاہ نہ ہوتا اور کسی غریب کے گھر[2] تم پیدا ہوتیں، تو تمھیں بادشاہ زادی اور مَلِکہ کون کہتا! خُدا کا شُکر کرو کہ شہ زادیاں کہلاتی ہو۔ تمھاری یہ ساری[3] خوبی میرے دَم سے ہے۔ چھ لڑکیاں[4] ایک زُبان ہو کر بولیں کہ جہاں پناہ جو فرماتے ہیں، بجا ہے اور آپ ہی کی سَلامَتی سے ہماری بھلائی ہے؛ لیکن یہ مَلِکہ[5] جہاں سب بہنوں سے چھوٹی تھیں، پَر عقل و شعور میں اُس عُمر میں بھی گویا سب سے بڑی تھیں، چُپکی کھڑی رہیں، اِس گُفتگو میں بہنوں کی[6] شریک نہ ہوئیں، اِس واسطے کہ یہ کلِمہ کُفر کا ہے۔ بادشاہ نے نظرِ غَضَب سے اِن کی طرف دیکھا اور کہا: کیوں بی بی! تم کچھ نہ بولیں، اِس کا کیا باعث ہے؟ تب مَلِکہ نے، دونوں ہاتھ اپنے رُوْمال[7] سے باندھ کر، عرض کی کہ اگر جان کی اَمان پاؤں اور تقصیر مُعاف ہو، تو یہ لونڈی اپنے دل کی بات گُزارش کرے۔ حُکم ہوا کہ کہہ کیا کہتی ہے؟ تب مَلِکہ نے کہا کہ قبلۂ عالَم! آپ نے سُنا ہے کہ سچّی بات کڑوی لگتی ہے، سُو اِس وقت مَیں اپنی زِندَگی سے ہاتھ دھو کر عرض کرتی ہوں۔ اور جو کچھ میری قسمت میں لکھنے والے نے لکھا ہے، اُس کا مٹانے والا کوئی نہیں، کِسو طَرح نہیں ٹلنے کا۔

خواہ تم پانْو[8] گھسو، یا کہ رکھو سر بہ سُجُود[9]
بات پیشانی کی جو کچھ ہے، سُو پیش آتی ہے[10]

جس بادشاہِ عَلَی الاِطْلاق نے آپ کو بادشاہ بنایا، اُنھیں نے مجھے بھی بادشاہ زادی

کہوایا۔ اُس کی قُدرت[2] کے کارخانے میں کسوُ کا اِختیار نہیں چلتا۔ آپ کی ذات ہماری وَلی نعمت اور[3] قبلہ وکعبہ ہے، حضرت کے قدم مُبارک کی خاک کو اگر سُرمہ کروں تو بجا ہے؛ مگر نصیب ہر[4] ایک کے، ہر ایک کے ساتھ ہیں۔

بادشاہ یہ سُن کر طَیش[5] میں آئے اور یہ جواب دل پر سخت گراں معلوم ہوا، بیزار ہو کر فرمایا: چھوٹا مُنہ بڑی بات! اب اِس کی یہی سزا ہے کہ گہنا پاتا جو کچھ اِس کے ہاتھ، گلے میں ہے، اُتار لو اور ایک میانے میں چڑھا کر، ایسے جنگل میں کہ جہاں نام ونشان[6] آدم زاد کا نہ ہو، پھینک آؤ؛ دیکھیں اِس کے نصیبوں میں کیا لکھا ہے۔

بہ مُوجِب حُکم[7] بادشاہ کے، اُس آدھی رات میں (کہ عَین اَندھیری تھی) مَلِکہ کو (جو جوبن[8] بھوتڑے میں پَلی تھیں[9] اور سوائے اپنے محل[10] کے دوسری جگہ نہ دیکھی تھی) بھونئی[*]، لے جا کر ایک مَیدان میں، کہ وہاں پَرِندہ[*] پَر نہ مارتا، انسان کا تو کیا ذِکر ہے، چھوڑ کر چلے آئے۔ مَلِکہ کے دل پر عجب حالت گزرتی تھی کہ ایک دَم میں کیا تھا اور کیا ہو گیا! پھر اپنے خُدا کی جناب میں شُکر کرتیں[11] اور کہتیں: تو ایسا ہی بے نیاز ہے۔ جو چاہا، سُو کیا اور جو چاہتا ہے، سُو کرتا ہے اور جو چاہے گا، سُو کرے گا۔ جب تلک نتھنوں میں دَم ہے، تجھ سے نااُمّید نہیں ہوتی۔ اِسی اندیشے میں آنکھ لگ گئی۔ جس وقت صُبح ہونے لگی، مَلِکہ کی آنکھ کُھل گئی، پُکاریں کہ وُضو کو پانی لاؤ[12]۔ پھر ایک بارگی رات کی بات چیت یاد آئی کہ تو کہاں اور یہ بات[13] کہاں! یہ کہہ کر، اُٹھ کر تیمّم کیا اور دوگانہ[14] شُکر کا پڑھا۔ اَے عزیز! مَلِکہ کی اُس حالت کے سُننے سے چھاتی پھٹتی ہے۔ اُس بھولے بھالے جی سے پوچھا

چاہیے کہ کیا کہتا ہوگا! غَرَض اُس رِمیانے میں بیٹھی ہوئی خُدا سے لَو لگائے رہتی تھیں
اور یہ کَبِت اُس دَم پڑھتی تھیں :

جب دانت نہ تھے تب دودھ دِیو ، جب دانت دِیے ، کہا : اَنّ نہ دَے ہے (۲)
جو جَل میں تھَل میں پَنچھی پَسُ کی سُدھ لیت ، سُو تیری بھی لے ہے
کاہے کو سوچ کرے مَن مؤرکھ ، سُوچ کرے کچھ ہاتھ نہ آے ہے
جان کو دِیت ، اَجان کو دِیت ، جہان کو دِیت ، سُو تُو کو بھی دَے ہے

سچ ہے : جب کچھ بَن نہیں آتا، تب خُدا ہی یاد آتا ہے؛ نہیں تو اپنی اپنی تدبیر میں ہر ایک لُقمان اور بُوعلی سِینا ہے ۔ اب خُدا کے کارخانے کا تماشا سُنو۔ اِسی طرح تین دن رات صاف گزر گئے کہ مَلِکہ کے مُنہ میں ایک کھیل بھی اُڑ کر نہ گئی ۔ وُہ پھول سا بدن سُوکھ کر کانٹا ہو گیا اور وُہ رنگ جو کُندَن سا دَمکتا تھا، ہَلدی سا بَن گیا۔ مُنہ میں پھیپھڑی بَندھ گئی، آنکھیں پتھرا گئیں؛ مگر ایک دَم اَٹک رہا تھا کہ وُہ آتا جاتا تھا۔ جب تلک سانس، تب تلک آس۔ چوتھے رُوز صُبح کو ایک دَرویش خِضر کی سی صورت، نورانی چہرہ، روشن دل، آکر پیدا ہوا، مَلِکہ کو اُس حالت میں دیکھ کر بُولا: اَے بیٹی! اگرچہ تیرا باپ بادشاہ ہے، لیکن تیری قسمت میں یہ بھی بَدا تھا۔ اب اِس فقیر بوڑھے کو اپنا خادِم سمجھ اور اپنے پیدا کرنے والے کا رات دن دھیان رکھ، خُدا خوب کرے گا۔ اور فقیر کے کَچکُول میں جو ٹکڑے بھیک* کے مَوجود تھے، مَلِکہ کے رُوبہ رُو رکھے اور پانی کی تلاش میں پھرنے لگا۔ دیکھے تو ایک کُنواں* تو ہے، پَر ڈُول، رسّی کہاں، جس سے پانی بھرے۔ تھوڑے پتّے درخت سے توڑ کر دُونا بنایا اور

اپنی سیلی کھول کر، اُس میں باندھ کر پانی نکالا اور مَلکہ کو کچھ کھلایا پلایا۔ بارے ٹک ہوش آیا۔ اُس مردِ خدا نے، بے کس اور بے بس جان کر، بہت سی تسلّی دی، خاطر جمع کی اور آپ بھی رونے لگا۔ مَلکہ نے جب غم خواری اور دل داری اُس کی بے حد[2] دیکھی، تب اُن کے بھی مزاج کو استقلال ہوا۔ اُس روز سے اُس پیر مرد نے یہ مقرّر کیا کہ صبح کو بھیک[3] مانگنے کے لیے شہر میں نکل جاتا۔ جو ٹکڑا پارچہ پاتا، مَلکہ کے پاس لے آتا اور کھلاتا۔

اِس طور سے تھوڑے روز گزرے۔ ایک دن مَلکہ نے تیل سر میں ڈالنے اور کنگھی چوٹی کرنے کا قصد کیا۔ جونہیں مباف کھولا، چٹلے میں سے ایک موتی کا دانہ گول، آب دار نکل پڑا۔ مَلکہ نے اُس درویش کو دیا اور کہا: شہر میں سے اِس کو بیچ[4] لاؤ۔ وہ فقیر اُس گوہر کو بیچ[5] کر اُس کی قیمت بادشاہ زادی کے پاس لے آیا۔ تب مَلکہ نے حکم کیا کہ ایک مکان موافق گزران کے اِس جگہ بنواؤ۔ فقیر نے کہا: اَے بیٹی! نیو* دیوار کی کھود کر، تھوڑی سی مٹّی جمع کرو؛ ایک دن میں پانی لاکر، گارا[6] کرکر، گھر کی بنیاد درست کردوں گا۔ مَلکہ نے اُس کے کہنے سے مٹّی کھودنی شروع کی۔ جب ایک گز عمیق گڑھا کھودا گیا، زمین کے نیچے سے ایک دروازہ نمود ہوا۔ مَلکہ نے اُس در کو صاف کیا، ایک بڑا گھر جواہر اور اَشرفیوں سے معمور نظر آیا۔ مَلکہ نے پانچ چار لپ اَشرفیوں کی لے کر، پھر بند کیا اور مٹّی دے کر اوپر سے ہموار کردیا۔ اِتنے میں فقیر آیا۔ مَلکہ نے فرمایا کہ راج اور معمار کاریگر اور اپنے کام کے اُستاد اور مزدورِ جلد دست[9] بلاؤ، جو اِس مکان پر ایک عمارتِ بادشاہانہ، کہ طاقِ کسریٰ کا جفت[10] ہو اور قصرِ نعمان[11]

سے بَنقَشت لے جائے ؛ اور شہر پناہ اور قلعہ اور باغ اور باولی اور ایک مُسافِر خانہ کہ لاثانی ہو، جلد تیار کریں ؛ لیکن پہلے نقشہ اُن کا ایک کاغذ پر دُرست کرکے حُضور میں لا دیں، جو پسند کیا جائے۔

فقیر نے ایسے ہی کارکُن کارکردہ، ذی ہُوش لاکر حاضر کیے۔ مُوافِق فرمانے کے تعمیر عمارت کی ہونے لگی۔ اور نوکر چاکر ہر ایک کارخانہ جات کی خاطر چُن چُن کر، فَہمیدہ اور بادِیانَت، مُلازِم ہونے لگے۔ اُس عمارتِ عالی شان کی تیاری کی خبر رَفتہ رَفتہ بادشاہِ ظِلِّ سُبحانی کو، جو قبلہ گاہ مَلِکہ کے تھے، پہنچی۔ سُن کر بہت مُتعجّب ہوئے اور ہر ایک سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے جن نے یہ محلّات بنانے شروع کیے ہیں؟ اُس کی کیفیت سے کوئی واقِف نہ تھا جو عرض کرے۔ سبھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ کوئی غُلام نہیں جانتا کہ اِس کا بانی کون ہے۔ تب بادشاہ نے ایک امیر کو بھیجا اور پیغام دیا کہ مَیں اُن مکانوں کے دیکھنے کو آیا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی معلوم نہیں کہ تم کہاں کی بادشاہ زادی ہو اور کس خاندان سے ہو؛ یہ سب کیفیت دریافت کرنی اپنے تئیں منظور ہے۔

جُونہیں مَلِکہ نے یہ خوش خبری سُنی، دل میں بہت شاد ہوکر عرضی لکھی کہ جہاں پناہ سلامت! حُضور کے تشریف لانے کی خبر طرف غریب خانے کے سُن کر نہایت خوشی حاصل ہوئی اور سبب حُرمت اور عزّت اِس کم ترین کا ہوا۔ زِہے طالِع اُس مکان کے کہ جہاں قدَمِ مُبارک کا نشان پڑے اور وہاں کے رہنے والوں پر دامَنِ دَولت سایہ کرے اور نَظَرِ تَوَجّہ سے وِے دونوں سرفراز ہووِیں! یہ لَونڈی اُمّیدوار ہے کہ کل رُوزِ پَنجشَنبہ رُوزِ مُبارک ہے اور

میرے نزدیک بہتر رُوزِ نَورُوز سے ہے، آپ کی ذات مُشابہ آفتاب کے ہے؛ تشریف فرما کر، اپنے نور سے اِس ذرّۂ بے مقدار کو قدر و منزلت بخشیے اور جو کچھ اِس عاجزہ سے مُیَسّر ہو سکے، نوشِ جاں فرمائیے۔ یہ عین غریب نوازی اور مسافر پروری ہے، زیادہ حدِّ اَدب۔ اور اُس عُمدہ[۴] کو بھی کچھ تواضع کر کر رُخصت کیا۔

بادشاہ نے عرضی پڑھی اور کہلا بھیجا کہ ہم نے تمھاری دعوت قبول کی، البتّہ آویں گے۔ مَلِکہ نے نوکروں اور سب کارباریوں کو حُکم کیا کہ لوازمہ ضیافت کا ایسے سلیقے سے تیّار ہو کہ بادشاہ دیکھ کر اور کھا کر بہت محظوظ ہوں اور اَدنا اَعلا جو بادشاہ کی رِکاب میں آویں، سب کھا پی کر خوش ہو کر جاویں۔ مَلِکہ کے فرمانے اور تاکید کرنے سے سب قسم کے کھانے سلونے اور میٹھے اِس ذائقے کے تیّار ہوئے کہ اگر باہمن کی بیٹی کھاتی، تو کلمہ پڑھتی۔ جب شام ہوئی، بادشاہ مُنڈے تخت پر سوار ہو کر مَلِکہ کے مکان کی طرف تشریف لائے۔ مَلِکہ اپنی خاصّ[۲] خواصّ[۳]، سہیلیوں کو لے کر اِستقبال کے واسطے چلیں۔ جوں بادشاہ کے تخت پر نظر پڑی، اِس آداب[۴] سے مُجرا شاہانہ کیا کہ یہ قاعدہ دیکھ کر بادشاہ کو اور بھی حیرت نے لیا۔ اور اُسی انداز سے جلَو[۵] کر کر بادشاہ کو تختِ مُرَصّع پر لا بٹھایا۔ مَلِکہ نے سوا لاکھ روپے کا چبوترہ[۶] تیّار کروا رکھا تھا، اور ایک سَو ایک کشتی جَواہر اور اَشرفی اور پشمینہ اور نوربافی اور ریشمی اور طِلا بافی اور زَردوزی کی لگا رکھی تھی، اور دو زنجیر فیل اور دس راس اَسپ[۷] عراقی اور یمنی مُرَصّع کے ساز سے تیّار کر رکھے تھے؛ نذر[۸] گزرانے اور آپ دونوں ہاتھ باندھے رُو بہ رُو کھڑی رہیں۔ بادشاہ نے بہت مہربانی[۹] سے فرمایا کہ تم کس مُلک کی شہزادی ہو

اور یہاں کس صورت سے آنا ہوا؟

مَلکہ نے آداب بجا لاکر اِلتماس کیا کہ یہ لونڈی وہی گُنہ گار ہے جو غضبِ[1] سُلطانی کے باعث اِس جنگل میں پہنچی، اور یِہ[2] سب تماشے خُدا کے ہیں جو آپ دیکھتے ہیں۔ یہ سُنتے ہی بادشاہ کے لہو نے جوش مارا، اُٹھ کر محبّت سے گلے لگا لیا اور ہاتھ پکڑ کے، اپنے تخت کے پاس کُرسی بچھوا کر، حُکم بیٹھنے کا کیا[3]؛ لیکن بادشاہ حیران اور مُتعجّب بیٹھے تھے۔ فرمایا کہ بادشاہ بیگم کو کہو کہ بادشاہ زادیوں کو اپنے ساتھ لے کر جلد آوِیں۔ جب وِے[4] آئیں؛ ماں[5]، بہنوں نے پہچانا اور گلے مل کر رُوئیں اور شُکر کیا۔

مَلکہ نے اپنی والدہ اور چھوں* ہمشیروں کے رُو بہ رُو اِتنا کچھ نقد اور جواہر رکھا کہ خزانہ تمام عالَم کا اُس کے پاسنگ میں نہ چڑھے۔ پھر بادشاہ نے سب کو ساتھ بِٹھا کر خاصہ[6] نُوشِ جاں فرمایا۔ جب تلک جہاں پناہ جیتے رہے، اِسی طرح گزری: کبھو کبھو[7] آپ آتے اور کبھی مَلکہ کو بھی اپنے ساتھ محلوں[8] میں لے جاتے۔

جب بادشاہ نے رِحلت فرمائی، سلطنت اِس اِقلیم کی مَلکہ کو پہنچی، کہ اِن کے سِوا دوسرا کوئی لائق اِس کام کے نہ تھا۔

اَے عزیز! سرگُذشت یہ ہے جو تو نے سُنی۔ پَس دولتِ خُداداد کو ہرگز زَوال نہیں ہوتا، مگر آدمی کی نیّت[9] درست چاہیے؛ بلکہ جتنی خرچ کرو، اُس میں اُتنی[10] ہی برکت ہوتی ہے۔ خُدا کی قُدرت میں تعجب کرنا کسی مذہب میں رَوا نہیں۔ دائی نے یہ بات کہ کر کہا کہ[11] اب اگر قصد وہاں کے جانے کا اور اُس

خبر لانے کا دل میں مُقرّر رکھتے ہو تو جلد روانہ ہو۔ میں نے کہا: اِسی وقت مَیں جاتا ہوں، اور خُدا چاہے تو جلد پھر آتا ہوں۔ آخر رُخصت ہو کر اور فَضلِ اِلٰہی پر نظر رکھ کر اُس سَمت کو چلا۔

بَرَس دِن کے عرصے میں، ہَرج مَرج کھینچتا ہوا شہرِ نیم رُوز میں جا پہنچا۔ جتنے وہاں کے آدمی بَزاری اور بَزاری نَظَر پڑے، سیاہ پُوش تھے۔ جیسا اَحوال سُنا تھا، اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کئی دنوں کے بعد چاند رات ہوئی۔ پہلی تاریخ سارے لوگ اُس شہر کے چھوٹے بڑے، لڑکے بالے، اُمَرا بادشاہ، عورت مرد ایک میدان میں جمع ہوئے۔ مَیں بھی اپنی حالت میں حَیران، سَرگَرداں اُس کثرت کے ساتھ، اپنے مال مُلک سے جُدا، فقیر کی صورت بنا ہوا کھڑا دیکھتا تھا کہ دیکھیے پَردۂ غَیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے! اِتنے میں ایک جوان گاؤ سوار، مُنہ میں کف بھرے، جُوش خرُوش کرتا ہوا جنگل میں سے باہر نکلا۔ یہ عاجز، جو اِتنی محنت کرکے اُس کے احوال دریافت کرنے کی خاطر گیا تھا، دیکھتے ہی اُسے، حَواس باختہ ہو کر حَیران کھڑا رہ گیا۔ وہ جواں مرد قَدیم قاعدے پر جو جو کام کرتا تھا، کرکر پھر گیا اور خِلقت شہر کی شہر کی طرف مُتَوَجّہ ہوئی۔ جب مجھے ہُوش آیا، تب مَیں پچتایا کہ یہ کیا تجھ سے حرکت ہوئی! اب مہینے بھر پھر راہ دیکھنی پڑی! لاچار سب کے ساتھ چلا آیا اور اُس مہینے کو ماہِ رمضان کی مانند ایک ایک دن گن گن کر کاٹا۔ بارے دوسری چاند رات آئی، مجھے گُویا عید ہوئی۔ غُرّے کو پھر بادشاہ خِلقت سَمیت وَہیں جا کر اِکٹھے ہوئے۔ تب میں نے دل میں مُصَمّم اِرادہ کیا کہ اب کی بار جو ہُو سُو ہُو، اپنے تئیں سَنبھال کر اِس ماجرائے عجیب

کو معلوم کیا چاہیے۔ ناگاہ جوان بہ دستور زَرد بَیل[۱] پر زین باندھے سوار ہو آپہنچا اور اُتر کر دوزانُو[۲] بیٹھا۔ ایک ہاتھ میں ننگی سَیف اور ایک ہاتھ میں بَیل کی ناتھ پکڑی اور مرتبان غُلام کو دیا۔ غُلام ہر ایک کو دِکھا کر لے گیا۔ آدمی دیکھ کر رُونے لگے۔ اُس جوان نے مرتبان پھوڑا اور غُلام کو ایک تلوار ایسی ماری کہ سر جُدا ہو گیا اور آپ سوار ہو کر مُڑا۔ مَیں اُس کے پیچھے جلد قدم اُٹھا کر چلنے لگا۔ شہر کے آدمیوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا: یہ کیا کرتا ہے! کیوں جان بُوجھ کر مرتا ہے! اگر ایسا ہی تیرا دم ناک میں آیا ہے، تو بہتیری طرحیں[۳] مرنے کی ہیں، مر رہیو۔ ہر چند میں نے مِنّت کی اور زُور بھی کیا کہ کِسُو صورت سے اُن کے ہاتھ سے چھوٹوں، چُھٹکارا نہ ہوا۔ دُو چار آدمی لِپٹ گئے اور پکڑے ہوئے بستی کی طرف لے آئے۔ عجب طرح کا قَلَق پھر مہینے بھر گُزرا۔

جب وُہ بھی مہینا تمام ہوا اور سَلخ کا دِن آیا؛ صُبح کو اُسی صورت سے سارے[۴] عالَم کا وَہاں اِزدِحام ہوا۔ مَیں الگ سب سے، نماز کے وقت اُٹھ کر، آگے ہی جنگل میں، جو عَین اُس جوان کی راہ پر تھا، گُھس کر چِھپ[۵] رہا کہ یہاں تُو کوئی میرا مُزاحِم نہ ہوگا۔ وُہ شخص اُسی قاعِدے سے آیا اور وُہی حرکتیں[۶] کر کر سوار ہوا اور چلا۔ میں نے اُس کا پیچھا کیا اور دَوڑتا دھوپتا ساتھ ہو لیا۔ اُس عزیز نے آہٹ سے معلوم کیا کہ کوئی چلا آتا ہے؛ ایک بارگی باگ مُوڑ کر ایک نعرہ مارا اور گھُرکا، تلوار کھینچ کر میرے سر پر آ پہنچا، چاہتا تھا کہ حملہ کرے۔ میں نے نہایت ادب سے نِہُڑ[۷] کر سلام کیا اور دونوں[۸] ہاتھ باندھ کر کھڑا رہ گیا۔ وُہ قاعدہ داں مُتکلِّم ہوا کہ اَے فقیر! تُو ناحق[۹] مارا گیا ہوتا، پَر بچ گیا، تیری حیات کچھ باقی ہے؛ جا،

کہاں آتا ہے! اور جَڑاؤ خنجر موتیوں کا اور آوِیزہ لگا ہوا کمر سے نکال کر میرے آگے پھینکا اور کہا: اِس وقت میرے پاس کچھ نقد مَوجود نہیں جو تجھے دوں، اِس کو بادشاہ پاس لے جا؛ جو تُو مانگے گا، ملے گا۔ ایسی ہَیبت اور ایسا رُعب اُس کا مجھ پر غالب ہوا کہ نہ بولنے کی قُدرت، نہ چلنے کی طاقت؛ مُنہ میں گھگّی بندھ گئی، پانو بھاری ہو گئے۔

اِتنا کہہ کر وُہ غازی مرد نعرہ بھرتا ہوا چلا۔ میں نے دل میں کہا: ہرچہ بادا باد! اب رہ جانا تیرے حق میں بُرا ہے، پھر ایسا وقت نہ ملے گا۔ اپنی جان سے ہاتھ دھو کر میں بھی روانہ ہوا۔ پھر وُہ پِھرا اور بڑے غُصّے سے ڈانٹا اور مُقرّر اِرادہ میرے قتل کا کیا۔ میں نے سر جُھکا دیا اور سَوگند دی کہ اَے رُستمِ وقت کے! ایسی ہی ایک سَیف مار کہ صاف دُو ٹکڑے ہو جاؤں، ایک تَسمہ باقی نہ رہے اور اِس حَیرانی اور تباہی سے چھوٹ جاؤں، میں نے اپنا خون مُعاف کیا۔ وُہ بولا کہ اَے شَیطان کی صورت! کیوں اپنا خونِ ناحق میری گردن پر چڑھاتا ہے اور مجھے گُنہ گار بناتا ہے! جا اپنی راہ لے، کیا جان بھاری پڑی ہے؟ میں نے اُس کا کہا نہ مانا اور قدم آگے دَھرا۔ پھر اُس نے دِیدہ و دانستہ آنا کانی دی اور مَیں پیچھے لگ لِیا۔ جاتے جاتے دُو کُوس وُہ جھاڑ جنگل طے کیا۔ ایک چار دیواری نظر آئی۔ وُہ جوان دروازے پر گیا اور ایک نعرۂ مُہیب* مارا۔ وُہ در آپ سے آپ کُھل گیا۔ وُہ اندر بیٹھا، مَیں باہر کا باہر کھڑا رہ گیا۔ اِلٰہی اب کیا کروں! حَیران تھا۔ بارے ایک دَم کے بعد غُلام آیا اور پَیغام لایا کہ چل، تجھے رُو بہ رُو بُلایا ہے، شاید تیرے سر پر اَجَل کا فرِشتہ آیا ہے! کیا تجھے

کم بختی لگی تھی! میں نے کہا: زہے نصیب! اور بے دھڑک اُس کے ساتھ اندر باغ کے گیا۔

آخر ایک مکان میں لے گیا، جہاں وُہ بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے دیکھ کر فرشی سلام کیا۔ اُس نے اِشارت بیٹھنے کی کی۔ میں اَدَب سے دو زانو بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وُہ مرد اکیلا ایک مَسند پر بیٹھا ہے اور ہتھیار زرگری کے آگے دَھرے ہیں اور ایک جھاڑ زُمُرّد کا تیار کر چکا ہے۔ جب اُس کے اُٹھنے کا وقت آیا؛ جتنے غُلام اُس شَہ نَشِین کے گِرد پیش حاضِر تھے، حُجروں میں چھپ گئے۔ مَیں بھی مارے وَسواس کے ایک کوٹھری میں جا گُھسا۔ وُہ جوان اُٹھ کر، سب مکانوں کی کُنڈِیاں چڑھا کر، باغ کے کونے کی طرف چلا اور اپنی سواری کے بَیل کو مارنے لگا۔ اُس کے چِلّانے کی آواز میرے کان میں آئی، کلیجا کانپنے لگا؛ لیکن اِس ماجرے کے دریافت کرنے کی خاطر یہ سب آفتیں سَہیں تھیں، ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول کر ایک درخت کے تَنے کی آڑ میں جا کر کھڑا ہوا اور دیکھنے لگا۔ جوان نے وُہ سونٹا جس سے مارتا تھا، ہاتھ سے ڈال دیا اور ایک مکان کا قُفل کُنجی سے کھولا اور اندر گیا۔ پھر وُہ وُنہیں باہَر نکل کر، نَرگاو کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور مُنہ چوما اور دانہ گھاس کھلا کر اِیدَھر کو چلا۔ مَیں دیکھتے ہی جلد دَوڑ کر پھر کوٹھری میں جا چھپا۔

اُس جوان نے زنجیریں سب دروازوں کی کھول دیں، سارے غُلام باہَر نکلے۔ زیر اَنداز اور سِلَفچی، آفتابہ لے کر حاضِر ہوئے۔ وُہ وُضو کر کر نماز کی خاطِر کھڑا ہوا۔ جب نماز اَدا کر چکا، پکارا کہ وُہ دَرویش کہاں ہے؟ اپنا نام سُنتے ہی مَیں دَوڑ کر رُو بہ رُو جا کھڑا ہوا۔ فرمایا: بیٹھ۔ مَیں تسلیم کر کر بیٹھا۔ خاصہ

آیا، اُس نے تَناوُل فرمایا، مجھے بھی عِنایَت کیا، میں نے بھی کھایا۔ جب دسترخوان بڑھایا اور ہاتھ دُھوئے، غُلاموں کو رُخصت دی کہ جاکر سُو رہو۔ جب کوئی اُس مکان میں نہ رہا، تب مجھ سے ہَم کلام ہوا اور پوچھا کہ اَے عزیز! تجھ پر کیا ایسی آفت آئی ہے جو تُو اپنی مَوت کو ڈھونڈھتا پھرتا ہے؟

میں نے اپنا اَحوال آغاز سے انجام تک، جو کچھ گزرا تھا، تَفصیل وار بیان کیا اور کہا: آپ کی تَوَجُّہ سے اُمّید ہے کہ اپنی مُراد کو پہنچوں۔ اُس نے یہ سُنتے ہی ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بے ہُوش ہوا اور کہنے لگا: بارِ[۱] خُدایا! عشق کے درد سے تیرے سِوا کون واقف ہے! جس کی نہ پھٹی ہو بِوائی، کیا جانے پِیر[۲] پَرائی۔ اِس درد کی قدر دردمند[۳] ہو سُو جانے۔

آفتوں کو عشق کی، عاشق سے پوچھا چاہیے

کیا خبر فاسق کو ہے، صادِق سے پوچھا چاہیے

بعد ایک لمحے کے ہُوش میں آکر ایک آہِ جگر سُوز بھری کہ[۴] سارا مکان گُونج گیا۔ تب مجھے یقین ہوا کہ یہ بھی اِسی عشق کی بلا میں گرِفتار ہے اور اِسی مَرَض کا بیمار ہے۔ تب تُو میں نے دِل چلا کر کہا کہ میں نے اپنا اَحوال سب عرض کیا؛ آپ تَوَجُّہ فرما کر اپنی سَرگُذشت سے بندے کو مُطّلَع فرمائیے، تو بہ مَقدُور اپنے پہلے تمھارے واسطے سَعْی کروں اور دل کا مطلب، کوشش کر کر، ہاتھ میں لاؤں۔

اَلْقِصَّہ وہ عاشِقِ صادِق مجھ کو اپنا ہم راز اور ہمدرد جان کر، اپنا ماجرا اِس صورت سے بیان کرنے لگا کہ سُن اَے عزیز! مَیں بادشاہ زادۂ جگر سُوز اِس

اِقلیمِ نیم رُوز کا ہوں۔ بادشاہ یعنی قبلہ گاہ نے، میرے پیدا ہونے کے بعد نجومی اور رَمّال اور پنڈت جمع کیے اور فرمایا کہ اَحوال شہ زادے کے طالعوں کا دیکھو اور جانچو اور جنم پتری درست کرو۔ اور جو جو کچھ ہونا ہے، حقیقت پل پل، گھڑی گھڑی اور پہر پہر اور دِن دِن، مہینے مہینے اور برس برس کی مُفصّل حُضور میں عرض کرو۔ بہ مُوجِب حُکمِ بادشاہ کے سب نے مُتّفِق ہو، اپنے اپنے علم کے رُو سے ٹھہرا اور سادھ کر اِلتماس کیا کہ خُدا کے فَضل سے ایسی نیک ساعت اور شُبھ لگن میں شہ زادے کا تولّد اور جنم ہوا ہے کہ چاہیے سِکندر کی سی بادشاہت کرے اور نوشیرواں سا عادِل ہو؛ اور جتنے علم اور ہنر ہیں، اُن میں کامل ہو؛ اور جس کام کی طرف دل اُس کا مائل ہو، وُہ بہ خوبی حاصل ہو؛ سخاوت و شُجاعت میں ایسا نام پیدا کرے کہ حاتم اور رُستم کو لوگ بھول جاویں؛ لیکن چودہ برس تلک سورج اور چاند کے دیکھنے سے ایک بڑا خطرہ نظر آتا ہے، بلکہ یہ وَسواس ہے کہ جُنونی اور سَودائی ہو کر بہت آدمیوں کا خون کرے اور بستی سے گھبراوے، جنگل میں نکل جاوے اور چرند پرند کے ساتھ دل بہلاوے۔ اِس کا تقیّد رہے کہ رات دن آفتاب، ماہ تاب کو نہ دیکھے، بلکہ آسمان کی طرف بھی نگاہ نہ کرنے پاوے۔ جو اِتنی مُدّت خیر و عافیت سے کٹے، تو پھر ساری عُمر سُکھ اور چَین سے سلطنت کرے۔

یہ سُن کر بادشاہ نے اِسی لیے اِس باغ کی بِنا ڈالی اور مکانِ مُتعدّد ہر ایک نقشے کے بنوائے۔ میرے تئیں تہ خانے میں پلنے کا حُکم کیا اور اوپر ایک بُرج نمدے کا تیار کروایا، تو دھوپ اور چاندنی اُس میں سے نہ چھنے۔ میں دائی، دودھ پلائی اور

اَنگا، پھوپھو اور کئی خواصّوں[1] کے ساتھ اِس مُحافظت سے اُس مکانِ عالی شان میں پَرْوَرِش پانے لگا۔ اور ایک اُستادِ دانا[2]، کار آزمُودہ واسطے میری تربیت[3] کے مُتعَیّن کیا، تو تعلیم ہر علْم اور ہُنَر کی اور مشق ہَفْت قَلَم لکھنے کی کرے۔ اور جہاں پناہ ہمیشہ میرے خَبَر گیراں رہتے، دَم بہ دَم کی کیفیّت[4] رُوز مَرّہ حُضور میں عرض ہوتی۔ مَیں اُس مکان ہی کو عالَمِ دُنیا جان کر، کھلُونوں* اور رنگ بہ رنگ پھولوں سے کھیلا کرتا۔ اور تمام جہان کی نعمتیں کھانے کے واسطے مَوجود رہتیں، جو چاہتا سُو کھاتا۔ دس بَرَس کی عُمر تک، جتنی صنعتیں اور قابلیّتیں تھیں، تحصیل کیں۔

ایک رُوز اُس گُنبذ* کے نیچے روشن دان سے ایک پھول اَچنبھے کا نظر پڑا، کہ دیکھتے دیکھتے بڑا ہوتا جاتا تھا۔ میں نے چاہا کہ ہاتھ سے پکڑ لوں؛ جُوں[5] جُوں مَیں ہاتھ لمبا[6] کرتا تھا، وُہ اونچا ہوتا[7] جاتا تھا۔ مَیں حَیران ہوکر اُسے تَک رہا تھا، وُونہیں ایک آواز قَہقَہے کی میرے کان میں آئی۔ میں نے اُس کے دیکھنے کو گردن اُٹھائی۔ دیکھا تو نُمدا چیر کر ایک ٹکڑا چاند کا سا نکل رہا ہے۔ دیکھتے ہی اُس کے میرے عقْل و ہُوش بہ جا نہ رہے۔ پھر اپنے تئیں سَنبھال کر دیکھا تو ایک مُرَصَّع کا تخت پری زادوں کے کاندھے پر مُعلَّق کھڑا ہے اور ایک تخت نشیں، تاج جَواہِر کا سر پر اور خِلعت جھلا بُور بدن میں پہنے، ہاتھ میں یاقوت کا پیالہ[8] لیے اور شراب پیے ہوئے بیٹھی ہے۔ وُہ[9] تخت بَلندی سے آہستہ آہستہ نیچے اُتر کر اُس بُرج میں آیا۔ تب پری نے مجھے بُلایا اور اپنے نزدیک بٹھایا، باتیں پیار کی کرنے لگی اور مُنہ سے مُنہ لگاکر، ایک جام شرابِ گُلِ گُلاب[10] کا میرے تئیں پِلایا اور کہا: آدمی زاد بے وَفا ہوتا ہے، لیکن دل ہمارا تجھے چاہتا ہے۔ ایک دم میں ایسی ایسی انداز و ناز کی باتیں کیں کہ دِل

محو ہوگیا اور ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ زِندگانی کا مزا[1] پایا اور یہ سمجھا کہ آج تو دُنیا میں آیا۔

حاصِل یہ ہے کہ مَیں تو کیا ہوں، کِسو نے یہ عالَم نہ دیکھا ہوگا نہ سُنا ہوگا۔ اُس مزے میں خاطِر جمع سے ہم دونوں بیٹھے تھے کہ کُریال[2] میں غُلیلا لگا۔ اب اُس حادِثۂ ناگہانی[3] کا ماجرا سُن، کہ وُونہیں چار پری زادنے آسمان پر سے اُتر کر کچھ اُس معشوق[4] کے کان میں کہا۔ سُنتے ہی اُس کا چہرہ تغیّر ہوگیا اور مجھ سے بُولی کہ اَے پیارے! دِل تو یہ چاہتا تھا کہ کوئی دم تیرے ساتھ بیٹھ کر دل بہلاؤں اور اِسی طَرح ہمیشہ آؤں، یا تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں؛ پَر یہ آسمان دُو شخص کو ایک جگہ آرام سے اور خوشی سے رہنے نہیں دیتا۔ لے جاناں[5]! تیرا خُدا نگہبان ہے۔ یہ سُن کر میرے حواس[6] جاتے رہے اور طوطے[7] ہاتھ کے اُڑ گئے۔ میں نے کہا کہ اَجی! اب پھر کب مُلاقات ہوگی؟ یہ کیا تم نے غَضَب کی بات سُنائی! اگر جلد آؤگی تو مجھے جیتا پاؤگی، نہیں تو پچتاؤگی۔ یا اپنا ٹھکانا اور نام و نشان بتاؤ کہ مَیں ہی اُس پتے پر ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے، اپنے تئیں تمھارے پاس پہنچاؤں۔ یہ سُن کر بُولی: دُور پار! شیطان کے کان بہرے! تمھاری صد و بیست سال[8] کی عُمر ہووے۔ اگر زِندگی ہے تو پھر مُلاقات ہو رہے گی؛ مَیں جِنوں[9] کے بادشاہ کی بیٹی ہوں اور کوہِ قاف میں رہتی ہوں۔ یہ کہہ کر تخت اُٹھایا اور جس طَرح اُترا تھا، وُونہیں بَلند ہونے لگا۔

جب تلک سامھنے تھا، میری اور اُس کی چار آنکھیں ہو رہیں[10] تھیں۔ جب نظروں سے غائب ہوا، یہ حالت ہوگئی جیسے پَری کا سایہ ہوتا ہے۔ عَجَب طَرح کی

اُداسی دل پر چھاگئی۔ عقل و ہوش رُخصت ہوا، دُنیا آنکھوں کے تلے اندھیری ہوگئی۔ حیران پَریشان، زار زار رُونا اور سِر پر خاک اُڑانا، کپڑے پھاڑنا۔ نہ کھانے کی سُدھ، نہ بھلے بُرے کی بُدھ۔

اِس عشق کی بَدولت کیا کیا خرابیاں ہیں
دل میں اُداسیاں ہیں اور اِضطرابیاں ہیں

اِس خرابی سے دائی اور مُعلّم خبردار ہوئے، ڈرتے ڈرتے بادشاہ کے رُو بہ رُو گئے اور عرض کی کہ بادشاہ زادۂ عالَمیاں کا یہ حال ہے معلوم نہیں خود بہ خود یہ کیا غَضَب ٹوٹا، جو اُن کا آرام اور کھانا پینا سب چھوٹا۔ تب بادشاہ، وزیر، اُمَرائے صاحبِ تدبیر[۲] اور حکیمِ حاذِق، مُنَجّمِ صادِق، مُلّا، سیانے خوب، درویشِ سالِک[۳] اور مجذوب اپنے ساتھ لے کر اُس باغ میں رَونق اَفزا ہوئے۔ میری بے قراری اور نالہ وزاری دیکھ کر اُن کی بھی حالت اِضطِراب کی ہوگئی۔ آب دیدہ ہو کر بے اِختِیار گلے سے لگا لیا اور اُس کی تدبیر کی خاطر حُکم کیا۔ حکیموں نے قُوّتِ دل اور خَلَلِ دِماغ کے واسطے نسخے لکھے[۴] اور مُلّاؤں نے نقش و تعویذ پِلانے اور پاس رکھنے کو دِیے، دُعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگے۔ اور نجومی بولے کہ ستاروں کی گردش کے سبب یہ صورت پیش آئی ہے، اِس کا صَدَقہ دیجیے۔

غَرَض ہر کوئی اپنے اپنے علم کی باتیں کہتا تھا؛ پَر مجھ پر جو گزرتی تھی، میرا دل ہی سہتا تھا۔ کسوُ کی سَعی اور تدبیر میری تقدیرِ بَد کے کام نہ آئی۔ دن بہ دن دیوانگی کا زُور ہوا اور میرا بدن بے آب و دانے کم زُور ہو چلا، رات دن چِلّانا اور سِر پٹکنا ہی باقی رہا۔ اِس حالت میں تین سال گزرے۔ چوتھے بَرَس ایک

سوداگر سیر و سفر کرتا ہوا آیا اور ہر ایک مُلک کے تُحفے تحائف عجیب و غریب جہاں پناہ کے حضور میں لایا، مُلازمت حاصل کی۔ بادشاہ نے بہت توجّہ فرمائی اور احوال پُرسی اُس کی کر کے پوچھا کہ تم نے بہت مُلک دیکھے، کہیں کوئی حکیمِ کامل بھی نظر پڑا، یا کسو سے مذکور اُس کا سُنا؟ اُس نے اِلتماس کیا کہ قبلۂ عالم! غُلام نے بہت سیر کی؛ لیکن ہندوستان میں دریا کے بیچ ایک پہاڑی ہے، وہاں ایک گُسائیں جٹا دھارشی نے بڑا مندھپ مہادیو کا اور سنگت اور باغ بڑی بہار کا بنایا ہے، اُس میں رہتا ہے۔ اور اُس کا یہ قاعدہ ہے کہ برسویں دِن، شیو راتّ کے روز اپنے استھان سے نکل کر دریا میں پیرتا ہے اور خوشی کرتا ہے۔ اشنان کے بعد جب اپنے آسن پر جانے لگتا ہے، تب بیمار اور دردمند دیس دیس اور مُلک مُلک کے، جو دور دور سے آتے ہیں، دروازے پر جمع ہوتے ہیں، اُن کی بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ وہ مہنت، جسے اِس زمانے کا افلاطون کہا چاہیے، قارورہ اور نبض دیکھتا ہوا اور ہر ایک کو نسخہ لکھ کر دیتا ہوا چلا جاتا ہے۔ خُدا نے ایسا دستِ شِفا اُس کو دیا ہے کہ دوا پیتے ہی اثر ہوتا ہے اور وہ مرض بالکل جاتا رہتا ہے۔ یہ ماجرا میں نے بہ چشمِ خود دیکھا اور خُدا کی قُدرت کو یاد کیا کہ ایسے ایسے بندے پیدا کیے ہیں۔ اگر حُکم ہو تو شہزادۂ عالمیاں کو اُس پاس لے جاویں، اُس کو ایک نظر دِکھاویں۔ اُمّیدِ قوی ہے کہ جلد شِفائے کامل ہو۔ اور ظاہر میں بھی یہ تدبیر اچھی ہے کہ ہر ایک مُلک کی ہوا کھانے سے اور جا بہ جا کے آب و دانے سے مزاج میں فرحت آتی ہے۔

بادشاہ کو بھی اُس کی صلاح پسند آئی اور خوش ہو کر فرمایا: بہت بہتر، شاید

اُس کا ہاتھ راس آوے اور میرے فرزند کے دل سے وَحشت جاوے۔ ایک امیرِ مُعتبَر، جہاں دیدہ، کار آزمودہ کو اور اُس تاجر کو میری رِکاب میں تعینات کیا اور اَسبابِ ضَروری* ساتھ کر دیا۔ نواڑے، بجرے، مور پنکھی، پلوار[1]، لچکے، کھیلنے، اُلاق، پٹیلیوں[2] پر[3] مَع[4] سَر انجام[5] سوار کر کر رُخصت کیا۔ منزل منزل چلتے چلتے اُس ٹھکانے پر جا پہنچے۔ نئی ہَوا اور نیا دانہ پانی کھانے پینے سے کچھ مزاج ٹھہرا، لیکن خاموشی کا وُہی عالم تھا اور رُونے سے کام دم بہ دم۔ یاد اُس پری کی دل سے بھولتی نہ تھی۔ اگر کبھو بُولتا[6] تو یہ بَیت پڑھتا:

نہ جانوں کس پری رُو کی نظر ہوئی

ابھی تُو تھا بھلا چنگا مرا دل

بارے جب دُو تین مہینے گزرے، اُس پہاڑ پر قریب چار ہزار مریض کے جمع ہوئے؛ لیکن سب یہی کہتے تھے کہ اب خُدا چاہے تو گُسائیں اپنے[7] مَٹھ سے نکلیں گے اور سب کو اُن کے فرمانے سے شِفائے کُلّی ہوگی۔

اَلقِصّہ جس دن وُہ دن آیا، صُبح کو جُوگی مانند آفتاب کے نکل[8] آیا اور دریا میں نہایا اور پیرا۔ پار جا کر پھر آیا اور بھبھوت، بھسم[9] تمام بدن میں لگایا۔ وُہ گُورا بدن مانند انگارے کے[10] راکھ میں چھپایا، اور ماتھے پر مَلاگیر کا ٹیکا دیا۔ لنگوٹ باندھ کر، اَنگھوچھا* کاندھے پر ڈالا؛ بالوں کا جوڑا باندھا۔ مونچھوں پر تاؤ دے کر، چڑھواں[11] جوتا[12] اڑایا۔ اُس کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دُنیا اُس کے نزدیک کچھ قدر نہیں رکھتی۔ ایک قلم دان جڑاؤ بغل میں لے کر، ایک ایک کی طرف دیکھتا اور نُسخہ دیتا ہوا میرے نزدیک آ پہنچا۔

جب میری اور اُس کی چار نظریں ہوئیں، کھڑا رہ کر غور میں گیا اور مجھ سے کہنے لگا[۱]: ہمارے ساتھ آؤ۔ مَیں ہمراہ ہو لیا۔

جب سب کی نَوبت ہو چکی، میرے تئیں باغ کے اندر لے گیا اور ایک[۲] مُقطّع، خوش نقشہ خِلوَت خانے میں مجھے فرمایا کہ یہاں تم رہا کرو، اور آپ اپنے آستھان میں گیا۔ جب ایک چِلّا[۳] گزرا، تو میرے پاس آیا اور آگے کی نسبت مجھے خوش پایا، تبّ[۴] مُسکرا کر فرمایا کہ اِس باغیچے[۵] میں سَیر کیا کرو۔ جس میوے پر جی چلے، کھایا کرو۔ اور ایک قُلفی چینی کی معجون[۶] بھری ہوئی دی کہ اِس میں سے چھ[*] ماشے ہمیشہ بِلاناغہ نَہار نُوشِ جاں[۷] فرمایا کرو۔ یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا اور میں نے اُس کے کہنے پر عَمل کیا۔ ہر رُوز قُوّت بدن میں اور فرحت دل کو معلوم ہونے لگی؛ لیکن حضرتِ عشق کو کچھ اثر نہ کیا، اُس پری کی صورت نظروں کے آگے پھرتی تھی۔

ایک رُوز طاق میں ایک جِلد کتاب کی نَظر آئی۔ اُتار کر دیکھا تو سارے عِلمِ دین و دُنیا کے اُس میں جمع کیے تھے، گُویا دریا کو کوزے میں بھر دیا تھا۔ ہر گھڑی اُس کا مُطالعہ کیا کرتا۔ علمِ حکمت[۸] اور تسخیر میں نہایت قُوّت بہم پہنچائی۔ اِس عرصے میں بَرَس دن گزر گیا، پھر وُہی خوشی کا دن آیا۔ جُوگی اپنے آسَن پر سے اُٹھ کر باہَر نکلا، میں نے سلام کیا۔ اُن نے قلم دان مجھے دے کر کہا: ساتھ چلو۔ مَیں بھی[۹] ساتھ ہو لیا۔ جب دروازے سے باہَر نکلا، ایک عالَم دُعا دینے لگا۔ وُہ امیر اور سَوداگر مجھے ساتھ دیکھ کر، گُسائیں کے قدموں پر گرے اور اَدائے شُکر کرنے لگے کہ آپ کی توجّہ سے بارے اِتنا تُو ہوا۔ وُہ اپنی عادت پر دریا کے گھاٹ تک[۱۰] گیا اور اَشنان، پُوجا جس طرح ہر سال کرتا تھا، کی۔ پھرتی بار بیماروں کو

دیکھتا بھالتا چلا آتا تھا۔

اِتّفاقاً سَو دائیوں کے غُول میں ایک جوانِ[1] خوب صورت، شکیل (کہ ضُعف سے کھڑے ہونے کی طاقت اُس میں نہ تھی) نظر پڑا۔ مجھ کو کہا کہ اِس کو ساتھ لے آؤ۔ سب کی دارُو دَرمَن کرکے، جب خِلوَت خانے میں گیا؛ تھوڑی سی کھوپڑی[2] اُس جوان کی تَراش کر، چاہا کہ کَنکھجُورا[3]، جو مَغز پر بیٹھا تھا، زَنبُور سے اُٹھا لیوے۔ میرے خیال میں گُزرا اور بول اُٹھا کہ اگر دَستِ پناہ آگ میں گَرم کرکر اِس کی پیٹھ پر رکھیے تو خوب ہے، آپ سے آپ نکل آوے گا۔ اور جو یوں کھینچیے گا، تو مَغز کے گُودے کو نہ چھوڑے گا؛ پھر خَوفِ زِندگی کو ہے[4]۔ یہ سُن کر میری طرف دیکھا اور چُپکا اُٹھ، باغ کے کونے میں ایک درخت کولے میں پکڑ[5]، جٹا کی لَٹ کی گلے میں پھانسی لگا کر رہ گیا۔ مَیں[6] پاس جا کر جو دیکھا[7] تو واہ واہ یہ تو[8] مرگیا! یہ اَچنبھا دیکھ کر نہایَت افسوس ہوا۔ لاچار جی میں آیا اُسے گاڑ دوں۔ جُوں درخت[9] سے جُدا کرنے لگا، دو کُنجیاں اُس کی لَٹوں میں سے گر پڑیں۔ میں نے اُن کو اُٹھا لیا، اور اُس گنجِ خوبی کو زمین میں دَفن کیا۔ وِے[10] دونوں کُنجیاں لے کر سب قُفلوں میں لگانے لگا۔ اِتّفاقاً دو حُجرے کے تالے اُن تالیوں سے کُھلے۔ دیکھا تو زمین سے چھت تلک جَواہِر بھرا ہوا ہے، اور ایک پیٹی مخمل سے مَڑھی، سونے کے پَتَر[11] لگی، قُفل دی[12] ہوئی ایک طرف دَھری ہے۔ اُس کو جو کھولا، تو ایک کتاب دیکھی کہ اُس میں اِسمِ اَعظَم اور حاضِراتِ جِن[13] و پَری کی اور روحوں کی مُلاقات اور تَسخیرِ آفتاب کی ترکیب لکھی[14] ہے۔ ایسی دَولت کے ہاتھ لگنے سے نہایَت خوشی حاصل ہوئی اور اُن پر عمل کرنا شُروع کیا۔ دروازہ

باغ کا کھول دیا، اُنْہنے اُس امیر کو اور ساتھ والوں کو کہا کہ کشتیاں منگوا کر، یہ سب جَواہِر و نَقْد و جِنْس اور کتابیں پار کر لو۔ اور ایک رَہْوار ٹَٹّے[۲] پر آپ سوار ہو کر وہاں سے بَحْر کو روانہ کیا۔ آتے آتے جب نزدیک اپنے مُلک کے پہنچا، جہاں پناہ کو خبر ہوئی؛ سوار[۳] ہو کر اِستِقبال کیا اور اِشتِیاق سے بے قرار ہو کر کلیجے سے لگا لیا۔ میں نے قدم بُوسی کر کر کہا کہ اِس خاکسار کو قدیم باغ میں رہنے کا حُکم ہو۔ بولے کہ اَے بَرخوردار! وُہ مکان میرے نزدیک منحوس ٹھہرا، لِہٰذا اُس کی مرمّت اور تیّاری مَوقوف کی، اب وُہ مکان لائق انسان کے رہنے کے نہیں رہا؛ اور جس محل میں جی چاہے اُترو۔ بہتر[۷] یوں ہے کہ قلعے میں کوئی جگہ پسند کر کے، میری آنکھوں کے رُو بہ رُو رہو اور پائیں باغ جیسا چاہو، تیّار کروا کر، سَیر تماشا دیکھا کرو۔ میں نے بہت ضِد[۸] اور ہَٹ کر کر اُس باغ کو نئے[۹] سِر سے تعمیر کروایا اور بہشت کی[۸] مانند آراستہ کر، داخل ہوا۔ پھر فَراغت سے، جِنوں[۹] کی تَسخیر کی خاطِر چِلّے بیٹھا اور تَرکِ حَیوانات کر کر، حاضِرات کرنے لگا۔

جب چالیس دن پورے ہوئے، تب آدھی رات کو ایک[۱۰] ایسی آندھی آئی کہ بڑی بڑی عمارتیں گر پڑیں اور درخت جڑ پیڑ سے اُکھڑ کر کہیں سے کہیں جا پڑے اور پری زادوں کا لشکر نَمُود ہوا۔ ایک تخت ہَوا سے اُترا، اُس پر ایک شخص[۱۱] شان دار، مُوتیوں کا تاج اور خِلعَت پہنے ہوئے بیٹھا تھا۔ میں نے دیکھتے ہی بہت مُؤدّب[۱۲] ہو کر سلام کیا۔ اُس نے میرا سلام لیا اور کہا[۱۳]: اَے عزیز! یہ کیا تو نے ناحق[۱۴] ڈُنڈ مچایا، ہم سے تجھے کیا مُدّعا ہے؟ میں نے اِلتماس کیا کہ یہ عاجِز بہت مُدّت سے تمھاری بیٹی پر عاشق ہے اور اُسی[۱۵] لیے کہاں سے

کہاں خراب وخستہ ہوا اور جیتے جی مُوا۔ اب زِندگی سے بہ تنگ آیا ہوں اور اپنی جان پر کھیلا ہوں جو یہ کام کیا ہے۔ اب آپ کی ذات سے اُمّید وار ہوں کہ مجھ حیران سَرگَردان کو اپنی تَوَجُّہ سے سَرفَراز کرو اور اُس کے دیدار سے زِندگی اور آرام بخشو، تو بڑا ثواب ہو گا۔

یہ میری آرزو سُن کر بولا کہ آدمی خاکی اور ہم آتشی[1]، اِن دونوں میں موافقت آنی مشکل ہے۔ میں نے قَسَم کھائی کہ مَیں اُن کے دیکھنے کا مُشتاق ہوں، اور کچھ مطلب نہیں۔ پھر اُس تخت نشیں نے جواب دیا کہ انسان اپنے قَول[2] قرار پر نہیں رہتا۔ غَرَض کے وقت[3] سب کچھ کہتا ہے، لیکن یاد نہیں رکھتا۔ یہ بات مَیں تیرے بھلے کے لیے کہہ سُنا تا ہوں کہ اگر تو نے کبھو قَصد کچھ اَور کیا، تو وُہ بھی اور تو بھی دونوں خراب خَستہ ہو گے، بلکہ خَوف جان کا ہے۔ میں نے پھر دوبارہ سَوگَند یاد کی کہ جس میں طَرَفَین* کی بُرائی ہووے، وَیسا کام ہرگز نہ کروں گا، مگر ایک نظر دیکھتا رہوں گا۔ یِہ باتیں ہُوتیاں تھیں کہ اَن چِت وُہ پری کہ جس کا مذکور تھا، نہایَت ٹھسّے سے، بَناؤ* کیے ہوئے آ پہنچی اور بادشاہ کا تخت وہاں سے چلا گیا۔ تب[4] میں نے بے اِختیار اُس پری کو جان کی طَرَح بَغَل میں لے آیا[5] اور یہ شعر پڑھا:

> کماں اَبرُو مرے گھر کیُوں نہ آوے[6]
> کہ جس کے واسطے کھِنچے ہیں چِلّے

اُسی خوشی کے عالَم میں باہم اُس باغ میں رہنے لگے۔ مارِے ڈر کے کچھ اَور خیال نہ کرتا، بالائی مزے لیتا اور فَقَط دیکھا کرتا۔ وُہ پری میرے قَول[7] قَرار کے نباہنے

پَر دل میں حَیران رہتی اور بعضے وقت کہتی کہ پیارے! تم بھی اپنی بات کے بڑے سچّے ہو؛ لیکن ایک نصیحت مَیں دوستی کی راہ سے کرتی ہوں: اپنی کتاب سے خبردار رہیو، کہ جِنّؔ، کسی نہ کسی دِن تمھیں غافل پاکر چُرا لے جائیں گے۔ میں نے کہا: اُسے مَیں اپنی جان کے برابر رکھتا ہوں۔

اِتّفاقاً ایک رُوز رات کو شیطان نے وَرغلانا (۲)۔ شَہوَت کی حالت میں یہ دل میں آیا کہ جو کچھ ہو سو ہو، کہاں تلک اپنے تئیں تھانبوں؛ اُسے چھاتی سے لگالیا اور قَصدِ جماع کا کیا۔ وُونہیں ایک آواز آئی: یہ کتاب مجھ کو دے، کہ اِس میں اِسمِ اَعظَم ہے، بے اَدَبی نہ کر۔ اُس مستی کے عالَم میں کچھ ہُوش نہ رہا، کتاب بَغَل سے نکال کر، بَغَیر جانے پہچانے حوالے کردی اور اپنے کام میں لگا۔ وُہ نازنیں یہ میری نادانی کی حرکت دیکھ کر بُولی کہ ہَے ظالم! آخر چُوکا اور نصیحت بھُولا۔ یہ کہ کر بے ہوش ہوگئی اور میں نے اُس کے سِرہانے* ایک دِیو دیکھا کہ کتاب لیے کھڑا ہے۔ چاہا کہ پکڑ کر خوب ماروں اور کتاب چھین لوں، اِتنے میں اُس کے ہاتھ سے کتاب دوسرا لے بھاگا۔ میں نے جو اَفسُوں یاد کیے تھے، پڑھنے شُروع کیے۔ وُہ جِنّؔ، جو کھڑا تھا، بَیل بن گیا؛ لیکن افسوس! کہ پری ذرا بھی ہُوش میں نہ آئی اور وُہی حالت بے خودی کی رہی۔ تب میرا دل گھبرایا، سارا عَیش تَلخ ہوگیا۔

اُس رُوز سے آدمیوں سے نفرت ہوئی۔ اِس باغ کے گُوشے میں پڑا رہتا ہوں اور دل کے بہلانے کی خاطِر یہ مَرتَبان زُمُرُّد کا جھاڑ دار بنایا کرتا ہوں اور ہر مہینے اُس میدان میں لُنگی بَیل پر سوار ہو کر جایا کرتا ہوں۔ مَرتَبان کو

توڑ کر غلام کو مار ڈالتا ہوں، اِس اُمّید پر کہ سب میری یہ حالت دیکھیں اور افسوس کھاویں؛ شاید کوئی ایسا خدا کا بندہ مہربان ہو کہ میرے حق[1] میں دُعا کرے تو مَیں بھی اپنے مطلب کو پہنچوں۔ اَے رفیق! میرے جُنون اور سَودا[2] کی یہ حقیقت ہے جو میں نے تجھے کہہ سُنائی۔

مَیں سُن کر آب دیدہ ہوا اور بولا کہ اَے شہ زادے! تو نے واقعی عشق کی بڑی محنت اُٹھائی؛ لیکن قسم خدا کی کھاتا ہوں کہ مَیں اپنے مطلب سے در گزرا، اب تیری خاطر جنگل، پہاڑ میں پھروں گا اور جو مجھ سے ہو سکے گا، سو کروں گا۔ یہ وعدہ کر کر مَیں اُس جوان سے رُخصت ہوا اور پانچ برس تک سَودائی سا ویرانے میں خاک چھانتا پھرا؛ سُراغ[3] نہ ملا۔

آخر اُکتا کر ایک پہاڑ پر چڑھ گیا اور چاہا کہ اپنے تئیں گرا دوں کہ ہڈّی پسلی کچھ ثابت نہ رہے؛ وُہی[4] سوارِ بُرقع پوش آ پہنچا اور بولا کہ اپنی جان مت کھو، تھوڑے دنوں کے بعد تو اپنے مقصد سے کام یاب ہوگا۔ یا سائیں اَللہ! تمھارے دیدار تو مُیَسّر ہوئے، اب خدا کے فضل سے اُمّیدوار ہوں کہ خوشی اور خُرّمی حاصل ہو اور سب نامُراد اپنی مُراد کو پہنچیں[5]۔

سَرگُذشت آزاد بخت بادشاہ کی[1]

جب دوسرا دَرویش بھی اپنی سَیر کا قصّہ کہ چکا، رات آخر ہو گئی اور وقت صُبح کا شُروع ہونے پر آیا۔ بادشاہ آزاد بخت چُپکا اپنے دَولت خانے کی طرف روانہ ہوا۔ محلّ[2] میں پہنچ کر نماز ادا کی۔ پھر غُسل خانے میں جا، خِلعَتِ فاخرہ پہن کر، دیوانِ عامّ[3] میں تخت پر نکل بیٹھا اور حُکم کیا کہ یَساوَل جاوِے؛ چار فقیر فُلانے مکان پر وارِد ہیں، اُن کو بہ عزّت اپنے ساتھ حُضور میں لے آوے۔

بہ مُوجِب حُکم کے چُوب دار وہاں گیا۔ دیکھا تو چاروں بے نَوا جھاڑا جھٹکا پھر، ہاتھ مُنہ دُھو کر، چاہتے ہیں کہ دِسا کریں اور اپنی اپنی راہ لیں؛ چیلے نے کہا: شاہ جی! بادشاہ نے چاروں صورَتوں کو طَلَب فرمایا ہے، میرے ساتھ چلیے۔ چاروں دَرویش آپس میں ایک ایک کو تکنے لگا اور چُوب دار سے کہا: بابا! ہم اپنے دل کے بادشاہ ہیں، ہمیں دُنیا[4] کے بادشاہ سے کیا کام ہے! اُس نے کہا: مِیاںؔ اَللہ! مُضائقہ نہیں، اگر چلو تو اچھا ہے۔ اِتنے میں چاروں کو یاد آیا کہ مَولا[*] مُرتَضیٰ نے جو فرمایا تھا، سُو اَب پیش آیا۔ خوشی[5] ہوئے اور یَساوَل کے ہم راہ چلے۔ جب قلعے میں پہنچے اور رُو بہ رُو بادشاہ کے گئے، چاروں قلندروں نے دُعا دی کہ بابا! تیرا بھلا ہو۔ بادشاہ دیوانِ خاصّ[6] میں جا بیٹھے اور دُو چار خاصّ امیروں کو بُلایا اور فرمایا کہ چاروں گُدڑی پُوشوں کو بُلاؤ[9]۔ جب وہاں گئے، حُکم بیٹھنے کا کیا۔ اَحوال پُرسی فرمائی کہ تمہارا کہاں سے آنا ہوا اور کہاں کا اِرادہ ہے؟

مکان مُرشِدوں کے کہاں ہیں ؟

اُنھوں نے کہا کہ بادشاہ کی عُمر و دَولت زیادہ رہے ؛ ہم فقیر ہیں ، ایک مُدّت سے اِسی طَرَح سَیر و سفر کرتے پھرتے ہیں ، خانہ بَدُوش ہیں ؛ وُہ مَثَل ہے : فقیر کو جہاں شام ہوئی ، وَہیں[1] گھر ہے ۔ اور جو کچھ اِس دُنیاے ناپایدار میں دیکھا ہے ، کہاں تک بیان کریں ۔ آزاد بخت نے بہت تَسلّی اور تَشَفّی کی اور کھانے کو منگوا کر اپنے رُوبہ رُو ناشتا کروایا ۔ جب فارِغ ہوئے ، پھر فرمایا کہ اپنا ماجرا تمام بے کم و کاست مجھ سے کہو ۔ جو مجھ سے تمھاری خدمت ہو سکے گی ، قُصور نہ کروں گا ۔

فقیروں نے جواب دیا کہ ہم پر جو کچھ بیتا ہے ، نہ ہمیں بیان کرنے کی طاقت ہے اور نہ بادشاہ کو سُننے سے فرحَت ہوگی ؛ اِس کو مُعاف کیجیے ۔ تب بادشاہ نے تَبَسُّم کیا اور کہا : شب کو جہاں تم بِستروں پر بیٹھے اپنا اپنا اَحوال کہ رہے تھے ، وہاں مَیں بھی موجود تھا ، چُناں چِہ دُو دَرویش کا اَحوال سُن چکا ہوں ؛ اب چاہتا ہوں کہ دونوں جو باقی ہیں ، وُے بھی کہیں ، اور چند رُوز بہ خاطِر جَمع میرے پاس رہیں کہ قَدَمِ دَرویشاں رَدِّ بَلا ہے ۔ بادشاہ سے یہ بات سُنتے ہی ، مارے خَوف کے کانپنے لگے اور سِر نیچے کر کے چُپ ہو رہے ، طاقت گُویائی کی نہ رہی ۔

آزاد بخت نے جب دیکھا کہ اب اِن میں مارے رُعب کے حواس نہیں رہے جو کچھ بُولیں ، فرمایا کہ اِس جہان میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس پر ایک نہ ایک وارِداتِ عجیب و غریب نہ ہوئی ہوگی ۔ باوُجودے کہ مَیں بادشاہ ہوں ، لیکن میں نے بھی ایسا تماشا دیکھا ہے کہ پہلے مَیں ہی اُس کا بیان کرتا ہوں ، تم بہ خاطِر جمع سُنو ۔ دَرویشوں نے کہا : بادشاہ سلامت !

آپ کا اَلطاف فقیروں کے حال پر ایسا[1] ہے، اِرشاد فرمائیے[2]۔ آزاد بخت نے اپنا اَحوال شُروع کیا اور کہا[3]:

اَے شاہو! بادشاہ کا اب ماجرا سُنو
جو کچھ کہ میں نے دیکھا ہے اور ہے سُنا[4]، سُنو
کہتا ہوں مَیں فقیروں کی خدمت میں سَر بہ سَر
اَحوال[5] میرا خوب طَرح دل لگا سُنو

میرے قبلہ گاہ نے جب وَفات پائی اور مَیں اِس تخت پر بیٹھا، عَین عالم شباب کا تھا اور سارا یہ مُلک رُوم کا میرے حُکم میں تھا۔ اِتّفاقاً ایک سال کوئی سوداگر بَدَخشاں کے مُلک سے آیا اور اَسباب تجارت کا بہت سالایا۔ خبرداروں نے میرے حُضور میں خبر کی کہ ایسا بڑا تاجِر آج تک شہر میں نہیں[6] آیا۔ میں نے اُس کو طَلَب فرمایا۔

وُہ تُحفے ہر ایک مُلک کے لائق میری نَذر کے، لے کر آیا۔ فی الواقع ہر ایک جِنس بے بَہا نظر آئی۔ چُناں چہ ایک ڈِبیا میں ایک لعل تھا نہایت خوش رنگ اور آب دار، قد و قامَت دُرُست اور وَزن میں پانچ مِثقال کا۔ میں نے[7] باوُجود سلطنت کے ایسا جَواہِر کبھوُ نہ دیکھا تھا اور نہ کِسوُ سے سُنا تھا، پسند کیا۔ سَوداگر کو بہت سا اِنعام و اِکرام دیا اور سَنَد راہ داری کی لکھ دی کہ اُس سے ہماری تمام قَلَمرَو میں کوئی مُزاحم محصول کا نہ ہو اور جہاں جاوِے، اُس کو آرام سے رکھیں، چَوکی پہرے میں حاضِر رہیں، اُس کا نقصان اپنا نقصان سمجھیں۔ وُہ تاجِر حُضور میں دربار کے وقت حاضِر رہتا۔ اور آدابِ سلطنت

سے خوب واقف تھا اور تقریر و خوش گوئی اُس کی لائق سُننے کے تھی۔ اور مَیں اُس لعل کو ہر رُوز جواہر خانے سے منگوا کر سَرِ دربار دیکھا کرتا۔

ایک رُوز دیوانِ عام[1] کیے بیٹھا تھا اور اُمَرا، اَرْکانِ دَولت اپنے اپنے پایے پر کھڑے تھے اور ہر مُلک کے بادشاہوں کے[2] اِیلچی، مُبارک باد کی خاطِر جو آئے تھے، وُہ بھی سب حاضِر تھے؛ اُس وقت میں نے مُوافِق مَعمُول کے اُس لعل کو منگوایا۔ جَواہِر خانے کا دارُوغہ لے کر آیا۔ مَیں ہاتھ میں لے کر تعریف کرنے لگا اور فرِنگ کے اِیلچی کو دیا۔ اُن نے دیکھ کر تبسّم کیا اور زمانہ سازی سے صِفَت کی۔ اِسی طَرح ہاتھوں ہاتھ ہر ایک نے لیا اور دیکھا اور ایک زُبان ہو کر بُولے کہ قِبلۂ عالَم کے اِقبال کے باعِث یہ مُیَسّر ہوا ہے، وَاِلّا نہ کِسو بادشاہ کے ہاتھ آج تک ایسا رَقَم بے بَہا نہیں لگا۔ اُس وقت میرے قِبلہ گاہ کا وزیر، کہ مردِ دانا تھا اور اُسی خدمت پر سَرفَراز تھا، وِزارت کی چَوکی[3] پر کھڑا تھا، آداب بجا لایا اور اِلتِماس کیا کہ کچھ عَرض کیا چاہتا ہوں اگر جان بخشی[4] ہو۔

میں نے حُکم کیا کہ کہہ۔ وُہ بُولا: قِبلۂ عالَم! آپ بادشاہ ہیں اور بادشاہوں سے بہت بَعید ہے کہ ایک پتّھر کی اِتنی تعریف کریں۔ اگرچہ رَنگ، ڈَھنگ، سَنگ میں لاثانی ہے، لیکن سَنگ ہے۔ اور اِس دَم سب مُلکوں کے اِیلچی دربار میں حاضِر ہیں؛ جب اپنے اپنے شہر میں جاویں گے، البتّہ یہ نَقل کریں گے کہ عَجَب بادشاہ ہے کہ ایک لعل کہیں سے پایا ہے، اُسے ایسا تُحفہ بنایا ہے کہ ہر رُوز رُو بہ رُو منگاتا ہے اور آپ اُس کی تعریف کر کر سب کو دِکھاتا ہے۔ پس جو بادشاہ

یارا جا یہ اَحوال سُنے گا، اپنی مجلس میں ہنسے گا۔ خُداوَند! ایک اَدنیٰ سوداگر نیشاپور[۲] میں رہے؛ اُس نے بارہ دانے لعل کے، کہ ہر ایک سات سات مِثقال کا ہے، پٹّے میں نَصب کرکر کُتّے کے گلے میں ڈال دیے ہیں۔ مجھے سُنتے ہی غُصّہ چڑھ آیا اور کھسیانے ہوکر فرمایا کہ اِس وزیر کی گردن مارو۔

جَلّادوں نے وُونہیں اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چاہا کہ باہر لے جاویں، فرنگ کے بادشاہ کا اِیلچی دَست بَستہ رُو بہ رُو آکھڑا ہوا۔ میں نے پوچھا کہ تیرا کیا مطلب ہے؟ اُس نے عرض کی: اُمّیدوار ہوں کہ تقصیر سے وزیر کی واقف ہوں۔ میں نے فرمایا کہ جھوٹھ بولنے سے اَور بڑا گُناہ کون سا ہے، خُصوصًا بادشاہوں کے رُو بہ رُو؟ اُن نے کہا: اِس کا دَرُوغ ثابت نہیں ہوا؛ شاید جو کچھ کہ عرض کی ہے، سچ ہو۔ ابھی بے گُناہ کا قَتل کرنا دُرُست نہیں۔ اُس کا میں نے یہ جواب دیا کہ ہرگز عقل میں نہیں آتا، ایک تاجِر کہ نفع کے واسطے شہر بہ شہر اور مُلک بہ مُلک خراب ہوتا پھرتا ہے اور کَوڑی کَوڑی جمع کرتا ہے؛ بارہ دانے لعل کے، جو وَزن میں سات سات مِثقال کے ہوں، کُتّے کے پٹّے میں لگاوے۔ اُس نے کہا: خُدا کی قُدرت سے تعجّب نہیں، شاید کہ باشَد۔ ایسے تُحفے اکثر سَوداگروں اور فقیروں کے ہاتھ آتے ہیں، اِس واسطے کہ یہ دونوں ہر ایک مُلک میں جاتے ہیں اور جہاں سے جو کچھ پاتے ہیں، لے آتے ہیں۔ صَلاحِ دَولت یہ ہے کہ اگر وزیر ایسا ہی تقصیروار ہے، تو حُکم قَید کا ہو؛ اِس لیے کہ وزیر، بادشاہوں کی عقل ہوتے ہیں اور یہ حرکت سَلاطینوں سے بدنُما ہے کہ ایسی بات پر، کہ جھوٹھ سچ اُس کا ابھی ثابت نہیں ہوا، حُکم قَتل کا فرمائیں اور اُس کی تمام عُمر کی خدمت

اور نمک حلالی بھول جائیں[۱]۔ بادشاہ سلامت! اگلے شہر یاروں نے بندی خانہ اِسی سبب[۲] ایجاد کیا ہے کہ بادشاہ یا سردار اگر کسوٗ پر غضب ہوں، تو اُسے قید کریں۔ کئی دن میں غصّہ جاتا رہے گا اور بے تقصیری اُس کی ظاہر ہوگی؛ بادشاہ خونِ ناحق[۳] سے محفوظ رہیں گے، کل کو رُوزِ قیامت میں ماخوذ نہ ہوئیں گے۔

مَیں نے جتنا اُس[۵] کے قائل کرنے کو چاہا، اُس نے ایسی معقول گفتگو کی کہ مجھے لاجواب کیا۔ تب میں نے کہا کہ خَیر، تیرا کہنا پذیرا[۶] ہوا، مَیں خون سے اِس کے دَرگُزرا؛ لیکن زِندان[۷] میں مُقیّد رہے گا۔ اگر ایک سال کے عرصے میں اِس کا سُخن[۸] راست ہوا، کہ ایسے لعل کُتّے کے گلے میں ہیں، تو اِس کی نَجات ہوگی! اور نہیں تو بڑے عذاب سے مارا جاوے گا۔ فرمایا کہ وزیر کو بَندِت* خانے میں لے جاؤ۔ یہ حُکم سُن کر ایلچی نے زمین خدمت کی چومی اور تسلیمات کی۔

جب یہ خبر وزیر کے گھر میں گئی؛ آہ، واوَیلا[۹] مچا اور ماتم سَرا ہوگیا۔ اُس وزیر کی ایک بیٹی تھی بَرَس چَودہ پندرہ کی، نہایت خوب صورت اور قابل، نوِشت[۱۰] خواند میں دُرُست۔ وزیر اُس کو نہایت پیار کرتا تھا اور عزیز رکھتا تھا، چُناں چہ اپنے دیوان خانے کے پِچھواڑے ایک رنگ محلّ[۱۱] اُس کی خاطر بنوا دیا تھا اور لڑکیاں عُمدوں کی اُس کی مُصاحبت میں، اور خواصیں[۱۲] شکیل خدمت میں رہتیں، اُن سے ہنسی خوشی کِھیلا کوٗدا کرتی۔ اِتّفاقاً جس دن وزیر کو مَحبوس خانے میں بھیجا، وُہ لڑکی اپنی ہمجولیوں میں بیٹھی تھی اور خوشی سے گُڑیا کا بیاہ رَچایا تھا اور ڈھولک، پَکھاوَج لیے ہوئے رَت جگے کی تیاری کر رہی تھی، اور کڑاہی چڑھا کر گُلگُلے اور رَحم* تلتی اور بنا رہی تھی، کہ ایک

بازگی اُس کی ماںؑ رُوتی پیٹتی، سر کھلے پانوننگے، بیٹی کے گھر میں گئی اور دوہتّڑ اُس لڑکی کے سر پر ماری اور کہنے لگی: کاشکے تیرے بدلے خُدا اندھا بیٹا دیتا تو میرا کلیجا ٹھنڈا ہوتا اور باپ کا رفیق ہوتا۔ وزیر زادی نے پوچھا: اندھا بیٹا تمھارے کس کام آتا؟ جو کچھ بیٹا کرتا، مَیں بھی کرسکتی ہوں۔ اَمّاںؑ نے جواب دیا: خاک تیرے سر پر! باپؑ پر یہ بپتا بپتی ہے کہ بادشاہ کے رُوبہ رُو کچھ ایسی بات کہی کہ بَندی خانے میں قَید ہوا۔ اُس نے پوچھا: وُہ کیا بات تھی؟ ذراؑ مَیں بھی سُنوں۔ تب وزیر کے قَبیلے نے کہا کہ تیرے باپ نے شایدیہ کہا کہ نَیشاپور میں کوئی سَوداگر ہے، اُس نے بارہ عدد لعلِ بے بَہا کُتّے کے پٹّے میں ٹانکے⑤ ہیں۔ بادشاہ کو باوَر نہ ہوا، اُسے جھوٹھا سمجھا اور اَسیر کیا۔ اگر آج کے دِن بیٹا ہوتا، تو ہر طَرح سے کوشش کرکر اِس بات کو تحقیق کرتا اور اپنے باپ کا اُپرالا کرتا اور بادشاہ سے عَرض مَعرُوض کرکے میرے خاوِند کو بَندِش خانے سے مَخلصی دِلواتا۔ وزیر زادی بُولی: اَمّاجان! تقدیر سے لڑا نہیں جاتا۔ چاہیے انسان بَلائے ناگہانی⑥ میں صَبر کرے اور اُمّیدوار فَضلِ الٰہی کا رہے۔ وُہ کریم ہے، مشکل کِسو کی اَٹکی نہیں رکھتا۔ اور رُونا دُھونا خوب نہیں، مَبادا دُشمن اَور طَرح سے بادشاہ کے پاس لگاوِیں اور لُتڑے چُغلی کھاوِیں، کہ باعث زیادہ خَفگی کا ہو! بلکہ جہاں پناہ کے حقؑ میں دُعا کرو۔ ہم اُس کے خانہ زاد ہیں، وُہ ہمارا خُداوَند ہے۔ وُہی غَضَب ہوا ہے، وُہی مِہربان ہوگا۔

اُس لڑکی نے عقَل مندی سے ایسی ایسی طَرح ماںؑ کو سمجھایا کہ کچھ اُس کو صبر و قرار آیا، تب اپنے محلؑ میں گئی اور چُپکی ہو رہی۔ جب رات ہوئی، وزیر زادی

نے دادا کو بُلایا۔ اُس کے ہاتھ پانو پڑی، بہت سی مِنّت کی اور رُونے لگی اور کہا:
مَیں یہ اِرادہ رکھتی ہوں کہ اَمّا جان کا طعنہ مجھ پر نہ رہے اور میرا باپ مُخلصی پاوے۔
جو تو میرا رفیق ہو، تو مَیں نیشاپور کو چلوں اور اُس تاجِر کو، جس کے کُتّے کے
گلے میں ایسے لعل ہیں، دیکھ کر؛ جو بَن آوے، کر آؤں اور اپنے باپ کو چھڑاؤں۔
پہلے تو اُس مرد نے انکار کیا، آخر بہت کہنے سُننے سے راضی ہوا۔ تب
وزیر زادی نے فرمایا: چُپکے چُپکے اَسباب سفر کا دُرست کر اور جِنس تجارت کی
لائق نذر بادشاہوں کے خرید کر، اور غُلام و نوکر چاکر جتنے ضرور ہوں، ساتھ لے؛
لیکن یہ بات کِسو پر نہ کُھلے۔ دادا نے قبول کیا اور اُس کی تیّاری میں لگا۔ جب
سب اَسباب مُہیّا کیا؛ اونٹوں اور خچّروں پر بار کر کر روانہ ہوا اور وزیر زادی
بھی لباسِ مردانہ پہن کر ساتھ جا ملی، ہرگز کِسو کو گھر میں خبر نہ ہوئی۔ جب صُبح
ہوئی، وزیر کے محل میں چرچا ہوا کہ وزیر زادی غائب ہے، معلوم نہیں
کیا ہوئی۔

آخر بدنامی کے ڈر سے ماں نے بیٹی کا گُم ہونا چھپایا۔ اور وزیر زادی نے
اپنا نام سوداگر بچّہ رکھا۔ منزل بہ منزل چلتے چلتے نیشاپور میں پہنچی۔ خوشی بہ خوشی
کاروان سرا میں جا اُتری اور سب اپنا اَسباب اُتارا۔ رات کو رہی، فجر کو حمّام
میں گئی اور پوشاکِ پاکیزہ (۹)، جیسے رُوم کے باشندے پہنتے ہیں، پہنی اور شہر کی
سیر کے واسطے نکلی۔ آتے آتے جب چوک میں پہنچی، چوراہے پر کھڑی ہوئی۔ ایک
طرف دُکان جوہری کی نظر پڑی کہ بہت سے جَواہِر کا ڈھیر لگ رہا ہے اور غُلام
لباسِ فاخرہ پہنے ہوئے دست بستہ کھڑے ہیں اور ایک شخص جو سردار ہے،

بَرس پچاس ایک کی اُس کی عُمر ہے، طالع مَندوں کی سی خِلعَت اور نیمہ آستین پہنے ہوئے، اور کئی مُصاحِب (۲) باوَضع نزدیک اُس کے کُرسیوں پر بیٹھے ہیں اور آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔

وُہ وزیر زادی جس نے اپنے تئیں سوداگر بچّہ کر مشہور کیا تھا، اُسے دیکھ کر مُتعجّب ہوئی اور دل میں سمجھ کر خوش ہوئی کہ خُدا جھوٹھ نہ کرے، جس سَوداگر کا میرے باپ نے بادشاہ سے مَذکُور کیا ہے، اَغلَب ہے کہ یہی ہو۔ بارِ خُدایا! اِس کا اَحوال مجھ پر ظاہر کر۔

اِتِّفاقاً ایک طرف جو دیکھا تو ایک دُکان ہے، اُس میں دُو پنجرے آہنی لٹکتے ہیں اور اُن دونوں میں دُو آدمی قید ہیں۔ اُن کی مجنُوں کی سی صورت ہو رہی ہے کہ چرم و اُستخوان باقی ہے اور سر کے بال اور ناخُن بڑھ گئے ہیں، سر اَوندھائے بیٹھے ہیں اور دُو حَبشی بد ہیئت، مُسلّح دونوں طرف کھڑے ہیں۔ سَوداگر بچّے کو اَچنبھا آیا، لاحَول پڑھ کر دوسری طرف جو دیکھا تو ایک دُکان میں قالیچے بچھے ہیں، اُن پر ایک چَوکی ہاتھی دانت کی، اُس پر گدیلا مخمل کا پڑا ہوا؛ ایک کُتّا جَواہِر کا پٹّا گلے میں اور سُونے کی زنجیر سے بندھا ہوا بیٹھا ہے اور دُو غلام اَمرد (۱۰)، خوب صورت اُس کی خدمت کر رہے ہیں: ایک تُو مُورچھل جَڑاؤ دستے کا لیے جھلتا ہے اور دوسرا رُومال تارکشی کا ہاتھ میں لے کر مُنہ اور پانو اُس کا پُونچھ رہا ہے۔

سَوداگر بچّے نے خوب غَور کر کر جو دیکھا تو پٹّے میں کُتّے کے بارہوں (۱۱) دانے لعل کے، جیسے سُنتے تھے، مَوجود ہیں۔ شُکر خُدا کا کیا اور فکر میں گیا کہ کس

صورت سے اُن لعلوں کو بادشاہ پاس لے جاؤں اور دِکھا کر، اپنے باپ کو چھڑاؤں!
یہ تو اِس حیرانی میں تھا، اور تمام خلقت چوک اور رستے کی اُس کا حُسن جمال دیکھ کر حیران تھی اور ہکا بکا ہو رہی تھی۔ سب آدمی آپس میں یہ چرچا کرتے تھے کہ آج تلک اِس صورت و شبیہ کا انسان نظر نہیں آیا۔ اُس خواجہ نے بھی دیکھا۔ ایک غُلام کو بھیجا کہ تو جا کر بہ منت اُس سوداگر بچے کو میرے پاس بُلا لا۔
وُہ غُلام آیا اور خواجہ کا پیام لایا کہ اگر مہربانی فرمائیے تو ہمارا خُداوند صاحب کا مُشتاق ہے، چل کر مُلاقات کیجیے۔ سوداگر بچہ تو یہ چاہتا ہی تھا، بُولا: کیا مضائقہ۔ جُونہیں خواجہ کے نزدیک آیا اور اُس پر خواجہ کی نظر پڑی، ایک برچھی عشق کی سینے میں گڑی۔ تعظیم کی خاطر سَرو قد اُٹھا، لیکن حواس باختہ۔ سوداگر بچے نے دریافت کیا کہ اب یہ دام میں آیا۔ آپس میں بغل گیری ہوئی۔ خواجہ نے سوداگر بچے کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اپنے برابر بٹھایا۔ بہت سا تملُّق کر کے پوچھا کہ اپنے نام و نسب سے مجھے آگاہ کرو، کہاں سے آنا ہوا اور کہاں کا اِرادہ ہے؟
سوداگر بچہ بُولا کہ اِس کم ترین کا وطن رُوم ہے اور قدیم سے اِستنبول زاد بوم ہے۔ میرے قبلہ گاہ (۹) سوداگر ہیں۔ اب بہ سببِ پیری کے طاقت سیر و سفر کی نہیں رہی، اِس واسطے مجھے رُخصت کیا ہے کہ کاروبارِ تجارت کا سیکھوں۔ آج تلک میں نے قدم گھر سے باہر نہ نکالا تھا، یہ پہلا ہی سفر درپیش ہوا۔ دریا کی راہ ہوا (۱۲) نہ پڑا، خُشکی کی طرف سے قصد کیا؛ لیکن اِس عجم کے مُلک میں آپ کے اخلاق اور خوبیوں کا جو شور ہے، محض صاحب کی مُلاقات کی آرزو

میں یہاں تک آیا ہوں۔ بارے فضلِ الٰہی سے خدمتِ شریف میں مشرّف ہوا اور اُس سے زیادہ پایا، تمنّا دل کی بر آئی، خدا سلامت رکھے؛ اب یہاں سے کوچ کروں گا۔

یہ سنتے ہی خواجہ کے عقل و ہوش جاتے رہے، بولا کہ اے فرزند! ایسی بات مجھے نہ سناؤ، کوئی دن غریب خانے میں کرم فرماؤ۔ بھلا یہ تو بتاؤ کہ تمھارا اَسباب اور نوکر چاکر کہاں ہیں؟ سوداگر بچّے نے کہا کہ مُسافر کا گھر سرا ہے؛ انھیں وہاں چھوڑ کر، مَیں آپ کے پاس آیا ہوں۔ خواجہ نے کہا کہ بھٹھیار خانے میں رہنا مُناسب نہیں؛ میرا اِس شہر میں اِعتبار ہے اور بڑا نام ہے، جلد انھیں بُلوا لو۔ مَیں ایک مکان تمھارے اَسباب کے لیے خالی کر دیتا ہوں۔ جو کچھ جنس لائے ہو، مَیں دیکھوں؛ ایسی تدبیر کروں گا کہ یہیں تمھیں بہت سا نفع ملے۔ تم بھی خوش ہو گے اور سفر کے ہرج مرج سے بچو گے اور مجھے بھی، چند روز رہنے سے، اپنا اِحسان مند کرو گے۔ سوداگر بچّے نے اُوپری دل سے عُذر کیا، لیکن خواجہ نے پذیرا نہ کیا اور اپنے گُماشتے کو فرمایا کہ بار بردار جلد بھیجو اور کارواں سرا سے اِن کا اَسباب منگوا کر فلانے مکان میں رکھواؤ۔

سوداگر بچّے نے ایک زنگی غُلام کو اُن کے ساتھ کر دیا کہ سب مال متاع لدوا کر لے آ، اور آپ شام تلک خواجہ کے ساتھ بیٹھا رہا۔ جب گُذری کا وقت ہو چکا اور دُکان بڑھائی، خواجہ گھر کو چلا؛ تب دونوں غُلاموں میں سے ایک نے کُتّے کو بغل میں لیا، دوسرے نے کُرسی اور قالیچہ اُٹھا لیا، اور اُن دونوں حبشی غُلاموں نے اُس پنجرے کو مزدوروں کے سر پر دھر دیا اور آپ پانچوں ہتھیار

باندھے ساتھ ہوئے۔ خواجہ، سَوداگر بچّے کا ہاتھ ہاتھ میں لیے، باتیں کرتا ہوا حَوِیلی میں آیا۔

سَوداگر بچّے نے دیکھا کہ مکانِ عالی شان (۲) لائق بادشاہوں یا امیروں کے ہے۔ لَبِ نَہر فرش چاندنی کا بچھا ہے اور مسند کے رُو بہ رُو اَسبابِ عیش کا چُنا ہے۔ کُتّے کی صَندَلی بھی اُسی جگہ بچھائی اور خواجہ، سَوداگر بچّے کو لے کر بیٹھا۔ بے تکلّف تَواضُع شراب کی کی، دونوں پینے لگے۔ جب سَرخوش ہوئے، تب خواجہ نے کھانا مانگا۔ دسترخوان بچھا اور دُنیا کی نعمت چُنی گئی۔ پہلے ایک لَنگَری میں کھانا لے کر، سَرپُوشِ طِلائی ڈھانپ کر کُتّے کے واسطے لے گئے اور ایک دسترخوان زَربَفت کا بچھا کر، اُس کے آگے دَھر دی۔ کُتّے نے صَندَلی سے نیچے اُتر جتنا چاہا، اُتنا کھایا اور سونے کی لگن میں پانی پیا، پھر چَوکی پر جا بیٹھا۔ غُلاموں نے رُومال سے ہاتھ مُنہ اُس کا پاک کیا۔ پھر اُس طَباق اور لگن کو غُلام پنجرے کے نزدیک لے گئے اور خواجہ سے کُنجی مانگ کر قُفلِ قَفَس کا کھولا؛ اُن دونوں انسانوں کو باہر نکال کر، کئی سونٹے مار کر، کُتّے کا جھوٹا اُنھیں کھلایا اور وہی پانی پلایا۔ پھر تالا بند کر کر تالی خواجہ کے حوالے کی۔ جب یہ سب ہو چکا، تب خواجہ نے آپ کھانا شُروع کیا۔ سَوداگر بچّے کو یہ حرکت پسند نہ آئی، گِھن کھا کر، ہاتھ کھانے میں نہ ڈالا۔ ہر چند خواجہ نے مِنّت کی، پَر اُس نے اِنکار ہی کیا۔ تب خواجہ نے سبب اُس کا پوچھا کہ تم کیُوں نہیں کھاتے؟

سَوداگر بچّے نے کہا: یہ حرکت تمھاری اپنے تئیں بَدنُما معلوم ہوئی، اِس لیے کہ اِنسان اَشرَفُ المخلوقات ہے اور کُتّا نَجِسُ العَین ہے؛ پَس

خُدا کے دُو بندوں کو کُتّے کا جھوٹا[1] کِھلانا کس مذہب و مِلّت میں رَوا ہے؟ فَقَط یہ غَنیمت نہیں جانتے کہ وِےؔ[2] تمھاری قَید میں ہیں، نہیں تُو تم اور وِےؔ[3] برابر ہیں۔ اب میرے تئیں شکؔ[4] آئی کہ تم مسلمان نہیں، کیا جانوں کون ہو کہ کُتّے کو پُوجتے ہو۔ مجھے تمھارا کھانا کھانا مَکرُوہ ہے، جب تلک یہ شُبہ* دل سے دور نہ ہو۔

خواجہ نے کہا: اَے بابا! جو کچھ تُو کہتا ہے، میں یہ سب سمجھتا ہوں اور اِسی خاطِر بدنام ہوں کہ اِس شہر کی خِلقت نے میرا نام "خواجۂ سَگ پَرَست"[5] رکھّا ہے۔ اِسیؔ[6] طَرح پُکارتے ہیں اور مشہور کیا ہے؛ لیکن خُدا کی لعنت کافروں اور مُشرِکوں پر ہوجیو۔ کَلِمہ پڑھا اور سَوداگر بچّے کی خاطِر جمع کی۔ تب سَوداگر بچّے نے پوچھا کہ اگر مسلمان بہ دِل ہو، تو اِس کا کیا باعث ہے کہؔ[7] ایسی حرکت کرکے اپنے تئیں بدنام کیا ہے؟ خواجہ نے کہا: اَے فرزند! نام میرا بدنام ہے اور دُگنا محصول اِس شہر میں بھرتا ہوں، اِسی واسطے کہ یہ بھید کِسوُ پر ظاہِر نہ ہو۔ عَجَب یہ ماجرا ہے کہ جو کوئی سُنے، سِوائے غم اور غُصّے کے اُسے کچھ اَور حاصل نہ ہو؛ تُو بھی مجھے مُعاف رکھ، کہ نہ مجھ میں قُدرت کہنے کی اور نہ تجھ میں طاقت سُننےؔ[8] کی رہے گی۔ سَوداگر بچّے نے اپنے دل میں غور کی کہ مجھے اپنے کام سے کام ہے" کیا ضرور ہے جو ناحقؔ[9] مَیں[10] زیادہ مُجَوِّز ہوؤں؟ بُولا: خَیر، اگر لائق کہنے کے نہیں تو نہ کہیے؛ کھانے میں ہاتھ ڈالا اور نِوالہ اُٹھا کر کھانے لگا۔ دُو مہینے تک اِسؔ[11] ہُوشیاری اور عقل مندی سے سَوداگر بچّے نے خواجہ کے ساتھ گُزران کی کہ کِسوُ پر ہرگز نہ کُھلا کہ یہ عورت ہے۔ سب یہی جانتے تھے کہ مرد ہے۔ اور خواجہ سے رُوز بہ رُوز ایسی مَحبّت زیادہ ہوئی کہ ایک دم اپنیؔ[12] آنکھوں

سے جُدا نہ کرتا۔

ایک دن عَین سے نوشی کی صحبت میں سوداگر بچّے نے رونا شروع کیا۔ خواجہ نے دیکھتے ہی خاطر داری کی اور رومال سے آنسو پونچھنے لگا اور سبب گریے کا پوچھا۔ سوداگر بچّے نے کہا: اَے قبلہ! کیا کہوں! کاشکے تمھاری خدمت میں بندگی پیدا نہ کی ہوتی اور یہ شفقت، جو صاحب میرے حق میں کرتے ہیں، نہ کرتے! اب دو مشکلیں میرے پیش آئی ہیں: نہ تمھاری خدمت سے جُدا ہونے کو جی چاہتا ہے اور نہ رہنے کا اِتّفاق یہاں ہو سکتا ہے۔ اب جانا ضرور ہوا، لیکن آپ کی جُدائی سے اُمید زِندگی کی نظر نہیں آتی۔

یہ بات سُن کر خواجہ بے اِختیار ایسا رونے لگا کہ ہچکی بندھ گئی اور بولا کہ اَے نورِ چشم! ایسی جلدی اِس اپنے بوڑھے خادم سے سیر ہوئے کہ اسے دِل گیر کیے جاتے ہو! قصد روانہ ہونے کا دل سے دور کرو۔ جب تلک میری زِندگی ہے، رہو۔ تمھاری جُدائی سے ایک دَم مَیں جیتا نہ رہوں گا، بغیر اَجل کے مر جاؤں گا۔ اور اِس مُلکِ فارِس کی آب و ہَوا بہت خوب اور موافق ہے؛ بہتر تو یوں ہے کہ ایک آدمی مُعتبَر بھیج کر، اپنے والِدَین کو مع اَسباب یہیں بلوا لو۔ جو کچھ سواری اور بار برداری درکار ہو، مَیں موجود کروں۔ جب ماں باپ تمھارے اور گھر بار سب آیا، اپنی خوشی سے کاروبار تجارت کا کیا کرنا۔ میں نے بھی اِس عمر میں زمانے کی بہت سختیاں کھینچیں ہیں اور مُلک مُلک پھرا ہوں؛ اب بوڑھا ہوا، فرزند نہیں رکھتا؛ مَیں تجھے بہتر اپنے بیٹے سے جانتا ہوں اور اپنا وَلی عہد و مختار کرتا ہوں؛ میرے کارخانے سے بھی ہوشیار

اور خبردار ہو۔ جب تلک جیتا ہوں، ایک ٹکڑا کھانے کو اپنے ہاتھ سے دو!
جب مرجاؤں، گاڑ داب دیجو اور سب مال و متاع میرا لیجو۔

تب سوداگر بچّے نے جواب دیا کہ واقعی صاحب نے زیادہ باپ سے میری غم خواری اور خاطرداری کی کہ مجھے ماں باپ بھول گئے؛ لیکن اِس عاصی کے والد نے ایک سال کی رُخصت دی تھی؛ اگر دیر لگاؤں گا، تو وے اِس پیری میں رُوتے رُوتے مرجائیں گے۔ پس رضامندی پدر کی خوشنودی خُدا کی ہے۔ اور اگر وُہ مجھ سے ناراض ہوں گے، تو مَیں ڈرتا ہوں کہ شاید دُعاے بد نہ کریں، کہ دونوں جہاں میں خُدا کی رحمت سے محروم رہوں۔ اب آپ کی یہی شفقت ہے کہ بندے کو حُکم کیجے کہ فرمانا قبلہ گاہ کا بجا لاوے اور حقِ پدری سے ادا ہووے۔ اور صاحب کی توجّہ کا اداے شکر، جب تلک دم میں دم ہے، میری گردن پر ہے؛ اگر اپنے مُلک میں بھی جاؤں گا، تو ہر دم دل و جان سے یاد کیا کروں گا۔ خُدا مُسبّبُ الاَسباب ہے، شاید پھر کوئی ایسا سبب ہو کہ قدم بوسی حاصل کروں۔

غرض سوداگر بچّے نے ایسی ایسی باتیں نون مرچیں لگا کر خواجہ کو سُنائیں کہ وُہ بچارا لاچار ہو کر ہونٹھ چاٹنے لگا۔ اَز بس کہ اُس پر شیفتہ اور فریفتہ ہو رہا تھا، کہنے لگا: اچھا اگر تم نہیں رہتے، تو مَیں ہی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ مَیں تجھ کو اپنی جان کے برابر جانتا ہوں! پس جب جان چلی جاوے، تو خالی بدن کس کام آوے۔ اگر تو اِسی میں رضامند ہے، تو چل اور مجھے بھی لے چل۔ سوداگر بچّے سے یہ کہ کر اپنی بھی تیاری سفر کی کرنے لگا اور گماشتوں کو حُکم

کیا کہ بار بَرداری کی فِکر جلدی کرو۔

جب خواجہ کے چلنے کی خبر مشہور ہوئی، وہاں کے سَوداگروں نے سُن کر سب نے تہیّۂ سفر کا کیا۔ خواجۂ سَگ پَرَست گنج اور جواہر بے شُمار، نوکر اور غُلام اَن گِنَت، تحفے اور اَسبابِ شاہانہ بہت سا ساتھ لے کر؛ شہر کے باہَر تنبو اور قَنات اور بے چوبے اور سَراپَردے اور گُندلے کھڑے کروا کر، اُن میں داخِل ہوا۔ جتنے تُجّار تھے، اپنی اپنی بِساط مُوافق مال سَوداگری کا لے کر ہمراہ ہوئے۔ بَرائے خود ایک لشکر ہو گیا۔

ایک دن جُوگنی کو پیٹھ دے کر وہاں سے کُوچ کیا۔ ہزاروں اونٹوں پر شَلیتے اَسباب کے اور خچّروں پر صندوق نَقد، جَواہِر کے لاد کر؛ پانچ سَو غلام دَشتِ قِبچاق اور زَنگ و روم کے مُسلّح، صاحِبِ شَمشیر؛ تازی اور تُرکی و عِراقی و عَرَبی گھوڑوں پر چڑھ کر چلے۔ سب کے پیچھے خواجہ اور سَوداگر بچّہ خِلعَتِ فاخرہ پہنے، سُکھپال پر سوار؛ اور ایک تخت بَغدادی اونٹ پر کَسا، اُس پر کُتّا مسند پر سویا ہوا؛ اور اُن دونوں قیدیوں کے قفس ایک شُتُر پر لٹکائے ہوئے روانہ ہوئے۔ جس منزل میں پہنچتے، سب سَوداگر خواجہ کی بارگاہ میں آکر حاضِر ہوتے اور دسترخوان پر کھانا کھاتے اور شراب پیتے۔ خواجہ، سَوداگر بچّے کے ساتھ ہونے کی خوشی میں شُکر خُدا کا کرتا اور کُوچ دَر کُوچ چلا جاتا تھا۔ بارے بہ خَیرو عافیت نزدیک قُسطنطُنیہ کے آ پہنچے۔ باہَر شہر کے مُقام کیا۔ سَوداگر بچّے نے کہا: اَے قِبلہ! اگر رُخصت دیجے تو مَیں جا کر ماں باپ کو دیکھوں اور مکان صاحِب کے واسطے خالی کروں۔ جب مزاجِ سامی میں

آوے، شہر میں داخل ہوجیے۔

خواجہ نے کہا: تمھاری خاطر تو میں یہاں آیا؛ اچھا خیر، جلد مِل جُل کر میرے پاس آؤ اور اپنے نزدیک میرے اُترنے کو مکان دو۔ سوداگر بچہ رُخصت ہوکر اپنے گھر میں آیا۔ سب وزیر کے محل کے آدمی حیران ہوئے کہ یہ مرد کون گھس آیا! سوداگر بچہ، یعنے بیٹی وزیر کی، اپنی ماں کے پانو پر جاگری اور رُوئی اور بولی کہ میں تمھاری جائی ہوں۔ سُنتے ہی، وزیر کی بیگم گالیاں دینے لگی کہ اے ترنٹی(۶)! تو بڑی شتّا ہو نکلی! اپنا مُنہ تو نے کالا کیا اور خاندان کو رُسوا کیا! ہم تو تیری جان کو رو پیٹ کر، صبر کر کے تجھ سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے؛ جا دفع ہو۔ تب وزیر زادی نے سر پر سے پگڑی اُتار کر پھینک دی اور بولی: اے اماجان! میں بُری جگہ نہیں گئی، کچھ بدی نہیں کی؛ تمھارے بہ موجِب فرمانے کے بابا کو قید سے چھڑانے کی خاطر یہ سب فِکر کی۔ اَلحمدُ لِلّٰہ! کہ تمھاری دُعا کی برکت سے اور اللہ کے فضل سے پورا کام کر کے آئی ہوں کہ نیشاپور سے اُس سوداگر کو بہ ضمع گئے، جس کے گلے میں وے لعل پڑے ہیں، اپنے ساتھ لائی ہوں۔ اور تمھاری امانت میں بھی خیانت نہیں کی، سفر کے لیے مردانہ بھیس کیا ہے۔ اب ایک روز کا کام باقی ہے؛ وہ کر کر، قبلہ گاہ کو بندی خانے سے چھڑاتی ہوں اور اپنے گھر میں آتی ہوں۔ اگر حکم ہو تو پھر جاؤں اور ایک روز باہر رہ کر خدمت میں آؤں۔ ماں نے جب خوب معلوم کیا کہ میری بیٹی نے مردوں کا کام کیا اور اپنے تئیں سب طرح سلامت و محفوظ رکھا ہے، خدا کی درگاہ میں ناک گھسنی کی اور خوش ہو کر بیٹی کو چھاتی

سے لگا لیا اور مُنہ چوما ، بلائیں لیں ، دُعائیں دیں اور رُخصت کیا ، کہ تو جو مُناسب جانے سو کر ، میری خاطر جمع ہوئی۔

وزیر زادی پھر سوداگر بچّہ بن کر خواجۂ سگ پرست پاس چلی۔ وہاں خواجہ کو جُدائی اُس کی اَز بَس کہ شاق ہوئی ، بے اِختیار ہو کر کوچ کیا۔ اِتّفاقاً نزدیک شہر کے اِدھر سے سوداگر بچّہ جاتا تھا اور اُدھر سے خواجہ آتا تھا ، عین راہ میں مُلاقات ہوئی۔ خواجہ نے دیکھتے ہی کہا : بابا! مجھ بوڑھے کو اکیلا چھوڑ کر کہاں گیا تھا ؟ سوداگر بچّہ بولا : آپ سے اِجازت لے کر اپنے گھر گیا تھا ، آخر مُلازمت کے اِشتیاق نے وہاں رہنے نہ دیا ، آ کر حاضر ہوا۔ شہر کے دروازے پر ، دریا کے کِنارے ، ایک باغ (۷) سایہ دار دیکھ کر خیمہ اِستادہ کیا اور وَہیں اُترے۔ خواجہ اور سوداگر بچّہ باہم بیٹھ کر شراب و کباب پینے کھانے لگے۔ جب عصر کا وقت ہوا ، سیر تماشے کی خاطر خیمے سے نکل کر صندلیوں پر بیٹھے۔ اِتّفاقاً ایک قَراوُلِ بادشاہی اُدھر آ نکلا ، اِن کا لشکر اور نشست (۸) بَرخاست دیکھ کر اچنبھے (۹) ہو رہا اور دل میں کہا : شاید اِیلچی کسو بادشاہ کا آیا ہے۔ کھڑا تماشا دیکھتا تھا۔

خواجہ کے شاطر نے اُس کو آگے بُلایا اور پوچھا کہ تو کون ہے ؟ اُس نے کہا : مَیں بادشاہ کا میر شکار ہوں۔ شاطر نے خواجہ سے اُس کا اَحوال کہا۔ خواجہ نے ایک غُلام کافری کو کہا کہ جا کر بازدار سے کہہ کہ ہم مسافر ہیں ؛ اگر جی چاہے تو آؤ بیٹھو ، قہوہ ، قلیان حاضر ہے۔ جب میر شکار نے تمام سوداگر کا سُنا ، زیادہ مُتعجّب ہوا اور یتیم کے ساتھ خواجہ کی مجلس میں آیا۔ وہ (۱۰) لوازم اور شان و شوکت

اور سیاہ و غُلام دیکھے۔ خواجہ اور سَوداگر بچّے کو سلام کیا اور مرتبہ سَگ کا نگاہ کیا؛ ہُوش اُس کے جاتے رہے، ہَکّا بَکّا سا ہوگیا۔ خواجہ نے اُسے بِٹھلاکر قَہوے کی ضِیافت کی۔ قَراوَل نے نام[1] و نشان خواجہ کا پوچھا۔ جب رُخصت مانگی، خواجہ نے کئی تھان اور کچھ تُحفے اُسے دے کر اِجازت دی۔

صُبح کو جب بادشاہ کے دربار میں حاضِر ہوا، درباریوں سے خواجہ سَوداگر کا ذِکر کرنے لگا۔ رَفتہ رَفتہ مجھ کو خبر ہوئی۔ مِیرِ شِکار کو میں نے رُو بہ رُو طَلَب کیا اور سَوداگر کا اَحوال پوچھا۔ اُس نے جو کچھ دیکھا تھا، عرض کیا۔ سُننے سے کُتّے کے تَجمُّل کے اور دُو آدمیوں کے پِنجرے میں قَید ہونے کے، مجھ کو خَفگی آئی، میں نے فرمایا: وَہ مَردُود تاجِر واجِبُ الْقَتل ہے۔ نَسَقچیوں کو حُکم کیا کہ جلد جاؤ، اُس بے دِین کا سِر کاٹ لاؤ۔ قَضا کار وُہی اِیلچی فِرنگ کا دربار میں حاضِر تھا، مُسکرایا۔ مجھے اَور بھی غَضَب زیادہ ہوا، فرمایا کہ اَے بے اَدَب! بادشاہوں کے حُضور میں بے سبب دانت کھولنے اَدَب سے باہَر ہیں۔ بے مَحَل ہَنسنے سے رُونا بہتر ہے۔ اُس نے اِلتماس کیا: جہاں پناہ! کئی باتیں خیال میں گُزریں لِہٰذا فِدوی مُتَبَسِّم ہوا: پہلی یہ کہ وزیر سچّا ہے، اب قَید خانے سے رِہائی پاوے گا۔ دوسرے یہ کہ بادشاہ خونِ ناحق سے اُس وزیر کے بچے۔ تیسرے یہ کہ قبلۂ عالم نے بے سبب اور بے تَقصِیر اُس سَوداگر کو حُکم قَتل کا کیا؛ اِن حَرکتوں سے تعجُّب آیا کہ بے تحقیق، ایک بے وُقوف کے کہنے سے آپ ہر کِسُو کو حُکم قَتل کا کر بیٹھتے ہیں۔ خُدا جانے فی الحقیقت اُس خواجہ کا اَحوال کیا ہے۔ اُسے حُضور میں طَلَب کیجیے اور اُس کی وارِدات پوچھیے؛ اگر تَقصِیر وار ٹھہرے، تب مُختار ہو؛ جو مرضی میں آوے،

اُس سے سُلوک کیجیے۔

جب ایلچی نے اِس طرح سے سمجھایا، مجھے بھی وزیر کا کہنا یاد آیا، فرمایا: جلد سوداگر کو اُس کے بیٹے کے ساتھ اور وُہ سگ اور قفس حاضر کرو۔ قُورچی اُس کے بُلانے کو دَوڑائے[۱]۔ ایک دَم میں سب کو حُضور میں لے آئے۔ رُو بہ رُو طَلَب کیا۔ پہلے خواجہ اور اُس کا پِسَر آیا، دونوں لِباسِ فاخرہ پہنے ہوئے۔ سَوداگر بچّے کا جمال دیکھنے سے سب اَدنا[۲] اَعلا حَیران اور بھَچَک[۳] ہوئے۔ ایک خوانِ طِلائی جَواہِر سے بھرا ہوا، کہ ہر ایک رَقَم کی چھُوٹ نے سارے مکان کو روشن کر دیا، سَوداگر بچّہ ہاتھ میں لیے آیا اور میرے تخت کے آگے نِچھاوَر کیا۔ آداب، کُورنِشات بجا[۴] لا کر کھڑا ہوا۔ خواجہ نے بھی زمین چومی اور دُعا کرنے لگا۔ اِس گُویائی سے بُولتا تھا کہ گُویا بُلبُلِ ہزار داستاں ہے۔ میں نے اُس کی لِیاقت کو بہت پسند کیا، لیکن عِتاب کے رُو[۵] سے کہا: اَے شیطان آدمی کی صورت! تو نے یہ کیا جال پھیلایا ہے اور اپنی راہ میں کنواں[۶] کھُودا ہے؟ تیرا کیا دین ہے؟ اور یہ کون آئین ہے؟ کس پَیغمبر کی اُمّت ہے؟ اگر کافِر ہے، تو بھی یہ کیسی مَت ہے؟ اور تیرا کیا نام ہے کہ تیرا یہ کام ہے؟

اُن نے کہا: قبلۂ عالَم کی عُمر و دَولت بڑھتی رہے! غُلام کا دین یہ ہے کہ خُدا واحِد ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں اور مُحمّد مُصطفیٰ[۷] (صَلّی اللہُ عَلَیہِ وَ آلِہٖ وَسَلّم) کا کلِمہ پڑھتا ہوں، اور اُس کے بعد بارہ اِمام کو اپنا پیشوا[۸] جانتا ہوں۔ اور آئین میری یہ ہے کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور رُوزہ رکھتا ہوں اور حج بھی کر آیا ہوں اور اپنے مال سے خُمس[۹]، زکوٰۃ دیتا ہوں

اور مُسلمان کہاتا ہوں۔ لیکن ظاہر میں یہ سارے عیب جو مجھ میں بھرے ہیں، جن کے سبب سے آپ ناخوش ہوئے ہیں اور تمام خَلقُ اللہ[1] میں بدنام ہو رہا ہوں، اِس کا ایک باعث ہے کہ ظاہر نہیں کر سکتا۔ ہر چند سنگ پَرَست مشہور ہوں اور مُضاعَف محصول دیتا ہوں؛ یہ سب قُبول کیا ہے، پَر دل کا بِھید کسوُ سے نہیں کہا۔

اِس بہانے سے میرا غُصّہ زیادہ ہوا اور کہا: مجھے تو باتوں میں پُھسلاتا ہے! مَیں نہیں ماننے کا، جب تلک اِس اپنی گُم راہی کی دلیلِ معقول عرض نہ کرے کہ میرے دل نَشیں ہو، تب توٗ جان سے بچے گا، نہیں تو اِس کے قِصاص میں تیرا پیٹ چاک کرواؤں گا[2]، تو سب کو عبرت ہو کہ بارِ دیگر کوئی دینِ مُحمّدی میں رَخنہ نہ کرے۔ خواجہ نے کہا: اَے بادشاہ! مجھ کم بَخت کے خون سے دَرگُذر کر اور جتنا مال میرا ہے، کہ گِنتی اور شُمار سے باہَر ہے، سب کو ضَبط کر لے اور مجھے اور میرے بیٹے کو، اپنے تخت کے تَصَدُّق کر کر چھوڑ دے اور جان بخشی[3] کر۔ میں نے تبَسُّم کر کے کہا: اَے بے وُقوف! اپنے مال کی طَمَع مجھے دِکھاتا ہے! سِوائے سچ بولنے کے اب تیری مُخَلصی نہیں۔ یہ سُنتے ہی خواجہ کی آنکھوں سے بے اِختیار آنسو ٹپکنے لگے اور اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری اور بُولا: مَیں تو بادشاہ کے رُوٗ بہ رُوٗ گُنہ گار ٹھہرا، مارا جاؤں گا؛ اب کیا کروں! تجھے کس کو سَونپوں! میں نے ڈانٹا کہ اَے مکّار! بس اب عُذر بہت کیے؛ جو کہنا ہے، جلد کہہ۔

تب تو اُس مرد نے قدم بڑھا کر، تخت کے پاس آ کر، پایے کو بُوسہ دیا اور

صِفَت وثَنا کرنے لگا اور بُولا: اَے شَہَنْشاہ! اگر حُکْم قَتْل کا میرے حق[۱] میں نہ ہوتا، تو سب رِیاسَتیں سَہتا اور اپنا ماجرا نہ کہتا؛ لیکن جان سب سے عزیز ہے، کوئی آپ سے کُنْوِیں[۲] میں نہیں گِرتا، پَس جان کی مُحافَظَت واجِب ہے اور ترک واجب کا، خِلافِ حُکْمِ خُدا کے ہے۔ خَیر، جو مرضیِ مُبارَک یِہی ہے تو سَرگُذَشْت[۳] اِس پیرِ ضَعِیف کی سُنِیے۔ پہلے حُکْم ہو کہ وُہ دونوں[۴] قَفَس، جِن[۵] میں دُو آدمی قَید ہیں، حُضُور میں لاکر رکھیں۔ مَیں اپنا اَحوال کہتا ہوں؛ اگر کہیں جھوٹھ کہوں، تو اُن سے پوچھ کر مجھے قائل کیجیے اور انصاف فرمائیے۔ مجھے یہ بات اُس کی پسند آئی۔ پِنجروں کو منگواکر، اُن دونوں[۶] کو نکلواکر خواجہ کے پاس کھڑا کیا۔

خواجہ نے کہا: اَے[۷] بادشاہ! یِہ مرد جو داہنی طرف ہے، غُلام کا بڑا بھائی ہے اور جو بائیں کو کھڑا ہے، مَنجھلا بِرادَر ہے؛ مَیں اِن دونوں سے چھوٹا ہوں۔ میرا باپ مُلکِ فارِس میں سَوداگر تھا۔ جب مَیں چَودہ بَرَس[۸] کا ہوا، قِبلہ گاہ نے رِحلَت کی۔ جب تَجْہِیز و تَکْفِین سے فَراغَت ہوئی اور پھول[۹] اُٹھ چکے؛ ایک رُوز اِن دونوں[۱۰] بھائیوں نے مجھے کہا کہ اَب باپ کا مال جو کچھ ہے، تَقسیم کرلیں۔ جس کا دل جو چاہے، سُو کام کرے۔ میں نے سُن کر کہا: اَے بھائیو! یِہ کیا بات ہے! مَیں تمھارا غُلام ہوں، بھائی چارگی[۱۱] کا دعویٰ نہیں رکھتا۔ ایک باپ مرگیا، تم دونوں[۱۲] میرے پِدَر کی جگہ میرے سِر پر قائم ہو۔ ایک نانِ خُشک چاہتا ہوں جس میں زِندَگی بَسَر کردوں اور تمھاری خِدمت میں حاضِر رہوں، مجھے حِصّے بَخرے سے کیا کام ہے! تمھارے آگے کے جھوٹے سے اپنا پیٹ بھرلوں گا اور تمھارے پاس رہوں گا۔ مَیں لڑکا ہوں،

کچھ پڑھا لکھا بھی نہیں، مجھ سے کیا ہو سکے گا! ابھی تم مجھے تربیت کرو۔
یہ سُن کر جواب دیا کہ تؤ چاہتا ہے اپنے ساتھ ہمیں بھی خراب اور محتاج کرے۔ مَیں چُپکا ایک گوشے میں جا کر رُونے لگا۔ پھر دل کو سمجھایا کہ بھائی آخر بُزُرگ ہیں، میری تعلیم کی خاطر چَشْم نُمائی کرتے ہیں کہ کچھ سیکھے۔ اِسی فِکر میں سُو گیا۔ صُبح کو ایک پِیادہ قاضی کا آیا اور مجھے دارُالشَّرع میں لے گیا۔ وہاں دیکھا تو یہی دونوں بھائی حاضِر ہیں۔ قاضی نے کہا: کیُوں اپنے باپ کا وَرْثَہ[1] بانٹ چوُنٹ نہیں لیتا؟ میں نے گھر میں جو کہا تھا[2]، وہاں بھی جواب دیا۔ بھائیوں نے کہا: اگر یہ بات اپنے دل سے کہتا ہے، تو ہمیں لادعویٰ لکھ دے کہ باپ کے مال وَ اَسباب سے مجھے کچھ علاقہ نہیں۔ تب بھی میں نے یہی سمجھا کہ یہ دونوں میرے بُزُرگ ہیں، میری نصیحت کے واسطے کہتے ہیں کہ باپ کا مال لے کر بے جا تَصرُّف نہ کرے۔ بہ موُجب اِن کی مرضی کے فارِغ خَطی بہ مُہْرِ قاضی میں نے لکھ دی۔ یہ راضی ہوئے، مَیں گھر میں آیا۔
دوسرے دن مجھ سے کہنے لگے: اَے بھائی! یہ مکان جس میں تؤ رہتا ہے، ہمیں دَرکار ہے؛ تؤ اپنی بوُد و باش کی خاطِر اَور جگہ لے کر جا رہ۔ تب میں نے دریافت کیا کہ یہ باپ کی حَوِیلی میں بھی رہنے سے خوش نہیں۔ لاچار اِرادہ اُٹھ جانے کا کیا۔ جہاں پناہ! جب میرا باپ جیتا تھا؛ تو جس وقت سفر سے آتا، ہر ایک مُلک کا تُحفہ بہ طریق سَوغات کے لاتا اور مجھے دیتا؛ اِس واسطے کہ چھوٹے بیٹے کو ہر کوئی زیادہ پیار کرتا ہے۔ میں نے اُن کو بیچ بیچ کر[3] تھوڑی سی اپنی نَج کی پوُنجی بَہَم پہنچائی تھی، اُسی سے کچھ خَرید فرَوخت

کرتا۔ ایک بار لَونڈی میری خاطر تُرکستان سے میرا باپ لایا۔ اور ایک دَفعہ گھوڑے[1] لے کر آیا، اُن میں سے ایک بچھیرا[2] ناکَند، کہ ہونہار تھا، وہ بھی مجھے دیا۔ مَیں اپنے پاس سے دانہ گھاس اُس کا کرتا تھا۔

آخر اِن کی بے مُرَوَّتی دیکھ کر ایک حَویلی خرید کی، وہاں جا رہا۔ یہ کُتّا بھی میرے ساتھ چلا آیا۔ واسطے ضَرُورِیات کے اَسباب خانہ داری کا جمع کیا اور دُو غُلام خدمت کی خاطر مُول لیے اور باقی پونجی سے ایک دُکان[3] بزّازی کی کر کے، خُدا کے تَوَکُّل پر بیٹھا۔ اپنی قسمت پر راضی تھا۔ اگرچہ بھائیوں نے بَدخُلقی کی، پَر خُدا جو[4] مہربان ہوا، تین بَرَس کے عرصے میں ایسی دُکان[5] جمی کہ مَیں صاحبِ[6] اِعتبار ہوا۔ سب سرکاروں میں جو تُحفہ چاہیتا[7]، میری ہی دُکان[8] سے جاتا۔ اُس میں بہت سے روپے کمائے اور نہایت فَراغت سے گزرنے لگی۔ ہر دم جنابِ[9] باری میں شُکرانہ کرتا اور آرام سے رہتا۔ یہ کَبت اکثر اپنے اَحوال پر پڑھتا:

رُوٹھے کیوں نہ راجا، واتیں کچھو ناہیں کاجا، ایک تُو سے مہاراجا، اور کَون کو سَراہیے
رُوٹھے کیوں نہ بھائی، واتیں کچھو نہ بَسائی، ایک تُو ہی ہے سَہائی، اور کَون پاس جائیے
رُوٹھے کیوں نہ مِتر، شَتَرَ[10]، آٹھوں جام ایک راوَرِے چَرَن کے نیہہ کو نِبھائیے
سَنسار ہے رُوٹھا، ایک تُو ہے اَنُوٹھا، سب جو میں گے انگوٹھا، ایک تُو نہ رُوٹھا چاہیے[11]

اِتّفاقاً جُمعے* کے رُوز مَیں اپنے گھر[12] بیٹھا تھا کہ ایک غُلام میرا سَودے سُلَف کو بازار گیا تھا، بعد ایک دَم کے رُوتا ہوا آیا۔ مَیں نے سبب پوچھا کہ تجھے کیا ہوا؟ خفا ہو کر بُولا کہ تمھیں کیا کام ہے، تم خوشی مَناؤ، لیکن قیامت

میں کیا جواب دو گے؟ میں نے کہا: اَے حَبشی! ایسی کیا بلا تجھ پر نازِل ہوئی؟ اُس نے کہا: یہ غَضَب ہے کہ تمھارے بڑے بھائیوں کی، چوک کے چَوراہے میں، ایک یہودی نے مُشکیں باندھیں[1] ہیں اور قَمچیاں مارتا ہے اور ہنستا ہے کہ اگر میرے[2] روپے نہ دو گے، تو مارتے مارتے مار ہی ڈالوں گا۔ بھلا مجھے ثَواب تُو ہوگا۔ بَس تمھارے بھائیوں کی یہ نَوبَت اور تم بے فِکر ہو، یہ بات اچّھی ہے؟ لوگ کیا کہیں گے؟ یہ بات غُلام سے سُنتے ہی لہو نے جُوش کیا، ننگے پانو[3] بازار کی طرف دَوڑا اور غُلاموں کو کہا: جلد روپے[4] لے کر آؤ۔ جُو نہیں وہاں گیا، دیکھا تُو جو کچھ غُلام نے کہا تھا، سچ ہے، اِن پر مار پڑ رہی ہے۔ حاکم کے پیادوں کو کہا: واسطے خُدا کے! ذرا[5] رہ جاؤ[6]، مَیں یہودی سے پوچھوں کہ ایسی کیا تقصیر کی ہے، جس کے بدلے یہ تعزیر کی ہے۔

یہ کہ کر مَیں یہودی کے نزدیک گیا اور کہا: آج رُوزِ آدینہ[7] ہے[8]، اِن کو کیوں ضَرْبِ شَلّاق[9] کر رہا ہے؟ اُس نے جواب دیا: اگر حمایت کرتے ہو تو پوری کرو، اِن کے عِوَض روپے[10] حوالے کرو، نہیں تُو اپنے گھر کی راہ لُو۔ میں نے کہا: کیسے روپے[11]! دَست آویز نکال، مَیں روپے[12] گن دیتا ہوں اُن نے کہا: تمسُّک حاکم کے پاس دے آیا ہوں۔ اِس میں میرے دونوں[13] غُلام دُو بَدْرَہ[14] روپے لے کر آئے۔ ہزار روپے[15] میں نے یہودی کو دِیے اور بھائیوں کو چُھڑایا۔ اِن کی یہ صورت ہو رہی تھی کہ بدن سے ننگے اور بھوکھے پیاسے۔ اپنے ہمراہ گھر میں لایا، وُو نہیں حمام میں نہلوایا[16]، نئی پوشاک پہنائی، کھانا کھلایا۔ ہرگز اِن سے یہ نہ کہا کہ اِتنا مال

باپ کا تم نے کیا کیا، شاید شرمندہ ہوں۔

اَے بادشاہ! بیٹے دونوں موجود ہیں، پوچھیے کہ سچ کہتا ہوں یا کوئی بات جھوٹھ بھی ہے۔ خیر، جب کئی دِن میں مار کی کوفت سے بحال ہوئے، ایک رُوز میں نے کہا کہ اَے بھائیو! اب اِس شہر میں تم بے اِعتبار ہوگئے ہو، بہتر یہ ہے کہ چند رُوز سفر کرو۔ یہ سُن کر چُپ ہو رہے۔ میں نے معلوم کیا کہ راضی ہیں، سفر کی تیاری کرنے لگا۔ پال پرتَل، بار برداری اور سواری کی فِکر کر کے، بیس ہزار روپے کی جِنس تجارت کی خرید کی۔ ایک قافلہ سوداگروں کا بُخارے کو جاتا تھا، اُن کے ساتھ کر دیا۔

بعد ایک سال کے وُہ کارواں پھر آیا، ان کی خیر خبر کچھ نہ پائی۔ آخر ایک آشنا سے قسمیں دے کر پوچھا۔ اُس نے کہا: جب بُخارے میں گئے، ایک نے جوئے خانے میں اپنا تمام مال ہار دِیا؛ اب وہاں کی جاروب کَشی کرتا ہے اور پھڑ کو پیتا پوتتا ہے۔ جُواری جو جمع ہوتے ہیں، اُن کی خدمت کرتا ہے؛ وُہ بہ طَرِیق خیرات کے کچھ دیتے ہیں، وہاں گرگا بنا پڑا رہتا ہے۔ اور دوسرا بُوزہ فروش کے لڑکے پر عاشق ہوا، اپنا مال سارا صَرف کیا؛ اب وُہ بُوزے خانے کی ٹہل کیا کرتا ہے۔ قافلے کے آدمی اِس لیے نہیں کہتے کہ تُو شرمندہ ہوگا۔

یہ اَحوال اُس شخص سے سُن کر میری عجَب حالت ہوئی۔ مارے فِکر کے نیند، بھوکھ جاتی رہی۔ زادِ راہ لے کر قصد بُخارے کا کیا۔ جب وہاں پہنچا، دونوں کو ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر اپنے مکان میں لایا۔ غُسل کروا کر نئی پوشاک

پہنائی اور اِن کی خجالت کے ڈر سے ایک بات مُنہ پر نہ رکھی۔ پھر مال سوداگری کا اِن کے واسطے خریدا اور ارادہ گھر کا کیا۔ جب نزدیک نیشاپور کے آیا، ایک گانو میں بہ مع مال اَسباب اِن کو چھوڑ کر گھر میں آیا، اِس لیے کہ میرے آنے کی کسو کو خبر نہ ہو۔ بعد دو دِن کے مشہور کیا کہ میرے بھائی سفر سے آئے ہیں، کل اُن کے اِستقبال کی خاطِر جاؤں گا۔ صُبح کو چاہا کہ چلوں، ایک گرہشت اُسی مَوضع کا میرے پاس آیا اور فریاد کرنے لگا۔ مَیں اُس کی آواز سُن کر باہَر نکلا۔ اُسے رُوتا دیکھ کر پوچھا کہ کیوں زاری کرتا ہے؟ وُہ بُولا: تمھارے بھائیوں کے سبب سے ہمارے گھر لوٹے گئے۔ کاشکے اُن کو تم وہاں نہ چھوڑ آتے!

میں نے پوچھا: کیا مصیبت گزری؟ بُولا کہ رات کو ڈاکا آیا، اُن کا مال و اَسباب لوٹا اور ہمارے گھر بھی لوٹ لے گئے۔ میں نے افسوس کیا اور پوچھا کہ اَب وِے دونوں کہاں ہیں؟ کہا: شہر کے باہَر ننگے مُنگے، خراب خستہ بیٹھے ہیں۔ وُونہیں دُو جُوڑے کپڑوں کے ساتھ لے کر گیا، پہنا کر گھر میں لایا۔ لوگ سُن کر اِن کے دیکھنے کو آتے تھے اور وِے مارے شرمندگی کے باہَر نہ نکلتے تھے۔ تین مہینے اِسی طَرح گزرے، تب میں نے اپنے دل میں غور کی کہ کب تلک یہ کُونے میں دَبکے بیٹھے رہیں گے۔ بہتر تو اِن کو اپنے ساتھ سفر میں لے جاؤں۔ بھائیوں سے کہا: اگر فرمائیے تو یہ فدوی آپ کے ساتھ چلے۔ وِے خاموش رہے۔ پھر لوازِمہ سفر کا اور جِنس سوداگری کی تیّار کر کے چلا اور اِن کو ساتھ لیا۔

جس وقت مال کی زکوٰۃ دے کر اَسباب کشتی پر چڑھایا اور لنگر اُٹھایا،

ناؤ چلی[1]، یہ کُتّا کِنارے پر سو رہا تھا؛ جب چونکا اور جہاز کو مانجھ دھار[2] میں دیکھا، حَیران ہوکر بھونکا اور دریا میں کود پڑا اور پیرنے لگا۔ میں نے ایک پَن سوئی[3] دَوڑا دی۔ بارے سگ کو لے کر کشتی میں پہنچایا۔ ایک مہینا[4] خیر و عافیت سے دریا میں گزرا۔ کہیں مَنجھلا بھائی میری لَونڈی پر عاشق ہوا، ایک دن بڑے بھائی سے کہنے لگا کہ چھوٹے بھائی کی مِنّت اُٹھانے سے بڑی شرمندگی حاصل ہوئی، اِس کا تدارُک کیا کریں؟ بڑے نے جواب دیا کہ ایک صَلاح دل میں ٹھہرائی ہے، اگر بَن آوے تو بڑی بات ہے۔ آخر دونوں نے مَصلَحت کر کے تجویز کی کہ اِسے مار ڈالیں اور سارے مال اَسباب[5] کے قابض، مُتَصرِّف[6] ہوں۔

ایک دن مَیں جہاز کی کوٹھری میں سوتا تھا اور لَونڈی پانو[7] داب رہی تھی، مَنجھلا بھائی آیا اور جلدی سے مجھے جگایا۔ مَیں ہڑبڑا کر چونکا اور باہر نکلا۔ یہ کُتّا بھی میرے ساتھ ہولیا۔ دیکھوں تو بڑا بھائی جہاز کی باڑ[8] پر ہاتھ ٹیکے، ٹھہرا[9] ہوا، تماشا دریا کا دیکھ رہا ہے اور مجھے پکارتا ہے۔ میں نے پاس جاکر کہا: خیر تو ہے؟ بولا: عجب طرح کا تماشا ہو رہا ہے کہ دریائی آدمی موتی کی سیپیاں اور مونگے کے درخت ہاتھ میں لیے ناچتے ہیں۔ اگر اَور کوئی ایسی بات خلافِ قیاس کہتا تو مَیں نہ مانتا، بڑے بھائی کے کہنے کو راست جانا، دیکھنے کو سر جھکایا۔ ہر چند نگاہ کی، کچھ نظر نہ آیا اور وُہ یہی کہتا رہا: اب دیکھا؟ لیکن کچھ ہو تو دیکھوں۔ اِس میں مجھے غافل پاکر، مَنجھلے نے اَچانک پیچھے آکر ایسا دَھکیلا[10] کہ بے اِختیار پانی میں گر پڑا، اور وُہ رونے دھونے لگے کہ دَوڑیو! ہمارا بھائی دریا میں ڈوبا۔

اِتنے میں ناؤ بڑھ گئی اور دریا کی لہر[1] مجھے کہیں سے کہیں لے گئی۔ غوطے پر غوطے[2] کھاتا تھا اور موجوں میں چلا جاتا تھا، آخر تھک گیا۔ خدا کو یاد کرتا تھا، کچھ بس نہ چلتا تھا۔ ایک بارگی کسو چیز پر ہاتھ پڑا، آنکھ کھول[3] کر دیکھا تو یہی کُتا ہے۔ شاید جس دم مجھے دریا میں ڈالا، میرے ساتھ یہ بھی کُودا اور پیرتا ہوا میرے ساتھ بہتا چلا جاتا تھا۔ میں نے اِس کی دُم پکڑ لی۔ اللہ نے اِس کو میری زندگی کا سبب کیا۔ سات دن اور رات یہی صورت گزری، آٹھویں دن کنارے جا لگے۔ طاقت مطلق نہ تھی، لیٹے لیٹے کروٹیں کھا کر جُوں تُوں اپنے تئیں خشکی میں ڈالا۔ ایک دن بے ہوش پڑا[4] رہا۔ دوسرے دن کُتے کی آواز کان میں گئی، ہوش میں آیا، خدا کا شکر بجا لایا، اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دور سے سوادِ[5] شہر نظر آیا، لیکن قوت کہاں کہ ارادہ کروں؛ لاچار دو قدم چلتا، پھر بیٹھتا۔ اِسی حالت سے شام تک کوس[6] بھر راہ کاٹی۔ بیچ میں ایک پہاڑ ملا، رات کو وہاں رہ رہا، صبح کو شہر میں داخل ہوا۔ جب بازار میں گیا، نان بائی اور حلوائیوں کی دکانیں[8] نظر آئیں، دل ترسنے لگا۔ نہ پاس پیسا[9] جو خرید کروں، نہ جی چاہے کہ مفت مانگوں۔ اِسی طرح اپنے دل کو تسلی دیتا ہوا کہ اگلی دکان[10] سے لوں گا، چلا جاتا تھا۔ آخر طاقت نہ رہی اور پیٹ میں آگ لگی، نزدیک تھا کہ روح بدن سے نکلے[11]؛ ناگاہ دو جوان کو دیکھا کہ لباس عجم کا پہنے اور ہاتھ پکڑے چلے آتے ہیں۔ اِن کو دیکھ کر خوش ہوا کہ یہ اپنے مُلک کے انسان ہیں، شاید آشنا صورت ہوں، اِن سے اپنا احوال کہوں گا۔ جب نزدیک آئے، تو میرے دونوں برادرِ حقیقی تھے۔ دیکھ کر نہایت

شاد ہوا، شُکر خُدا کا کیا کہ خُدا نے آبرو رکھ لی، غَیر کے آگے ہاتھ نہ پَسارا۔ نزدیک جاکر سلام کیا اور بڑے بھائی کا ہاتھ چوما۔ اُنھوں نے مجھے دیکھتے ہی غُل(۲) و شُور کیا۔ مَنجھلے(۳) بھائی نے طمانچہ(۴) مارا کہ میں لڑکھڑا(۵) کر گر پڑا۔ بڑے بھائی کا دامن پکڑا کہ شاید یہ حمایت کرے گا، اُس نے لات ماری۔

غَرَض دونوں نے مجھے خوب خُورد(۶) خام کیا اور حضرت یوسُف کے بھائیوں کا سا کام کیا۔ ہر چند میں نے خُدا کے واسطے دِیے اور گِھگیایا(۷)، ہرگز رَحم نہ کھایا۔ ایک خِلقت اِکٹھی(۸) ہوئی، سب نے پوچھا: اِس کا کیا گُناہ ہے؟ تب بھائیوں نے کہا: یہ حرام زادہ ہمارے بھائی کا نوکر تھا، سو اُس کو دریا میں ڈال دیا اور مال اَسباب سب لے لیا۔ ہم مُدّت سے تلاش میں تھے، آج اِس صورت سے نظر آیا۔ اور مجھ(۹) سے پوچھتے تھے کہ اَے ظالم! یہ کیا تیرے دل میں آیا کہ ہمارے بھائی کو مار کھپایا! کیا اُس نے تیری تَقصِیر کی تھی! اُن نے تجھ سے کیا بُرا سُلوک کیا تھا کہ اپنا مُختار بنایا تھا! پھر اِن دونوں نے اپنے گِریبان چاک کر ڈالے اور بے اِختیار جھوٹھ مُوٹھ(۱۰) بھائی کی خاطِر رُوتے تھے اور لات(۱۱) مُکّی مجھ پر کرتے تھے۔

اِس میں حاکم کے پیادے آئے، اِن کو ڈانٹا کہ کیوں مارتے ہو، اور میرا ہاتھ پکڑ کر کُوتوال کے پاس لے گئے۔ یِے(۱۲) دونوں بھی ساتھ چلے اور حاکم سے بھی یہی کہا اور بہ طَور رِشوَت کے کچھ دے کر اپنا اِنصاف چاہا اور خونِ ناحق(۱۳) کا دعویٰ کِیا۔ حاکم نے مجھ سے پوچھا۔ میری یہ حالت تھی کہ مارے بھوکھ اور مار پیٹ کے طاقت گُویائی کی نہ تھی؛ سر نیچے کیے کھڑا تھا،

کچھ مُنہ سے جواب نہ نکلا۔ حاکم کو بھی یقین ہوا کہ یہ مُقرّر خونی ہے، فرمایا کہ اِسے میدان میں لے جاکر سُولی دو۔ جہاں پناہ! میں نے رُوپئے دے کر اِن کو یہودی کی قید سے چھڑایا تھا، اُس کے عوض اِنھوں نے بھی روپئے خرچ کرکے میری جان کا قصد کیا۔ یہ[۱] دونوں حاضر ہیں، اِن سے پوچھیے[۲] کہ میں اِس میں سَرِ مُو تفاوُت کہتا ہوں؟

خیر، مجھے لے گئے۔ جب دار کو دیکھا، ہاتھ زِندگی سے دُھوئے۔ سوائے اِس کُتّے کے کوئی میرا رُونے والا نہ تھا۔ اِس کی یہ حالت تھی کہ ہر ایک آدمی کے پانو میں لوٹتا اور چِلّاتا تھا۔ کوئی لکڑی، کوئی پتھّر سے مارتا، لیکن یہ اُس جگہ سے نہ سَرَکتا۔ اور میں رُو بہ قبلہ کھڑا ہوا[۳] خُدا کو کہتا تھا کہ اِس وَقت میں تیری ذات کے سِوا میرا کوئی نہیں جو آڑے آوے اور بے گُناہ کو بچاوے۔ اب تُو ہی بچاوے تو بچتا ہوں۔ یہ کہ کر، کلمہ شہادت کا پڑھ کر تیورا کر گر پڑا۔ خُدا کی حِکمت سے اُس شہر کے بادشاہ کو قُولَنج* کی بیماری ہوئی۔ اُمَرا اور حکیم جمع ہوئے۔ جو عِلاج کرتے تھے، فائدہ[۴] مند نہ ہوتا تھا۔ ایک بُزُرگ نے کہا کہ سب سے بہتر یہ دَوا ہے کہ مُحتاجوں کو کچھ خیرات کرو اور بَندی وانوں کو آزاد کرو۔ دَوا سے دُعا میں بڑا اثر ہے۔ وُونہیں[۵] بادشاہی چیلے پنڈت خانوں کی طرف دَوڑے۔

اِتّفاقاً ایک اُس میدان میں آ نکلا۔ اِزدِحام[۶] دیکھ کر معلوم کیا کہ کِسُو کو سُولی چڑھاتے ہیں۔ یہ سُنتے ہی، گھوڑے کو دار کے نزدیک لا کر، تلوار سے طنابیں کاٹ دیں۔ حاکم کے پیادوں کو ڈانٹا اور تنبیہ کی کہ ایسے وقت میں

کہ بادشاہ کی یہ حالت ہے، تم خُدا کے بندے کو قتل کرتے ہو! اور مجھے چھُڑوا دیا۔ تب یہ دونوں بھائی پھر حاکم کے پاس گئے اور میرے قتل کے واسطے کہا۔ شحنے* نے تو رِشوت کھائی تھی؛ جو یہ[1] کہتے تھے، سُو کرتا تھا۔ کُوتوال نے اِن سے کہا کہ خاطِر جمع رکھو؛ اب مَیں اِسے ایسا قَید کرتا ہوں کہ آپ سے آپ، مارے بھوُکھوں کے بے آب و دانہ مرجاوے، کِسوُ کو خبر نہ ہووے۔ مجھے پکڑ لائے اور ایک گوشے میں رکھا۔ اُس شہر سے باہر کوس ایک پر ایک پہاڑ تھا کہ حضرت سُلیمان کے وقت میں دِیووں[2] نے ایک کُنوآں[3] تنگ و تاریک اُس میں کھُودا تھا، اُس کا نام "زِندانِ سُلیمان" کہتے تھے۔ جس پر بڑا غضبِ بادشاہی ہوتا، اُسے وہاں مَحبُوس کرتے، وُہ خود بہ خود مرجاتا۔ اَلقِصَّہ رات کو چُپکے یے دونوں بھائی اور کُوتوال کے ڈَنڈَیے[4] نے مجھے اُس پہاڑ پر لے گئے اور اُس غار میں ڈال کر، اپنی خاطِر جمع کرکے پھرے۔

اَے بادشاہ! یہ کُتا میرے ساتھ چلا گیا۔ جب مجھے کُنوئیں[5] میں گرایا، تب یہ اُس[6] کے مینڈ پر لیٹ رہا۔ مَیں اندر بے ہوش پڑا تھا۔ ذرا[7] سُرت* آئی تو مَیں[8] اپنے تئیں مُردہ خیال کیا اور اُس مکان کو گور سمجھا۔ اِس میں دُو شخصوں کی آواز کان میں پڑی کہ کچھ آپس میں باتیں کرتے ہیں؛ یہی[9] معلوم کیا کہ نکیر مُنکر[10] ہیں، مجھ سے سوال کرنے آئے ہیں۔ سُرسُراہٹ* رَسی کی سُنی، جیسے کِسوُ نے وہاں لٹکائی۔ مَیں حیرت میں تھا۔ زمین کو ٹٹولتا تو ہڈّیاں ہاتھ میں آتیں۔ بعد ایک ساعت کے آواز چَپَڑ چَپَڑ مُنہ چلانے کی میرے کان میں آئی، جیسے کوئی کچھ کھاتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اَے خُدا کے بندو! تم

کون ہو؟ خُدا کے واسطے بتاؤ! وُہ ہنسے اور بولے: یہ زِندان مہتر سُلیمان کا ہے اور ہم قیدی ہیں۔ میں نے اُن سے پوچھا: کیا میں جیتا ہوں؟ پھر کھلکھلا کر ہنسے اور کہا: اب تلک تو تو زندہ ہے، پَر اب مرے گا۔ میں نے کہا: تم جو کھاتے ہو، کیا ہو جو مجھے بھی تھوڑا سا دو! تب جُھنجلا کر* خالی جواب دیا اور کچھ نہ دیا۔ وُہ کھا پی کر سو رہے، میں مارے ضُعف و ناتوانی* کے غش* میں پڑا رُوتا تھا اور خُدا کو یاد کرتا تھا۔ قبلۂ عالَم! سات دن دریا میں اور اِتنے دن بھائیوں کے بُہتان کے سبب دانہ نہ مُیَسّر آیا۔ عَلاوَہ، کھانے کے بدلے مار پیٹ کھائی اور ایسے زِندان میں پھنسا (۳) کہ صورت رِہائی کی مُطلَق خیال میں بھی نہ آتی تھی۔

آخر جاں کَنَدنی (۴) کی نَوبت پہنچی۔ کبھو دَم آتا، کبھو نکل جاتا تھا۔ لیکن کبھو کبھو آدھی رات کو ایک شخص آتا اور رومال میں رُوٹیاں اور پانی کی صُراحی ڈوری میں باندھ کر لٹکا دیتا اور پکارتا۔ وُہ دونوں آدمی جو میرے پاس محبُوس تھے، لے لیتے اور کھاتے پیتے۔ اُوپر سے کُتّے نے ہمیشہ یہ اَحوال دیکھتے دیکھتے عقل دَوڑائی کہ جس طرح یہ شخص آب (۵) و نان کُنوئیں* میں لٹکا دیتا ہے، تو بھی ایسی فِکر کر کہ کچھ اُس بے کس کو، جو میرا خاوِند ہے، آزُوقہ پہنچے، تو اُس کا دَم بچے۔ یہ خیال کر کے شہر میں گیا۔ نان بائی کی دُکان* میں منبر پر گِرد‌ے چُنے ہوئے دھرے تھے؛ جَست مار کر ایک کُلچہ مُنہ میں لیا اور بھاگا۔ لوگ پیچھے دَوڑے۔ ڈھیلے مارتے تھے، لیکن اُس نے نان کو نہ چھوڑا۔ آدمی تھک کر پھرے۔ شہر کے کُتّے پیچھے لگے؛ اُن سے لڑتا بِھڑتا، رُوٹی کو بچائے، اُس چاہ پر آیا اور نان کو اندر ڈال دیا۔ رُوز (۶) روشن تھا؛ میں نے رُوٹی کو اپنے پاس پڑا دیکھا اور کُتّے کی آواز

سُنی، کُلچے کو اُٹھالیا۔ اور یہ کُتا روٹی پھینک کر، پانی کی تلاش میں گیا۔

کسی گانو کے کِنارے ایک بُڑھیا کی جھوپڑی تھی۔ ٹھلیا اور بدھنا پانی سے بھرا ہوا دَھرا تھا اور وُہ پیرزَن چرخا(۲) کاتتی تھی۔ کُتا کوزے کے نزدیک گیا، چاہا کہ لوٹے کو اُٹھا دے، عورت نے ڈانٹا۔ لوٹا اُس کے مُنہ سے چھوٹا، گھڑے پر گرا۔ مٹکا پھوٹا، باقی باسَن لُڑھ گئے، پانی بَہ چلا۔ بُڑھیا لکڑی لے کر مارنے کو اُٹھی۔ یہ سَگ اُس کے دامن میں لِپٹ گیا، اُس کے پانو پر مُنہ مَلنے اور دُم ہِلانے لگا اور پہاڑ کی طرف دَوڑ گیا، پھر اُس کے پاس آکر کبھو رَسّی اُٹھاتا، کبھو ڈول مُنہ میں پکڑ کر دِکھاتا اور مُنہ اُس کے قدموں پر رَگڑتا اور آنچل چادر کا پکڑ کر کھینچتا۔ خُدا نے اُس عورت کے دل میں رَحم دِیا کہ ڈول رَسّی کو لے کر اِس کے ہمراہ چلی۔ یہ اُس کا آنچل پکڑے گھر سے باہر ہو کر آگے آگے ہُو لیا۔

آخر اُس کو پہاڑی پر لے آیا۔ عورت کے جی میں کُتّے کی اِس حرکت سے اِلہام ہُوا کہ اِس کا میاں مُقرّر اِس غار میں گِرفتار(۵) ہے، شاید اُس کی خاطر پانی چاہتا ہے۔ غَرض پیرزَن کو لیے ہوئے غار کے مُنہ پر آیا۔ عورت نے لوٹا پانی کا بھر کر رَسّی سے لٹکایا۔ میں نے وُہ باسَن لے لیا، اور نان کا ٹکڑا کھایا، دو تین گھونٹ پانی پیا، اِس پیٹ کے کُتّے کو راضی کیا۔ خُدا کا شُکر کر کر ایک کنارے بیٹھا اور خُدا کی رحمت کا مُنتظِر تھا کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے۔ یہ حیوانِ(۶) بے زُبان اِسی طَور سے نان لے آتا اور بُڑھیا کے ہاتھ پانی پِلواتا۔ جب بھٹھیاروں(۷) نے دیکھا کہ کُتا ہمیشہ روٹی لے جاتا ہے؛ ترس کھا کر مُقرّر کیا کہ جب اِسے دیکھتے، ایک گِرْدا(۸) اِس کے آگے پھینک دیتے۔ اور اگر وُہ عورت

پانی نہ لاتی، تو یہ کُتّا اُس کے باسن پھوڑ ڈالتا؛ لاچار وُہ بھی ہر رُوز ایک صُراحی پانی کی دے جاتی۔ اِس رفیق نے آب[1] و نان سے میری خاطِر جمع کی اور آپ زِندان کے مُنْہ پر پڑا رہتا۔ اِس طَرح چھ[2] مہینے گزرے۔ لیکن جو آدمی ایسے زِندان میں رہے کہ دُنیا کی ہَوا اُس کو نہ لگے، اُس کا کیا حال ہو! نِرا پُوست و[3] اُستخوان مجھ میں باقی رہا، زِندگی وَبال ہوئی۔ جی میں آوے کہ یا اِلٰہی! یہ دَم نکل جاوے تو بہتر ہے۔

ایک رُوز رات کو وُہ دونوں قَیدی سوتے تھے، میرا دل اُمنڈ آیا، بے اِختیار رُونے لگا اور خُدا کی درگاہ میں نَک گھِسنی کرنے۔ پچھلے پَہر کیا دیکھتا ہوں کہ خُدا کی قُدرت سے ایک رسّی غار میں لٹکی اور آواز سَہج یہ سُنی کہ اَے کم بَخت[4] بدنصیب! ڈُور کا سِرا اپنے ہاتھ میں مضبوط باندھ اور یہاں سے نکل۔ میں نے سُن کر دل میں خیال کیا کہ آخر بھائی مجھ پر مہربان ہو کر، لُہو کے جوش سے آپ ہی نکالنے آئے۔ نہایَت خوشی سے اُس طَناب کو کمَر میں خوب کسا۔ کِسو نے مجھے اوپر کھینچا۔ رات ایسی اندھیری تھی کہ جن نے مجھے نکالا، اُس کو میں نے نہ پہچانا کہ کون ہے۔ جب مَیں باہر آیا، تب اُس نے کہا: جلد آ، یہاں کھڑے ہونے کی جگہ[5] نہیں۔ مجھ میں طاقت تُو نہ تھی، پَر مارے ڈر کے [6] لُڑھتا پُڑتا پہاڑ سے نیچے آیا۔ دیکھوں تو دُو گھوڑے زِین بندھے ہوئے کھڑے ہیں۔ اُس شخص نے ایک پر مجھے سوار کیا اور ایک پر آپ چڑھ لیا اور آگے ہُوا۔ جاتے جاتے دریا کے کِنارے پر پہنچا۔

صُبح ہو گئی۔ اُس شہر سے دس بارہ کوس نکل آئے۔ اُس جوان کو دیکھا

کہ اُونچی بنا ہوا، زِرَہ بکتر[1] پہنے، چار آئینہ باندھے، گھوڑے پر پاکھر ڈالے۔ میری طرف غَضَب کی نظروں سے گھوُر کر اور ہاتھ اپنا دانتوں سے کاٹ کر، تلوار میانؔ* سے کھینچی اور گھوڑے کو جَسْت کر کر مجھ پر چلائی۔ میں نے اپنے تئیں گھوڑے پر سے نیچے گرا دیا اور گھگھیانے لگا کہ میں بے تقصیر ہوں مجھے کیوں قتل کرتا ہے! اَے صاحبِ مُرَوَّت*! ویسے زِندان سے میرے تئیں تو نے نکالا، اب یہ بے مُرَوَّتی کیا ہے! اُس نے کہا: سچ کہہ تو کون ہے؟ میں نے جواب دیا کہ مُسافر ہوں، ناحق[2] کی بلا میں گرِفتار ہو گیا تھا، تمھارے تَصَدُّق سے بارے جیتا نکلا ہوں۔ اور بہت باتیں خوشامد کی کیں۔

خُدا نے اُس کے دل میں رَحم دیا، شمشیر کو غلاف[3] کیا اور بولا: خیر، خُدا جو چاہے سو کرے۔ جا تیری جاں بَخشی[4] کی۔ جلد سوار ہو، یہاں تَوَقُّف کا مکان نہیں۔ گھوڑوں کو جلد کیا اور چلے۔ راہ میں افسوس کھاتا اور پچتاتا[5] جاتا تھا۔ ظُہر کے وقت تک ایک جزیرے میں جا پہنچے۔ وہاں گھوڑے سے اُترا، مجھے بھی اُتارا۔ زین، خُوگیر[6] مرکبوں کی پیٹھ سے کھولا اور چرنے کو چھوڑ دیا۔ اپنی بھی کمر سے ہتھیار کھول ڈالے اور بیٹھا۔ مجھ سے بولا: اَے بدنصیب! اب اپنا اَحوال کہہ، تو معلوم ہو کہ تو کون ہے۔ میں نے اپنا نام[7] نِشان بتایا اور جو جو کچھ بپتا بیتی تھی، اُس سے آخر تک کہی۔

اُس جوان نے جب میری سَرگُذشت سب سُنی، رونے لگا اور مُخاطِب ہوا کہ اَے جوان! اب میرا ماجرا سُن۔ مَیں کَنیا[8] زیرباد[9] کے دیس کے راجا[10] کی ہوں۔ اور وہ گبرو جوان، جو زِندانِ سُلیمان میں قید ہے، اُس کا نام بہرہ مند[11]

ہے، میرے پِتا کے مَنتری کا بیٹا ہے۔ ایک رُوز مہاراج نے اَگیّا[1] دی کہ جتنے راجا اور کُنوَر ہیں، میدان میں زِیرِ جَھرُوکھے[2] نکل کر تیر اَندازی اور چوگان بازی کریں، تو گھُڑ چڑھی اور کسب ہر ایک کا ظاہر ہو۔ مَیں، رانی کے نیڑے[3]، جو میری ماتا تھیں، اٹاری پر اَوجھل میں بیٹھی تھی اور دائیاں اور سہیلیاں حاضر تھیں، تماشا دیکھتی تھی۔ یہ دیوان کا پوُت سب میں سُندر تھا اور گھوڑے کو کاوے دے کر کسب[4] کر رہا تھا؛ مجھ کو بھایا اور دل سے اُس پر ریجھی۔ مُدّت تلک یہ بات گُپت[5] رکھی۔

آخر جب بہت بیاکُل[6] ہوئی، تب دائی سے کہا اور ڈھیر سا انعام دیا۔ وہ اُس جوان کو کسو نہ کسو ڈھب سے پوشیدہ میری دھراہر[7] میں لے آئی۔ تب یہ بھی مجھے چاہنے لگا۔ بہت دن اِس عشق مُشک[8] میں کٹے۔ ایک رُوز چَوکیداروں نے آدھی رات کو ہتھیار باندھے اور محل میں آتے دیکھ کر اُسے پکڑا اور راجا سے کہا۔ اُسنے[9] حکمِ قتل کیا۔ سب اَرکانِ دَولت نے کہہ[10] سُن کر جاں بخشی کروائی۔ تب فرمایا کہ اِس کو زِندانِ سُلیمان میں ڈال دو۔ اور دوسرا جوان جو اُس کے ہم راہ اَسیر ہے، اُس کا بھگنا ہے؛ اُس رَین کو وہ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ دونوں کو اُس کنوئیں میں چھوڑ دیا۔ آج تین بَرس ہوئے کہ وِے[11] پھنسے ہیں؛ مگر کسو نے نہیں دریافت کیا کہ یہ جوان راجا کے گھر میں کیوں آیا تھا۔ بھگوان نے میری پت رکھی؛ اُس کے شکرانے کے بدلے میں نے اپنے اوپر لازم کیا کہ اَنّ[12] اور جل اُس کو پہنچایا کروں۔ جب سے اَٹھواڑے[13] میں ایک دن آتی ہوں اور آٹھ دن کا آزقہ اِکٹھا دے جاتی ہوں۔

کل کی رات سپنے میں دیکھا کہ کوئی مانس کہتا ہے کہ شتابی اُٹھ اور گھوڑا، جوڑا اور کمند اور کچھ نقد خرچ کے واسطے لے کر، اُس غار پر جا اور اُس بچارے کو وہاں سے نکال۔ یہ سن کر میں چونک پڑی اور مگن ہو کر مردانہ بھیس کیا اور ایک دُرزۂ قچہ جواہر و اشرفی سے بھر لیا اور یہ گھوڑا اور کپڑا جوڑا لے کر وہاں گئی کہ کمند سے اُسے کھینچوں۔ کرم میں تیرے تھا کہ ویسی قید سے اِس طرح چھٹکارا پاوے۔ اور میرے اِس کرتب سے محرم کوئی نہیں، شاید وہ کوئی دیوتا تھا کہ تیری مخلصی کی خاطر مجھے بھجوایا۔ خیر، جو میرے بھاگ میں تھا، سو ہُوا۔ یہ کہتا کہ کر: پوری، کچوری[۲]، ماس کا سالن اُنگوچھے سے کھولا۔ پہلے قند نکال ایک کٹورے میں گھولا اور عرق بید مشک کا اُس میں ڈال کر مجھے دیا۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے لے کر پیا۔ پھر تھوڑا سا ناشتا کیا۔ بعد ایک ساعت کے، میرے تئیں لنگی بندھوا کر دریا میں لے گئی۔ قینچی[۳] سے میرے سر کے بال کترے، ناخن لیے، نہلا دھلا کر کپڑے پہنائے، نئے سر[۴] سے آدمی بنایا۔ میں دوگانہ[۵] شکرانے کا روبہ قبلہ ہو کر پڑھنے لگا۔ وہ نازنیں اِس میری حرکت کو دیکھتی رہی۔

جب نماز سے فارغ ہوا، پوچھنے لگی کہ یہ تو نے کیا کام کیا؟ میں نے کہا: جس خالق نے ساری خلقت کو پیدا کیا اور تجھ سی محبوبہ سے میری خدمت کروائی اور تیرے دل کو مجھ پر مہربان کیا اور ویسے زندان سے خلاص کروایا؛ اُس کی ذات لاشریک ہے، اُس کی میں نے عبادت کی اور بندگی بجالایا اور ادائے[۶] شکر کیا۔ یہ بات سن کر کہنے لگی: تم مسلمان ہو؟ میں نے کہا:

شُکر، اَلحَمدُ لِلّٰہ! بولی: میرا دل تمھاری باتوں سے خوش ہوا، میرے تئیں بھی سکھاؤ اور کلمہ پڑھاؤ۔ میں نے دل میں کہا: اَلحَمدُ لِلّٰہ! کہ یہ ہمارے دین کی شریک ہوئی۔ غرض میں نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ پڑھا اور اُس سے پڑھوایا۔ پھر وہاں سے گھوڑوں پر سوار ہو کر، ہم دونوں چلے۔ رات کو اُترتے، تو وہ ذِکر دین ایمان کا کرتی اور سُنتی اور خوش ہوتی۔ اِسی طرح دو مہینے تلک بہم شبانہ روز چلے گئے۔

آخر ایک وِلایت میں پہنچے کہ درمیان سرحد[1] مُلک زیر باد اور سراندیپ کے تھی۔ ایک شہر نظر آیا کہ آبادی میں اِستنبول سے بڑا، اور آب و ہوا بہت خوش اور موافق۔ بادشاہ اُس شہر کا کسریٰ سے زیادہ عادل اور رعیت پرور۔ دیکھ کر دل بہت شاد ہوا۔ ایک حویلی خرید کر کے بود باش مقرر کی۔ جب کئی دن میں رنج سفر سے آسودہ ہوئے؛ کچھ اسباب ضروری درست کر کے، اُس بی بی سے موافق شرع[3] محمدی کے نکاح کیا اور رہنے لگا۔ تین سال میں وہاں کے اکابر و اصاغر سے مِل جُل کر اِعتبار بہم پہنچایا اور تجارت کا ٹھاٹھ پھیلایا۔ آخر وہاں کے سب سوداگروں سے سبقت لے گیا۔

ایک روز وزیر اعظم کی خدمت میں سلام کے لیے چلا۔ ایک میدان میں کثرت خلق اللہ کی دیکھی۔ کسو سے پوچھا کہ کیوں اِتنا اِزدِحام ہے؟ معلوم ہوا کہ دو شخصوں کو زِنا اور چوری کرتے پکڑا ہے، اور شاید خون بھی کیا ہے؛ اُن کو سنگ[5] سار کرنے کو لائے ہیں۔ مجھے، سُنتے ہی، اپنا احوال یاد آیا کہ ایک دن مجھے بھی اِسی طرح سولی چڑھانے لے گئے تھے، خدا نے

بچا لیا۔ آیا یہ کون ہیں گے کہ ایسی بلا میں گرفتار ہوئے ہیں! معلوم نہیں کہ راست ہے، یا میری طرح تہمت میں گرفتار ہوئے ہیں! بھیڑ کو چیر کر اندر گھسا۔ دیکھا تو یہی میرے دونوں بھائی ہیں کہ ٹنڈیاں کسے، سر و پا برہنہ اِن کو لیے جاتے ہیں۔ اِن کی صورت دیکھتے ہی خون نے جوش کیا اور کلیجا جلا۔ محصِلوں کو ایک مٹھی اشرفیاں دیں اور کہا کہ ایک ساعت توقف کرو، اور وہاں سے گھوڑے کو سرپٹ پھینک کر حاکم کے گھر گیا۔ ایک دانہ یاقوتِ بے بہا کا نذر گزرانا اور اِن کی شفاعت کی۔ حاکم نے کہا: ایک شخص اِن کا مدعی ہے اور اِن کے گناہ ثابت ہوئے ہیں اور بادشاہ کا حکم ہو چکا ہے، میں لاچار ہوں۔

بارے بہت منت و زاری سے، حاکم نے مدعی کو بلوا کر پانچ ہزار روپے پر راضی کیا کہ وہ دعویٰ خون کا معاف کرے۔ میں نے روپے گن دیے اور لادعویٰ لکھوا لیا اور ایسی بلا سے مخلصی دلوائی۔ جہاں پناہ! اِن سے پوچھیے کہ سچ کہتا ہوں یا جھوٹ بکتا ہوں۔ وے دونوں بھائی سر نیچے کیے شرمندہ سے کھڑے تھے۔ خیر، اِن کو چھڑوا کر گھر میں لایا، حمام کروا کر لباس پہنوایا۔ دیوان خانے میں مکان رہنے کو دیا۔ اِس مرتبے اپنے قبیلے کو اِن کے رُو بہ رُو نہ کیا۔ اِن کی خدمت میں حاضر رہتا اور اِن کے ساتھ کھانا کھاتا، سونے کے وقت گھر میں جاتا۔ تین برس تک اِن کی خاطر داری میں گزری اور اِن سے بھی کوئی حرکتِ بد واقع نہ ہوئی کہ باعث رنجیدگی کا ہووے۔ جو میں سوار ہو کر کہیں جاتا، تو یے گھر میں رہتے۔

اِتفاقاً وہ بی بی نیک بخت ایک دن حمام کو گئی تھی؛ جب دیوان خانے

میں آئی، کوئی مرد نظر نہ پڑا، اُس نے بُرقع اُتارا۔ شاید یہ منجھلا بھائی لیٹا ہوا جاگتا تھا، دیکھتے ہی عاشق ہوا۔ بڑے بھائی سے کہا۔ دونوں نے میرے مار ڈالنے کی باہم صلاح کی۔ مَیں اِس حرکت سے مُطلق خبر نہ رکھتا تھا، بلکہ دل میں کہتا تھا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! اِس مرتبے اب تک اِنھوں نے کچھ ایسی بات نہیں کی، اب اِن کی وضع دُرست ہوئی، شاید غیرت کو کام فرمایا۔ ایک رُوز بعد کھانے کے بڑے بھائی صاحب آب دیدہ ہوئے اور اپنے وَطَن کی تعریف اور ایران کی خوبیاں بیان کرنے لگے۔ یہ سُن کر دوسرے بھی بسُورنے لگے۔ میں نے کہا: اگر اِرادہ وَطَن کا ہے تو بہتر، مَیں تابع مرضی کے ہوں، میری بھی یہی آرزو ہے، اب اِنشاءَ اللہ تعالیٰ مَیں بھی آپ کی رِکاب میں چلتا ہوں۔ اُس بی بی سے دونوں بھائیوں کی اُداسی کا مَذکُور کیا اور اپنا اِرادہ بھی کہا۔ وُہ عاقلہ بُولی کہ تم جانو؛ لیکن پھر کچھ دغا کیا چاہتے ہیں، یہ تمھاری جان کے دُشمن ہیں، تم نے سانپ آستین میں پالے ہیں اور اِن کی دوستی کا بھروسا رکھتے ہو۔ جو جی چاہے سُو کرو، لیکن موذیوں سے خبردار رہو۔ بہ ہر تقدیر، تھوڑے عرصے میں تیاری سفر کی کر کے خیمہ میدان میں اِستاد کیا۔ بڑا قافلہ جمع ہوا اور میری سرداری اور قافلہ باشی پر راضی ہوئے۔ اچھی ساعت دیکھ کر روانہ ہوا لیکن اِن کی طرف سے اپنی جانب میں ہُوشیار رہتا، اَور سب صورت سے فرماں بَرداری اور دِل جُوئی اِن کی کرتا۔

ایک رُوز ایک منزل میں منجھلے بھائی نے مَذکُور کیا کہ ایک فرسخ اِس مکان سے ایک چشمہ جاری ہے مانند سلسبیل کے، اور میدان میں

خودِ رُو کوسوں تلک لالہ و نافرمان اور نرگس وگُلاب پھوُلا ہے۔ واقعی عجب مکان سَیر کا ہے؛ اگر اپنا اِختیار ہوتا، تو کل وہاں جا کر تفریحِ طبیعت کی کرتے اور ماندگی[1] بھی رَفع ہوتی۔ مَیں بُولا کہ صاحب مُختار ہیں؛ فرماؤ تو کل کے دِن مُقام کریں اور وہاں چل کر سَیر کرتے پھریں۔ تَبّے بُولے: اَزیں چہ بہتر! میں نے حُکم کیا کہ سارے قافلے میں پُکار دو کہ کل مُقام ہے۔ اور بَکاوَل کو کہا کہ حاضِری قِسم بہ قِسم کی تیّار کر، کل سَیر کو چلیں گے۔ جب صُبح ہوئی، اِن دونوں برادروں نے کپڑے پہن، کمر باندھ کر مجھے یاد دِلایا کہ جلد ٹھنڈے ٹھنڈے چلیے اور سَیر کیجیے۔ میں نے سواری مانگی۔ بُولے کہ پا پیادہ جو لُطف سَیر کا ہوتا ہے، سُو سواری میں معلوم! نَفَرُوں کو کہہ دو: گھوڑے ڈُریا[3] کر لے آویں۔

*

دونوں غُلاموں نے قَلیان اور قہوہ دان لے لیا اور ساتھ ہوئے۔ راہ میں تیر اَندازی کرتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ جب قافلے سے دُور نکل گئے، ایک غُلام کو اِنھوں نے کسی کام کو بھیجا۔ تھوڑی دُور آگے بڑھ کر دوسرے کو بھی اُس کے بُلانے کو رُخصت کیا۔ کم بَختی جو آئی، میرے مُنہ میں جیسے کِسُو نے مُہر دے دی۔ جو وُہ چاہتے تھے، سُو کرتے تھے اور مجھے باتوں میں پَرچائے لیے جاتے تھے؛ مگر یہ کُتّا ساتھ رہ گیا۔

بہت دُور نکل گئے، نہ چشمہ نظر آیا نہ گُلزار؛ مگر ایک مَیدانِ پُرخار تھا۔ وہاں مجھے پیشاب لگا۔ مَیں بَول کرنے کو بیٹھا۔ اپنے پیچھے چمک تلوار کی سی دیکھی۔ مُڑ کر دیکھوں، تو مَنجھلے بھائی صاحب نے مجھ پر تلوار ماری کہ سر دو پارہ[4] ہو گیا۔

جب تلک بولوں کہ اَے ظالم! مجھے کیئوں مارتا ہے، بڑے بھائی نے شانے پر لگائی۔ دونوں زَخم کاری لگے، تیوُرا کر گرا؛ تب اِن دونوں بے رَحموں نے بہ خاطِر جمع[1] میرے تئیں چوُر زخمی کیا اور لہُو لہُان کر دیا۔ یہ کُتّا میرا اَحوال دیکھ کر اِن پر بھَونکا، اِس کو بھی گھائل کیا۔ بعد اُس کے اپنے ہاتھوں سے اپنے بَدنوں میں زخموں کے نشان کیے اور سَر و پا بَرہَنَہ قافلے میں گئے اور ظاہِر کیا کہ حَرامیوں نے اُس میدان میں ہمارے بھائی کو شَہید کیا اور ہم بھی لَڑ بھِڑ کر زخمی ہوئے، جلدی کوُچ کرو؛ نہیں تو اب کارْواں پر گِر کر سب کو ننگیالیں[2] گے۔ قافلے کے لوگوں نے بَدوؤں کا نام جو سُنا، وُے نہیں بَدحَواس ہوئے اور گھبرا کر کوُچ کیا اور چل نکلے۔

میرے قَبیلے نے سُلوک اور خوبیاں اِن کی سُن رکھیں تھیں، جو جو مجھ سے دَغائیں کیں تھیں؛ یہ وارِدات اِن کا ذِبوں سے سُن کر، جلد خنجر سے اپنے تئیں ہَلاک کیا اور جاں بہ حَق تَسلیم ہوئی۔ اَے دَرویشو! اُس خواجۂ سَگ پَرَسْت نے جب اپنی کیفیت اور مُصیبت اِس طَرح سے یہاں تلک کہی، سُنتے ہی مجھے بے اِختِیار رُونا آیا۔ وُہ سَوداگر دیکھ کر کہنے لگا کہ قِبلۂ عالَم! اگر بے اَدَبی نہ ہوتی، تو بَرہَنَہ ہو کر، مَیں اپنا سارا بدن کھول کر دِکھاتا۔ تِس پر بھی، اپنی راسْتی پر، گِریبان مونڈھے تلک چیر کر دِکھایا۔ واقعی چار اُنگل[6] تن اُس کا بَغیر زَخم کے ثابِت نہ تھا۔ میرے حُضور سر سے عَمّامہ[7] اُتارا۔ کھوپَری[8] میں ایسا بڑا گڑھا[9] پڑا تھا کہ ایک اَنار سموُچا اُس میں سَما وِے۔ اَرْکانِ دَولت جتنے حاضِر تھے، سب نے اپنی آنکھیں

بند کرلیں، طاقت دیکھنے کی نہ رہی۔

پھر خواجہ بُولا کہ بادشاہ سلامت! جب بے بھائی اپنی دانست میں میرا کام تمام کرکے چلے گئے، ایک طرف مَیں اور ایک طرف یہ سَگ میرے نزدیک زخمی پڑا تھا۔ لُہو اِتنا بدن سے گیا کہ مُطلق طاقت اور ہوش کچھ باقی نہ تھا۔ کیا جانوں دَم کہاں اَٹک رہا تھا کہ جیتا تھا۔ جس جگہ مَیں پڑا تھا، وِلایتِ سَراندیپ کی سَرحَد تھی اور ایک شہر بہت آباد اُس کے قریب تھا۔ اُس شہر میں بڑا بُت خانہ تھا اور وہاں کے بادشاہ کی ایک بیٹی تھی نہایت قُبول صورت اور صاحبِ جمال۔ اکثر بادشاہ اور شہ زادے اُس کے عشق میں خراب تھے۔ وہاں رَسمِ حِجاب کی نہ تھی، اِس سے وُہ لڑکی تمام دن ہمجولیوں کے ساتھ سَیرِ شِکار کرتی پھرتی۔ ہم سے نزدیک ایک بادشاہی باغ تھا۔ اُس رُوز بادشاہ سے اِجازت لے کر اُسی باغ میں آئی تھی۔ سَیر کی خاطِر اُس میدان میں پھرتی پھرتی آنکلی۔ کئی خَواصِیں بھی ساتھ سوار تھیں۔ جہاں مَیں پڑا تھا، آئیں۔ میرا کَراہنا سُن کر پاس کھڑی ہوئیں۔ مجھے اُس حالت میں دیکھ کر وِے بھاگیں اور شہ زادی سے کہا کہ ایک مَردُوا اور ایک کُتّا لہو میں شُور بُور پڑا ہے۔ اُن سے یہ سُن کر آپ مَلِکہ میرے سر پر آئی، افسوس کھا کر کہا: دیکھو تو کچھ جان باقی ہے؟ دو چار دائیوں نے اُتر کر دیکھا اور عَرض کی: اب تلک تو جیتا ہے۔ تُرَت فرمایا کہ اَمانت، قالیچے پر لِٹا کر، باغ میں لے چلو۔

وہاں لے جا کر، جَرّاح سرکار کا بُلا کر، میرے اور میرے کُتّے کے علاج کی خاطِر بہت تاکید کی اور اُمیدوارِ اِنعام و بَخشِش کا کیا۔ اُس حَجّام نے سارا

بدن میرا پُونچھ پانچھ کر خاک (۱) زخموں سے پاک کیا اور شراب سے دُھو دھا کر، زخموں کو ٹانکے دے کر مرہم لگایا۔ اور بیدِ مُشک کا عَرَق، پانی کے بدلے، میرے حَلْق (۲) میں چُوایا۔ مَلِکہ آپ میرے سرہانے بیٹھی رہتی اور میری خدمت کرواتی اور تمام دن رات میں دُو چار بار کچھ شُوربا (۳) یا شربت اپنے ہاتھ سے پلاتی۔

بارے مجھے ہُوش آیا تو دیکھا کہ مَلِکہ نہایَت افسوس سے کہتی ہے: کس ظالِم (۴) خوں خوار نے تجھ پر یہ ستم کیا! بڑے بُت سے بھی نہ ڈرا! بعد دس رُوز کے عَرَق اور شربت اور معجونوں کی قُوّت سے میں نے آنکھ کھولی۔ دیکھا تو اِنْدَر کا اَکھاڑا میرے آس پاس جمع ہے اور مَلِکہ سرہانے کھڑی ہے۔ ایک آہ بھری اور چاہا کہ کچھ حرکت کروں، طاقت نہ پائی۔ بادشاہ زادی مِہربانی سے بُولی کہ اَے عَجمی (۵)! خاطِر جمع رکھ، کُڑھ مت؛ اگرچہ کِسُو ظالم نے تیرا یہ اَحوال کیا، لیکن بڑے بُت نے مجھ کو تجھ پر مِہربان کیا ہے، اب چنگا ہو جاوے گا۔ قسم اُس خُدا کی جو واحِد اور لاشریک ہے، میں اُسے دیکھ کر پھر بے ہُوش ہو گیا۔ مَلِکہ نے بھی دریافت کیا اور گُلاب پاش سے گُلاب اپنے ہاتھ سے چھِڑکا۔ بیس دن کے عرصے میں زَخْم بھر آئے اور اَنگور کر لائے۔ مَلِکہ ہمیشہ رات کو، جب سب سُو جاتے، میرے پاس آتی اور کھلا پِلا جاتی۔

غَرَض ایک چِلّے میں غُسْل کیا۔ بادشاہ زادی نہایَت خوش ہوئی، حَجّام کو اِنعام بہت سا دیا اور مجھ کو پُوشاک پہنوائی (۶)۔ خُدا کے فَضْل سے اور خبرگیری اور سَعْی سے مَلِکہ کی خوب چاق چَوبَند ہوا اور بدن نہایَت تیّار ہوا اور کُتّا

بھی فَرِبہ[1] ہوگیا۔ رُوز مجھے شراب پِلاتی اور باتیں سُنتی اور خوش ہوتی۔ میں بھی ایک آدھ نَقل یا کہانی اَنوٹھی کہ کر* اُس کے دل کو بہلاتا۔

ایک دن پوچھنے لگی کہ اپنا اَحوال تُو بیان کرو کہ تم کون ہو اور یہ وارِدات تم پر کیُوں کر ہوئی۔ میں نے سارا ماجرا اپنا اَوّل سے آخر تک کہ سُنایا۔ سُن کر رُونے لگی اور بُولی کہ اب مَیں تجھ سے ایسا سُلوک کروں گی کہ اپنی ساری مُصیبت بھول جاوِے گا۔ میں نے کہا: خُدا تمھیں سلامت رکھے، تم نے نئے سر[2] سے میری جان بخشی کی ہے، اب مَیں تمھارا ہو رہا ہوں؛ واسطے خُدا کے اِسی طَرح ہمیشہ مجھ پر اپنی مہربانی کی نظر رکھیو۔ غَرض تمام رات اکیلی میرے پاس بیٹھی رہتی اور صُحبت رکھتی۔ بعضے دن دائی اُس کی بھی ساتھ رہتی۔ ہر[3] ایک طَور کا ذِکر مَذکور سُنتی اور کہتی۔ جب مَلِکہ اُٹھ جاتی اور مَیں تنہا ہوتا؛ طَہارَت[4] کر، کُونے میں چھپ کر نَماز[5] پڑھ لیتا۔

ایک بار ایسا اِتّفاق ہوا کہ مَلِکہ اپنے باپ کے پاس گئی تھی، مَیں خاطِر جمع سے وُضو کر کے[6] نَماز پڑھ رہا تھا کہ[7] اَچانک شہ زادی، دائی سے بُولتی ہوئی آئی کہ دیکھیں عَجمی اِس وقت کیا کرتا ہے، سُوتا ہے یا جاگتا ہے۔ مجھے مکان پر جو[8] نہ دیکھا، تعجّب میں ہوئی کہ اَیں، یہ کہاں گیا ہے! کِسُو سے کچھ[9] لَگّا تو نہیں لگایا! کُونا کُتھرا* دیکھنے لگی اور تلاش کرنے لگی۔ آخر جہاں مَیں نَماز کر رہا تھا، وہاں آ نکلی۔ اُس لڑکی نے کبھو نَماز کاہے کو دیکھی تھی، ہَچَکی کھڑی دیکھا کی۔ جب میں نے نماز تمام کر کے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور سجدے* میں گیا، بے اِختیار کھِلکھِلا کر ہنسی اور بُولی: کیا یہ آدمی

سَودائی ہوگیا! یہ کیسی کیسی حرکتیں کر رہا ہے!

مَیں ہنسنے کی آواز سُن کر دل میں ڈرا۔ مَلِکہ آگے آکر پوچھنے لگی کہ اَے عَجَمی! یہ تو کیا کرتا تھا؟ مَیں کچھ جواب نہ دے سکا، اِس میں دائی بولی: بَلا لُوں، تیرے صَدقے گئی، مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مُسَلمان ہے اور لاتؔ مَناتؔ کا دشمن ہے، اَن دیکھے خُدا کو پوجتا ہے۔ مَلِکہ نے یہ سُنتے ہی ہاتھ ہاتھ پر مارا، بہت غُصّے ہوئی کہ مَیں کیا جانتی تھی کہ یہ تُرک ہے اور ہمارے خُداؤں سے مُنکِر ہے! تبھی ہمارے بُت کے غَضَب میں پڑا تھا! میں نے ناحق اِس کی پَرَوَرِش کی اور اپنے گھر میں رکھا! یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ مَیں سُنتے ہی بَدحَواس ہوا کہ دیکھیے اب کیا سُلوک کرے! مارے خَوف کے نیند اُچاٹ ہوگئی۔ صُبح تک بے اِختیار رُویا کیا اور آنسوؤں سے مُنہ دُھویا کیا۔

تین دن رات اِسی خَوف و رِجا میں رُوتے گزر گئے، ہرگز آنکھ نہ جھپکی۔ تیسری شَب مَلِکہ شراب کے نشے میں مَخمور اور دائی ساتھ لیے(۴) میرے مکان پر آئی۔ غُصّے میں بھری ہوئی اور تیر کمان ہاتھ میں لیے، باہر چمن کے کنارے بیٹھی۔ دائی سے پِیالہ شراب کا مانگا۔ پی کر کہا: دَیا! وُہ عَجَمی جو ہمارے بڑے بُت کے قَہر میں گرِفتار ہے، مُوا، یا اب تک جیتا ہے؟ دائی نے کہا: بَلَیّا(۵) لُوں، کچھ دَم باقی ہے۔ بُولی کہ اب وُہ ہماری نظروں سے گرا، لیکن کہہ کہ(۶) باہر آوے۔ دائی نے مجھے پُکارا۔ مَیں دَوڑا۔ دیکھوں تو مَلِکہ کا چہرہ مارے غُصّے کے تمتما رہا ہے اور سُرخ ہوگیا ہے؛ روح قالب میں نہ رہی، سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا۔ غَضَب کی نگاہ سے مجھے دیکھ کر دائی سے

بولی، اگر میں [۱] اِس دِین کے دُشمن کو تیر سے ماروں، تو میری خطا بڑا بُت مُعاف کرے گا یا نہیں؟ یہ مجھ سے بڑا گُناہ ہوا ہے کہ میں نے اِسے اپنے گھر میں رکھ کر خاطِر داری کی۔

دائی نے کہا: بادشاہ زادی کی کیا تقصیر ہے! کچھ دُشمن جان کر نہیں رکھا، تم نے اِس پر ترس کھایا؛ تم کو نیکی [۲] کے عِوَض نیکی مِلے گی اور یہ اپنی بدی کا ثمرہ [۳] بڑے بُت سے پا رہے گا۔ یہ سُن کر کہا: دائی! اِسے بیٹھنے کو کہہ۔ دائی نے مجھے اِشارت کی کہ بیٹھ جا۔ مَیں بیٹھ گیا۔ مَلکہ نے اَور جام شراب کا پِیا اور دائی سے کہا کہ اِس کم بخت کو بھی ایک پیالہ [۳] دے تو آسانی سے مارا جاوے۔ دائی نے جام دِیا۔ میں نے بے عُذر پیا اور سلام کیا۔ ہرگز میری طرف نگاہ نہ کی، مگر کَن اَنکھیوں [۴] سے چوری چوری دیکھتی تھی۔ جب مجھے سُرور ہوا، کچھ شعر پڑھنے لگا، اَزاں جُملہ ایک بَیت یہ بھی پڑھی:

قابو میں ہوں مَیں تیرے، گو اَب جیا، تو پھر کیا!
خنجر تلے کسُو نے ٹک دَم لِیا، تو پھر کیا! [۵]

سُن کر مُسکرائی اور دائی کی طرف دیکھ کر بولی: کیا تجھے نیند آتی ہے؟ دائی نے مرضی پا کر کہا کہ ہاں مجھ پر خواب نے غَلَبہ کیا ہے۔ وہ تو رُخصت ہو کر جہنّم واصِل ہوئی۔ بعد ایک دَم کے مَلکہ نے پیالہ مجھ سے مانگا۔ مَیں جلد بھر کر رُو بہ رُو لے گیا۔ ایک اَدا سے میرے ہاتھ سے لے کر پی لیا، تب مَیں قدموں پر گرا۔ مَلکہ نے ہاتھ مجھ پر جھاڑا اور کہنے لگی: اَے جاہِل! ہمارے بڑے بُت میں کیا بُرائی دیکھی جو غائب خُدا کی پرستِش کرنے لگا؟ میں نے کہا: اِنصاف

شرط ہے، ٹک غور فرمائیے کہ بندگی کے لائق وہ خُدا ہے کہ جس نے ایک قطرے پانی سے تم سار کا محبوب پیدا کیا اور یہ حُسن و جمال دیا کہ ایک آن میں ہزاروں انسان کے دل کو دیوانہ کر ڈالو۔ بُت کیا چیز ہے کہ کوئی اُس کی پوجا کرے! ایک پتھر کو سنگ تراشوں نے گڑھ کر[1] صورت بنائی اور دام اَحمقوں کے واسطے بچھایا۔ جن کو شیطان نے ورغلاتا ہے[2]، وے مصنوع کو صانع جانتے ہیں۔ جسے اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں، اُس کے آگے سر جُھکاتے ہیں۔ اور ہم مُسلمان ہیں؛ جس نے ہمیں بنایا ہے، ہم اُسے مانتے ہیں۔ اُن کے واسطے دوزخ، ہمارے لیے بہشت بنایا ہے۔ اگر بادشاہ زادی ایمان خُدا پر لاوے، تب اُس کا مزا[3] پاوے اور حق و باطل میں فرق کرے اور اپنے اعتقاد کو غلط سمجھے۔

بارے ایسی ایسی نصیحتیں سُن کر اُس سنگ دِل کا دِل مُلائم ہوا، خُدا کے فضل و کرم سے رُونے لگی اور بُولی: اچھّا مجھے بھی اپنا دین سکھاؤ۔ میں نے کلمہ تلقین کیا۔ اُن نے بہ صِدقِ دل پڑھا اور توبہ اِستغفار کر کر مُسلمان ہوئی۔ تب میں اُس کے پانو پڑا۔ صُبح تک کلمہ پڑھتی اور اِستغفار کرتی رہی، پھر کہنے لگی: بھلا میں نے تو تمھارا دین قبول کیا؛ لیکن ماباپ کافر ہیں، اُن کا کیا علاج؟ میں نے کہا: تمھاری بَلا سے! جو جیسا کرے گا، ویسا پاوے گا۔ بُولی کہ مجھے چچا کے بیٹے سے منسوب کیا ہے اور وہ بُت پرست ہے؛ کل کو خُدا نہ خواستہ بیاہ ہو اور وہ کافر مجھ سے ملے اور اُس کا نُطفہ میرے پیٹ میں ٹھہر جاوے، تو بڑی قباحت ہے۔ اِس کی فکر ابھی سے

کیا[۱] چاہیے کہ اِس بَلا سے نجات پاؤں[۲]۔ میں نے کہا: تم بات تو معقول کہتی ہو؛ جو مزاج میں آوے، سو کرو۔ بولی کہ مَیں اب یہاں نہ رہوں گی، کہیں نکل جاؤں گی۔ میں نے پوچھا: کس صورت سے بھاگنے پاؤ گی اور کہاں جاؤ گی؟ جواب دیا کہ پہلے تم میرے پاس سے جاؤ، مُسلمانوں کے ساتھ سَرا میں جا رہو، تو سب آدمی سُنیں اور تم پر گُمان نہ لے جاویں۔ تم وہاں کشتیوں کی تلاش میں رہو۔ جو جہاز عَجَم کی طرف چلے، مجھے خبر کیجو۔ مَیں اِس واسطے دائی کو تمھارے پاس اکثر بھیجا کروں گی۔ جب تم کہلا بھیجو گے، مَیں[۳] نکل کر آؤں گی اور کِشتی پر سوار ہو کر چلی جاؤں گی؛ اِن کم بَخت بے دینوں کے ہاتھ سے مَخلصی پاؤں گی۔

میں نے کہا: تمھارے[۴] جان و ایمان کے قُربان ہوا، دائی کو کیا کرو گی؟ بولی: اُس کی فِکر سَہل ہے، ایک پیالے میں زہرِ ہَلاہِل پِلا دوں گی۔ یہی صَلاح مُقرّر ہوئی۔ جب دن ہوا، مَیں کاروان سَرا میں گیا۔ ایک حُجرہ کرایے لیا اور جا رہا۔ اُس جُدائی میں فَقط وَصل کی تَوَقُّع پر جیتا تھا۔ جب دو مہینے میں[۵] سوداگر رُوم و شام و اِصفِہان[۶] کے جمع ہوئے، اِرادہ کوچ کا تَری کی راہ سے کیا اور اپنا اَسباب جہاز پر چڑھانے لگے۔ ایک جگہ رہنے سے اکثر آشنا صورت ہو گئے تھے، مجھ سے کہنے لگے: کیوں صاحب! تم بھی چلو نہ! یہاں کُفرِستان میں کب تلک رہو گے! میں نے جواب دیا کہ میرے پاس کیا ہے جو اپنے وَطَن کو جاؤں! یہی ایک لونڈی، ایک کُتّا، ایک صندوق[۷] بِساط میں رکھتا ہوں؛ اگر تھوڑی سی جگہ بیٹھ رہنے کو دو اور اُس کا نَول مُقرّر کرو، تو میری خاطِر جمع ہو، مَیں بھی سوار ہوؤں۔

سَوداگروں نے ایک کوٹھری میرے تخت میں کردی۔ میں نے اُس کے
نَول کا روپیہ[1] بھر دیا۔ دِل جَمعی کرکر، کسوُ بہانے سے دائی کے گھر گیا اور کہا: اَے
اَمّاں! تجھ سے رُخصت ہونے آیا ہوں، اب وَطَن کو جاتا ہوں؛ اگر تیری تَوَجُّہ
سے ایک نظر مَلِکہ کو دیکھ لوں، تو بڑی بات ہے۔ بارے دائی نے قبول کیا۔
میں نے کہا: مَیں رات کو آؤں گا، فُلانے مکان پر کھڑا رہوں گا۔ بولی: اچھا۔
مَیں کہہ کر سَرا میں آیا۔ صندوق اور بِچھونے اُٹھا کر جہاز میں لایا اور ناخُدا کو سونپ
کر کہا: کل فَجر کو اپنی کنیز کو لے کر آؤں گا۔ ناخُدا بولا: جلد آئیو، صُبح ہم لنگر
اُٹھاوِیں گے۔ میں نے کہا: بہت خوب۔ جب رات ہوئی، اُسی مکان پر،
جہاں دائی سے وعدہ کیا تھا، جا کر کھڑا رہا۔ پہر رات گئے مَحَل کا دروازہ
کُھلا اور مَلِکہ مَیلے کُچَیلے کپڑے پہنے، ایک پِیٹی جواہر کی لیے باہر نکلی۔ وُہ
پِٹاری میرے حوالے کی اور ساتھ چلی۔ صُبح ہوتے کِنارے دریا کے ہم پہنچے۔
ایک لَنبوٹ[2] پر سوار ہو کر جہاز میں جا اُترے۔ یہ وفادار کُتّا بھی ساتھ تھا۔
جب صُبح خوب روشن ہوئی، لنگر اُٹھایا اور روانہ ہوئے۔ بہ خاطرِ جمع چلے جاتے
تھے، ایک بَندَر سے آواز توپوں کی شِلَّک* کی آئی۔ سب حیران اور فِکرمند
ہوئے۔ جہاز کو لنگر کیا اور آپس میں چرچا ہونے لگا کہ کیا شاہِ بَندَر کچھ دَغا کرے
گا! توپ چھوڑنے کا کیا سبب ہے!

اِتّفاقاً سب سَوداگروں کے پاس خوب صورت لَونڈیاں تھیں۔ شاہِ بَندَر
کے خوف سے، کہ مَبادا چھین لے، سب نے کنیزکوں کو صندوقوں میں بند کیا۔ میں
نے بھی ایسا ہی کیا کہ اپنی شہ زادی کو صندوق میں بٹھا کر قُفل کر دیا۔ اِس عرصے

میں شاہِ بندر ایک غُراب پر بہ مع نوکر چاکر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ آتے آتے جہاز پر آچڑھا۔ شاید اُس کے آنے کا یہ سبب تھا کہ بادشاہ کو دائی کے مرنے کی اور مَلِکہ کے غائب ہونے کی جب خبر معلوم ہوئی؛ مارے غیرت کے اُس کا تو نام نہ لیا، مگر شاہِ بندر کو حُکم کیا کہ میں نے سُنا ہے عَجَمی سوداگروں کے پاس لونڈیاں خوب خوب ہیں، سو مَیں شہ زادی کے واسطے لیا چاہتا ہوں۔ تم اُن کو روک کر، جتنی لونڈیاں جہاز میں ہوں، حُضور میں حاضر کروگے۔ اُنھیں دیکھ کر، جو پسند آویں گی، اُن کی قیمت دی جائے گی، نہیں تو واپس ہوں گی۔

بہ مُوجِب حُکمِ بادشاہ کے یہ شاہِ بندر اِس لیے آپ جہاز پر آیا۔ اور میرے نزدیک ایک اَور شخص تھا، اُس کے پاس بھی ایک باندی قُبول صورت صندوق میں بند تھی؛ شاہِ بندر اُسی صندوق پر آکر بیٹھا اور لونڈیوں کو نکلوانے لگا۔ میں نے خُدا کا شُکر کیا کہ بھلا بادشاہ زادی کا مذکور نہیں۔ غَرَض جتنی لونڈیاں پائیں، شاہِ بندر کے آدمیوں نے ناو[۲] پر چڑھائیں۔ اور خود شاہِ بندر جس صندوق پر بیٹھا تھا، اُس کے مالک سے بھی ہنستے ہنستے پوچھا کہ تیرے پاس بھی تو لونڈی تھی؟ اُس اَحمَق نے کہا: آپ کے قدموں کی سوگند میں[۳] نے ہی یہ کام نہیں کیا، سبھوں نے تمھارے ڈر سے لونڈیاں صندوقوں میں چھپائیں ہیں۔ شاہِ بندر نے یہ بات سُن کر سب صندوقوں کا جھاڑا لینا شُروع کیا۔ میرا بھی صندوق کھولا اور مَلِکہ کو نکال کر سب کے ساتھ لے گیا۔ عجب طَرح کی مایوسی ہوئی کہ یہ ایسی حرکت پیش آئی کہ تیری جان تو مُفت گئی اور مَلِکہ سے دیکھیے کیا سُلوک کرے! اُس کی فِکر میں اپنی بھی جان کا ڈر بھول گیا۔ سارے

دن رات خدا سے دعا مانگتا رہا۔ جب بڑی فجر ہوئی، سب لونڈیوں کو کشتی پر سوار کر کے لائے۔ سوداگر خوش ہوئے، اپنی اپنی کنیزکیں لیں۔ سب آئیاں، مگر ایک ملکہ اُن میں نہ تھی۔ میں نے پوچھا کہ میری لونڈی نہیں آئی، اِس کا کیا سبب ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم واقف نہیں، شاید بادشاہ نے پسند کی ہوگی۔ سب سوداگر مجھے تسلّی اور دِلاسا دینے لگے کہ خیر، جو ہوا سو ہوا، تو کُڑھ مت، اُس کی قیمت ہم سب بھری کر کر تجھے دیں گے۔ میرے حواس باختہ ہو گئے، میں نے کہا کہ اب میں عجم نہیں جانے کا۔ کشتی والوں سے کہا: یارو! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو، کنارے پر اُتار دیجو۔ وے راضی ہوئے۔ میں جہاز سے اُتر کر غراب میں آبیٹھا۔ یہ کتّا بھی میرے ساتھ چلا آیا۔

جب بندر میں پہنچا؛ ایک صندوقچہ جواہر کا، جو ملکہ اپنے ساتھ لائی تھی، اُسے تو رکھ لیا، اور سب اسباب شاہِ بندر کے نوکروں کو دیا اور میں جاسوسی میں ہر کہیں پھرنے لگا کہ شاید خبر ملکہ کی پاؤں، لیکن ہرگز سُراغ نہ ملا اور نہ اِس بات کا پتا پایا۔ ایک رات کو کسو مکر سے بادشاہ کے بھی محل میں گیا اور ڈھونڈھا، کچھ خبر نہ ملی۔ قریب ایک مہینے کے شہر کے کوچے اور محلّے چھان مارے، اور اُس غم سے اپنے تئیں قریب ہلاکت کے پہنچایا اور سودائی سا پھرنے لگا۔ آخر اپنے دل میں خیال کیا کہ غالب ہے شاہِ بندر کے گھر میں میری بادشاہ زادی ہووے تو ہووے، نہیں تو اور کہیں نہیں۔ شاہِ بندر کی حویلی کے گرد پیش دیکھتا پھرتا تھا کہ کہیں سے بھی جانے کی راہ

پاؤں تو اندر جاؤں۔
ایک بَدَر رَو نظر پڑی کہ مُوافق آدمی کی آمد ورفت کے ہے، مگر جالی آہنی اُس کے دہانے پر جَڑی ہے۔ یہ قصد کیا کہ اِس بَدَر رَو کی راہ سے چلوں۔ کپڑے بدن سے اُتارے اور اُس نجس کیچڑ میں اُترا۔ ہزار محنت سے اُس جالی کو تُوڑا اور سنڈاس کی راہ سے چور محل میں گیا۔ عورتوں کا سا لباس بنا کر ہر طرف دیکھنے بھالنے لگا۔ ایک مکان سے آواز میرے کان میں پڑی جیسے کوئی مُناجات کر رہا ہے۔ آگے جا کر دیکھوں تو مَلکہ ہے کہ عجب حالت سے رُوتی ہے اور ناک گھِسنی کر رہی ہے اور خُدا سے دُعا مانگتی ہے کہ صدقے اپنے رَسول کے اور اُس کی آلِ پاک کے، مجھے اِس کُفرستان سے نجات دے! اور جس شخص نے مجھے اِسلام کی راہ بتائی ہے، اُس سے ایک بار خیریت سے مِلا! مَیں دیکھتے ہی دَوڑ کر پاؤں پر گر پڑا۔ مَلکہ نے مجھے گلے لگا لیا۔ ہم دونوں پر ایک دَم بے ہُوشی کا عالَم ہو گیا۔ جب حواس بجا ہوئے، میں نے کیفیت مَلکہ سے پوچھی۔ بُولی: جب شاہِ بندر سب لَونڈیوں کو کِنارے پر لے گیا، مَیں خُدا سے یہی دُعا مانگتی تھی کہ کہیں میرا راز فاش نہ ہو اور مَیں پہچانی نہ جاؤں اور تیری جان پر آفت نہ آوے۔ وُہ ایسا ستّار ہے کہ ہرگز کِسُو نے نہ دریافت کیا کہ یہ مَلکہ ہے۔ شاہِ بندر ہر ایک کو بہ نظرِ خریداری دیکھتا تھا؛ جب میری باری ہوئی، مجھے پسند کر کر اپنے گھر میں چُپکے بھیج دیا، اَوروں کو بادشاہ کے حُضور گزرانا۔
میرے باپ نے جب اُن میں مجھے نہ دیکھا، سب کو رُخصت کیا۔ یہ سب

پُر پیچ میرے واسطے کیا تھا۔ اب یوں مشہور کیا ہے کہ بادشاہ زادی بہت بیمار ہے۔ اگر مَیں ظاہر نہ ہوئی، تو کوئی دن میں میرے مرنے کی خبر سارے مُلک میں اُڑے گی، تو بدنامی بادشاہ کی نہ ہووے؛ لیکن اب مَیں اِس عذاب میں ہُوں کہ شاہِ بندر مجھ سے اَور اِرادہ دل میں رکھتا ہے اور ہمیشہ ساتھ سُونے کو بُلاتا ہے، مَیں راضی نہیں ہوتی۔ اَز بس کہ چاہتا ہے، اب تک میری رضامندی منظور ہے، لہٰذا چُپ ہو رہتا ہے۔ پَر حَیران ہوں اِس طَرح کہاں تک نِبھے گی۔ سُو میں نے بھی جی میں یہ ٹھہرایا ہے کہ جب مجھ سے کچھ اَور قَصد کرے گا، تو مَیں اپنی جان دوں گی اور مَر رہوں گی؛ لیکن تیرے ملنے سے ایک اَور تدبیر دل میں سُوجھی ہے، خُدا چاہے تو (1) سوائے اِس فِکر کے، دوسری کوئی طَرح مُخلصی کی نظر نہیں آتی۔ میں نے کہا: فرماؤ تُو وُہ کون سی تدبیر ہے؟ کہنے لگی: اگر تو سَعی اور محنت کرے، تو ہو سکے۔ میں نے کہا: مَیں فَرماں بَردار ہُوں؛ اگر حُکم کرو، تو جلتی آگ میں کُود پڑوں اور سیڑھی پاؤں، تو تمھاری خاطر آسمان پر چلا جاؤں۔ جو کچھ فرماؤ، سُو بجا لاؤں۔

مَلِکہ نے کہا: تو بڑے بُت کے بُت(2) خانے میں جا اور جس جگہ جوتیاں اُتارتے ہیں، وہاں ایک سیاہ ٹاٹ پڑا رہتا ہے؛ اِس مُلک کی رَسم ہے کہ جو کوئی مُفلس اور مُحتاج ہو جاتا ہے، اُس جگہ وُہ ٹاٹ اُوڑھ کر بیٹھتا ہے۔ یہاں کے لوگ جو زِیارت کو جاتے ہیں، مُوافق اپنے اپنے مَقدُور کے اُسے دیتے ہیں۔ جب دو چار دن میں مال جمع ہوتا ہے، پَنڈے(3) ایک خِلعت بڑے بُت کی سرکار سے دے کر اُسے رُخصت کرتے ہیں۔ وُہ تَوَنگر ہو کر چلا

جاتا ہے۔ کوئی نہیں معلوم کرتا کہ یہ کون تھا۔ تو بھی جا کر اُس پلاس کے نیچے بیٹھ اور ہاتھ مُنّہ اپنا خوب طرح چھپا لے[1] اور کسو سے نہ بول۔ بعد تین دن کے باہمن اور بُت پَرَست ہر چند تجھے خِلعت دے کر رُخصت کریں، تو وہاں سے ہرگز نہ اُٹھ۔ جب نہایَت مِنّت کریں، تب تو بولیو کہ مجھے روپیہ پیسا[2] کچھ درکار نہیں، مَیں مال کا بھوکھا نہیں؛ مَیں مظلوم ہوں، فریاد کو آیا ہوں۔ اگر بَرَہمنوں کی ماتا میری داد دے تو بہتر؛ نہیں، بڑا بُت میرا انصاف کرے گا اور اُس[3] ظالم سے یہی بڑا بُت میری فریاد کو پہنچے گا۔ جب تک وُہ ما باہمنوں کی آپ تیرے پاس نہ آوے؛ بہتیرا[4] کوئی مَنا وے، تو راضی نہ ہو جیو۔ آخر لاچار ہو کر وُہ خود تیرے نزدیک آوے گی۔ وُہ بہت بوڑھی ہے، دُو سَو چالیس بَرس کی عُمر ہے، اور چھتّیس بیٹے اُس کے جَنے ہوئے بُت خانے کے سردار ہیں۔ اور اُس کا بڑے بُت کے پاس بڑا دَرَجہ[5] ہے، اِس سبب اُس کا اِتنا بڑا حُکم ہے کہ جتنے چھوٹے بڑے اِس مُلک کے ہیں، اُس کے کہنے کو اپنی سَعادت جانتے ہیں۔ جو وُہ فرماتی ہے، بہ سَر و چَشم مانتے ہیں۔ اُس کا دامن پکڑ کر کہیو: اَے مائی! اگر مجھ مظلوم مُسافر کا اِنصاف ظالم سے نہ کرے گی، تو مَیں بڑے بُت کی خدمت میں ٹکّریں ماروں گا۔ آخر وُہ رَحم کھا کر تجھ سے میری سِفارِش[6] کرے گا۔

جب[5] وُہ تیرا اَحوال پوچھے تو کہیو کہ مَیں عَجَم کا رہنے والا ہوں۔ بڑے بُت کی زیارَت کی خاطِر اور تمھاری عدالت سُن کر، کالے کوسوں سے

یہاں آیا ہوں۔ کئی دنوں آرام سے رہا۔ میری بی بی بھی میرے ساتھ آئی تھی۔ وُہ جوان ہے اور صورت شکل بھی اچھی ہے اور آنکھ ناک سے دُرست ہے۔ معلوم نہیں کہ شاہِ بندر نے اُسے کیُوں کر دیکھا، بہ زُور مجھ سے چھین کر اپنے گھر میں ڈال دیا۔ اور ہم مُسلمانوں کا یہ قاعِدہ ہے کہ جو نا مَحرَم، عَورت کو اِن کی دیکھے یا چھین لے؛ تو واجِب ہے کہ اُس کو جس طرح ہو، مار ڈالیں اور اپنی جُورُو کو لے لیں۔ اور نہیں تُو، کھانا پِینا چھوڑ دیں؛ کیُوں کہ جب تلک وُہ جیتا رہے، وُہ عَورت خاوِند پر حرام ہے۔ اب یہاں لاچار ہو کر آیا ہوں، دیکھیے تم کیا اِنصاف کرتی ہو! جب مَلِکہ نے مجھے یہ سب سِکھا پڑھا دیا؛ مَیں رُخصت ہو، اُسی تاب دان کی راہ سے نکلا اور وُہ جالی آہنی پِھر لگا دی۔

صُبح ہوتے بُت خانے میں گیا اور وُہ سیاہ پَلاس اُوڑھ کر بیٹھا۔ تین رُوز میں اِتنا روپیہ اور اَشَرفی اور کپڑا میرے نزدیک جمع ہوا کہ اَنبار لگ گیا۔ چَوتھے دِن پَنڈِے، بھجَن کرتے اور گاتے بجاتے، خِلعَت لیے میرے پاس آئے اور رُخصت کرنے لگے۔ مَیں راضی نہ ہوا اور دُہائی بڑے بُت کی دی کہ مَیں گَدائی کرنے نہیں آیا، بلکہ اِنصاف کے لیے بڑے بُت اور بَرَہمنوں کی ماتا کے پاس آیا ہوں۔ جب تلک اپنی داد نہ پاؤں گا، یہاں سے نہ جاؤں گا۔ وِے سُن کر، اُس پِیرِ زال کے رُو بہ رُو گئے اور میرا اَحوال بیان کیا۔ بعد اُس کے ایک چَوبے آیا اور میرے تَئیں کہنے لگا کہ چل، ماتا بُلاتی ہے۔ مَیں وُو نہیں ٹاٹ کالا سر سے پانو تک اُوڑھے ہوئے دِہرے میں

گیا۔ دیکھتا ہوں کہ ایک جڑاؤ[1] سِنگھاسَن پر؛ جس میں لعل، اَلماس اور موتی، مونگا لگا ہوا ہے؛ بڑا بُت بیٹھا ہے۔ اور ایک کُرسیِ زَرّیں پر فرشِ معقول بچھا ہے[2]، اُس پر ایک بُڑھیا سیاہ پُوش، مَسنَد تکیے لگائے؛ اور دُو لڑکے دس بارہ بَرَس کے، ایک داہنے[3]، ایک بائیں؛ شان وشوکت اور تجمّل سے بیٹھی ہے۔ مجھے آگے بُلایا۔ میں اَدَب سے آگے گیا اور تخت کے پایے کو بُوسہ دیا، پھر اُس کا دامن پکڑ لیا۔ اُس نے میرا اَحوال پوچھا۔ میں نے اُسی طَرَح، جس طَور سے مَلِکہ نے تعلیم کر دیا تھا، ظاہِر کیا۔ سُن کر بُولی کہ کیا مُسلمان اپنی اِستری[4] یوں کو اُوجھل میں رکھتے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں، تمھارے بچّوں کی خَیر ہو، یہ ہماری رَسمِ قدیم[5] ہے۔ بُولی کہ تیرا اچھا مَذہب ہے۔ میں ابھی حُکم کرتی[6] ہوں کہ شاہِ بَندر بہ مَع تیری جُورُو آن کر حاضِر ہوتا ہے، اور اُس گیدی کو ایسی سِیاسَت کروں کہ بارِ دیگر ایسی حرکت نہ کرے اور سب کے کان کھڑے ہوں اور ڈریں۔ اپنے لوگوں سے پوچھنے لگی کہ شاہِ بَندر کون ہے؟ اُس کی یہ مَجال ہوئی کہ بِگانی تریا کو بہ زُور چھین لیتا ہے! لوگوں نے کہا کہ فُلانا شخص ہے۔ یہ سُن کر، اُن دونوں لڑکوں کو (جو پاس بیٹھے تھے) فرمایا کہ جلدی اِس مانُس کو ساتھ لے کر بادشاہ کے پاس جاؤ اور کہو کہ ماتا فرماتی ہے کہ حُکم بڑے بُت کا یہ ہے کہ شاہِ بَندر آدمیوں پر زُور زِیادتی کرتا ہے، چُناں چہ اِس غریب کی عَورت کو چھین لیا ہے۔ اُس کی تقصیر بڑی ثابت ہوئی۔ جلد اُس گُم راہ کے مال کا تالیقہ* کر کر، اِس تُرک کے (کہ ہمارا منظورِ نظر ہے) حوالے کر؛ نہیں تو آج رات کو تو سَتّیاناس[7] ہوگا اور

ہمارے غَضَب میں پڑے گا۔ وِے۱ دونوں طِفْل اُٹھ کر مَنڈَل سے باہر آئے اور سوار ہوئے۔ سب پَنڈِت۲ سَنکھ بجاتے اور آرتی گاتے جِلَو میں ہو لیے۔

غَرَض وہاں کے چھوٹے بڑے، جہاں اُن لڑکوں کا پانْو پڑتا تھا، وہاں کی مِٹّی تَبَرُّک جان کر اُٹھا لیتے اور آنکھوں سے لگاتے۔ اِسی طَرح بادشاہ کے قِلعے تک گئے۔ بادشاہ کو خبر ہوئی، ننگے پانْو اِستِقبال کی خاطِر نکل آیا اور اُن کو بڑے مان مَہت۳ سے لے جا کر اپنے پاس تخت پر بِٹھایا اور پوچھا: آج کیُوں کر تشریف فرمانا ہوا؟ اُن دونوں بَرَہمن بچّوں نے، مَا۴ کی طرف سے جو کچھ سُن آئے تھے، کہا اور بڑے بُت کی خَفگی سے ڈرایا۔

بادشاہ نے سُنتے ہی فرمایا: بہت خوب! اور اپنے نوکروں کو حُکم کیا کہ مُحَصِّل جاوِیں اور شاہِ بَندر کو بہ مَعْ۵ اُس عورت کے جلد حُضور میں حاضر کریں؛ تو مَیں تقصیر اُس کی تجویز کر کے سزا دوں۔ یہ سُن کر مَیں اپنے دل میں گھبرایا کہ یہ بات تو اچھی نہ ہوئی۔ اگر شاہِ بَندر کے ساتھ مَلِکہ کو بھی لاویں، تو پردہ فاش ہوگا اور میرا کیا اَحوال ہوگا! دل میں نہایت خَوف زَدہ ہو کر خُدا کی طرف رُجُوع کی؛ لیکن میرے مُنہ پر ہَوائیاں اُڑنے لگیں اور بدن کانپنے لگا۔ لڑکوں نے میرا یہ رنگ دیکھ، شاید دریافت کیا کہ یہ حُکم اِس۶ کی مرضی کے مُوافِق نہ ہوا؛ وُوں ہیں خفا و بَرَہم ہو کر اُٹھے اور بادشاہ کو جِھڑَک کر بولے: اَے مَردَک! تو دیوانہ ہوا ہے، جو فرماں بَرداری سے بڑے بُت کی نکلا اور ہمارے بچن کو جھوٹھ سمجھا، جو دونوں کو بُلوا کر تحقیق کیا چاہتا ہے! اب خبردار! تو غَضَب میں بڑے بُت کے پڑا۔ ہم نے تجھے حُکم پہنچا دیا، اب تو جان اور

بڑا بُت جانے۔

اِس کہنے سے بادشاہ کی عَجَب حالت ہوئی کہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور سر سے پانو تلک رَعشہ ہو گیا، مِنّت کر کے منانے لگا۔ پِٹّے[1] دونوں ہرگز نہ بیٹھے، لیکن کھڑے رہے۔ اِس میں جتنے امیر اُمَرا وہاں حاضر تھے، ایک مُنہ ہو کر بدگوئی شاہِ بَندر کی کرنے لگے کہ وُہ ایسا ہی حرام زادہ، بَدکار اور پاپی ہے۔ ایسی ایسی حَرَکتیں کرتا ہے کہ حُضور میں بادشاہ کے کیا کیا عرض کریں۔ جو کچھ بَرَہمنوں کی ماتا نے کہلا بھیجا ہے، درست ہے؛ اِس واسطے کہ حُکم بڑے بُت کا ہے، یہ دَرُوغ کیوں کر ہوگا۔ بادشاہ نے جب سب کی زُبانی ایک ہی بات سُنی، اپنے کہنے سے بہت خَجِل اور نادِم ہوا۔ جلد ایک خِلعَتِ پاکیزہ مجھے دی اور حُکم نامہ اپنے ہاتھ سے لکھ، اُس پر دَستی مُہر کر کر میرے حوالے کیا۔ اور ایک رُقعہ[2] مادَرِ بَرَہمناں کو لکھا اور جَواہِر، اَشرفیوں کے خوان لڑکوں کے رُو بہ رُو پیش کَش رکھ کر رُخصت کیا۔ مَیں خوشی بہ خوشی بُت خانے میں آیا اور اُس بُڑھیا کے پاس گیا۔

بادشاہ کا خط[3] جو آیا تھا[4]، اُس کا یہ مضمون تھا: اَلقاب کے بعد بندگی، عِجز و نیاز لکھ کر لکھا تھا[5] کہ مُوافِق حُکمِ حُضور کے اِس مردِ مسلمان کو خدمت شاہِ بَندر کی مُقرَّر ہوئی اور خِلعت دی گئی؛ اب یہ اُس کے قَتل کرنے کا مُختار ہے۔ اور سارا مال و اَموال اُس کا اِس[6] تُرک کا ہوا، جو چاہے سو کرے۔ اُمّید وار ہوں کہ میری تقصیر مُعاف ہو۔ بَرَہمنوں کی ماں نے خوش ہو کر فرمایا کہ نَوبَت[7] خانے میں بُت خانے کی نَوبت بجے۔ اور پانچ سَو سپاہی بَرقَنداز،

جو بال باندھی کوڑی ماریں، مُسلّح میرے ہمراہ کر دیے اور حُکم کیا کہ بندر میں جاکر، شاہِ بندر کو دستگیر کر کے اِس مُسلمان کے حوالے کریں۔ جس طرح کے عذاب سے اِس کا جی چاہے، اُسے مارے۔ اور خبردار! سوائے اِس عزیز کے، کوئی محلّ سرا میں داخِل نہ ہووے۔ اور اُس کے مال و خزانے کو امانت اِس کے سپُرد کریں۔ جب یہ بہ خوشی رُخصت کرے، رسید اور صافی نامہ اِس سے لے کر پھر آویں۔ اور ایک سرِ پاد بُتِ بزرگ کی سرکار سے میرے تئیں دے کر، سوار کروا کر وِداع کیا۔

جب مَیں بندر میں پہنچا، ایک آدمی نے بڑھ کر شاہِ بندر کو خبر کی۔ وُہ حیران سا بیٹھا تھا کہ مَیں جا پہنچا۔ غُصّہ تُو دل میں بھر ہی رہا تھا، دیکھتے ہی شاہِ بندر کو، تلوار کھینچ کر ایسی گردن میں لگائی کہ اُس کا سِر الگ بُھٹّا سا اُڑ گیا۔ اور وہاں کے گُماشتے، خزانچی، مُشرِف، داروغوں کو پکڑوا کر سب دفتر ضبط کیے۔ اور مَیں محلّ میں داخِل ہوا، مَلِکہ سے مُلاقات کی۔ آپس میں گلے لگ کر رُوئے اور شُکر خُدا کا کیا۔ میں نے اُس کے، اُس نے میرے آنسو پُونچھے۔ پھر باہر مسند پر بیٹھ کر، اہلِ کاروں کو خِلعتیں دیں اور اپنی اپنی خدمتوں پر سب کو بحال کیا۔ نوکر اور غلاموں کو سرفرازی دی۔ وُہ لوگ جو مَنڈَپ سے میرے ساتھ مُتعیّن ہوئے تھے، ہر ایک کو اِنعام و بخشش دے کر اور اُن کے جمعدار، رِسالے دار کو جوڑے پہنا کر رُخصت کیا اور جواہرِ بیش قیمت اور تھان نور بافی اور شال بافی اور زر دوزی اور جنس و تحفے ہر ایک مُلک کے اور نقد بہت سا بادشاہ کی نذر کی خاطِر، اور موافق ہر ایک

اُمراؤں کے دَرجہ بہ دَرجہ، اور پنڈِیایَن[1] کے لیے، اور سب پنڈوں نے تقسیم کرنے کی خاطِر اپنے ساتھ لے کر، بعد ایک ہفتے کے مَیں بُت کدے میں آیا اور اُس ماتا کے آگے بہ طَریق بِھینٹ کے رکھا۔ اُس نے ایک اور خِلعَت سَرفرازی کی مجھے بخشی اور خطاب دیا۔ پھر بادشاہ کے دربار میں جا کر پیش کَش گُزرانی، اور جو جو ظُلم و فَساد شاہِ بَندر نے ایجاد کیا تھا، اُس کے مَوقوف کرنے کی خاطِر عرض کی۔ اِس سبب سے بادشاہ اور امیر، سَوداگر سب مجھ سے راضی ہوئے۔ بہت نَوازِش مجھ پر فرمائی[2] اور خِلعَت اور گھوڑا دے[3] کر مَنصَب، جاگیر عِنایَت کی[4] اور آبرو، حُرمَت بخشی۔

جب بادشاہ کے حُضور سے باہَر آیا، شاگرد پیشوں[5] کو اور اَہل کاروں[6] کو اِتنا کچھ دے کر راضی کیا کہ سب میرا کَلِمہ[7] پڑھنے لگے۔ غَرَض مَیں بہت مُرفَّہُ الحال ہو گیا اور نہایَت چَین[8] و آرام سے اُس مُلک میں، مَلِکہ سے عَقد باندھ کر، رہنے لگا اور خُدا کی بَندگی کرنے لگا۔ میرے اِنصاف کے باعِث رَعیّت، پَرجا سب خوش تھے۔ مہینے میں ایک بار بُت خانے میں اور بادشاہ کے حُضور آتا جاتا۔ بادشاہ رُوز بہ رُوز زیادہ سَرفرازی فرماتا، آخر مُصاحِبَت میں مجھے داخل کیا۔ میری[9] بے صَلاح کوئی کام نہ کرتا۔ نہایَت بے فِکری سے زِندگی گُزرنے لگی؛ مگر خُدا ہی جانتا ہے، اکثر اندیشہ اِن دونوں بھائیوں کا دل میں آتا کہ وِے[10] کہاں ہوں گے اور کس طَرَح ہوں گے!

بعد مُدّتِ[11] دُو بَرَس کے ایک قافلہ سَوداگروں کا مُلکِ زیرِ باد سے اُس بَندر میں آیا۔ وِے[12] سب قَصدِ عَجَم کا رکھتے تھے، اُنھوں نے یہ چاہا کہ دریا کی راہ

سے اپنے مُلک کو جاویں۔ وہاں کا قاعِدہ یہ تھا کہ جو کارواں آتا، اُس کا سردار
سَوغات و تُحفہ ہر ایک مُلک کا میرے پاس لاتا اور نَذر گُزرانتا۔ دوسرے رُوز
مَیں اُس کے مکان پر جاتا، دَہ یَکی[2] بہ طَرِیق محصول کے اُس کے مال
سے لیتا اور پَروانگی کُوچ کی دیتا۔ اِسی طَرَح وُہ سَوداگر زیرِ باد کے بھی
میری مُلاقات کو آئے اور بے بَہا پیش کَش لائے۔ دوسرے دن مَیں اُن
کے خَیمے میں گیا۔ دیکھا تو دُو آدمی پھٹے پُرانے کپڑے پہنے، گٹھری، بُقچے سِر
پر اُٹھا کر میرے رُو بہ رُو لاتے ہیں۔ بعد مُلاحَظہ کرنے کے پھر اُٹھا لے
جاتے ہیں اور بڑی محنت اور خدمت کر رہے ہیں۔ میں نے خوب بُجھا کر جو
دیکھا، تو یہی میرے دونوں بھائی ہیں۔ اُس وقت غَیرت اور حَمِیَّت نے نہ
چاہا کہ اِن کو اِس طَرَح خدمت گاری میں دیکھوں۔ جب مَیں اپنے گھر کو چلا،
آدمیوں کو کہا کہ اُن دونوں شخصوں کو لیے آؤ۔ جب اِن کو لائے، پھر
لِباس و پُوشاک بنوا دی اور اپنے پاس رکھا۔ اِن بدذاتوں نے پھر میرے
مارنے کا مَنصُوبہ کر کر، ایک رُوز آدھی رات میں سب کو غافِل پا کر، چُوٹّوں[6]
کی طَرَح میرے سرہانے آ پہنچے۔ میں نے اپنی جان کے ڈر سے چوکیداروں
کو دروازے پر رکھا تھا اور یہ کُتّا وفادار میری چارپائی کی پَٹّی تلے سُوتا تھا۔
جُوں اِنھوں نے تلواریں میان سے کھینچیں، پہلے کُتّے نے بھونک کر ان پر حملہ
کیا۔ اُس کی آواز سے سب جاگ پڑے، مَیں بھی ہَل بَلا کر چونکا۔ آدمیوں نے
اُن کو پکڑا، معلوم ہوا کہ آپ ہی ہیں۔ سب لعنتیاں[8] دینے لگے کہ باوُجود اِس
خاطِر داری کے یہ کیا حرکت اِن سے ظُہُور میں آئی!

بادشاہ سلامت! تب تو مَیں بھی ڈرا۔ مَثَل مشہور ہے: ایکؔ خطا، دو خطا؛ تیسریؔ خطا: مادَر بہ خطا۔ دل میں یہی صَلاح ٹھہری کہ اب اِن کو مُقَیّد کروں۔ لیکن اگر بَندی خانے میں رکھوں⑶، تو اِن کا کون خبر گیراں رہے گا؛ بھوکھ پیاس سے مرجائیں گے، یا کوئی اَور سَوانگ* لائیں گے؛ اِس واسطے قَفَس* میں رکھا ہے کہ ہمیشہ میری نظروں کے تلے رہیں، تو میری خاطر جمع رہے۔ مَبادا آنکھوں سے اُوجَھل ہوکر کچھ اَور مَکر کریں۔ اور اِس کُتّے کی عزّت اور حُرمت، اِس کی نَمَک حلالی اور وفاداری⑷ کا سبب ہے۔ سُبحانَ اللہ! آدمی بےوَفا بَدتَر حیوانِ باوَفا سے ہے۔ میری یہ سَرگُذَشت تھی جو حُضور میں عرض کی؛ اب خواہ قَتل فرمایئے یا جاں بخشی کیجے، حُکم بادشاہ کا ہے۔

میں نے سُن کر، اُس جوانِ با ایمان پر آفریں کی اور کہا کہ تیری مُرَوَّت میں کچھ خلَل نہیں اور اِن کی بےحیائی اور حَرامزَدگیؔ میں ہرگز قُصور نہیں۔ سچ ہے: کُتّے کی دُم کو بارہ بَرَس گاڑو، تو بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہتیؔ۔ اُس کے بعد میں نے حقیقت اُن بارہوں لعل کی (کہ اُس کُتّے کے پٹّے میں تھے) پوچھی۔ خواجہ بولا کہ بادشاہ کی صدوؔ بیست سال کی عُمر ہو؛ اُسی بَندر میں، جہاں مَیں حاکم تھا، بعد تین چار سال کے ایک رُوز بالاخانے پر محَلؔ کے (کہ بَلند تھا) واسطے سَیر اور تماشے دریاؔ و صَحرا کے مَیں بیٹھا تھا اور ہر طرف دیکھتا تھا۔ ناگاہ ایک طرف جنگل میں، کہ وہاں شادؔ راہ نہ تھی، دُو آدمی کی تصویر سی نظر آئی کہ چلے جاتے ہیں۔ دُوربین لے کر دیکھا تو عجَب ہیئَت کے انسان دِکھائی دیے۔ چُوب داروں کو اُن کے بُلانے کے واسطے دَوڑایا۔

جب وِے آئے، معلوم ہوا کہ ایک عَورت اور ایک مرد ہے۔ رنڈی کو محل سَرا میں مَلِکہ کے پاس بھیج دیا اور مرد کو رُوبہ رُو بُلایا۔ دیکھا تو ایک جوان بَرَس بِیس بائیس کا، داڑھی مُونچھ آغاز ہے (۱)، لیکن دھوپ کی گرمی سے اُس کے چہرے کا رنگ کالے تَوے کا سا ہو رہا ہے، اور سر کے بال اور ہاتھوں کے ناخُون* بڑھ کر بَن مانُس کی صورت بن رہا ہے۔ اور ایک لڑکا (۲) بَرَس تین چار ایک کا کاندھے پر، اور دُو آستینیں کُرتے کی** بھری ہوئیں، ہَیکَل کی طَرح گلے میں ڈالے۔ عَجَب صورت اور عَجَب وَضع اُس کی دیکھی۔ میں نے نہایَت حَیران ہو کر پوچھا: اَے عزیز! تُو کون ہے اور کس مُلک کا باشِندہ ہے اور یہ کیا تیری حالت ہے؟ وُہ جوان بے اِختِیار رُونے لگا اور وُہ ہِمیانی* کھول کر میرے آگے زمین پر رکھی اور بُولا: اَلجُوع، اَلجُوع! واسطے خُدا کے کچھ کھانے کو دُو! مُدّت سے گھاس اور بَناس پتیاں** کھاتا چلا آتا ہوں، ایک ذرا*** قُوّت مجھ میں باقی نہیں رہی۔ وُونہیں نان و کباب اور شراب میں نے منگوا دی، وُہ کھانے لگا۔

اِتنے میں خواجہ سَرا محل** سے کئی تھیلیاں اَور اُس کے قَبِیلے کے پاس سے لے آیا۔ میں نے اُن سب کو کُھلوایا۔ ہر ایک قِسم کے جَواہِر دیکھے کہ ایک ایک دانہ اُن کا، خَراج* سلطنت کا کہا چاہیے۔ ایک سے ایک اَن مُول: ڈَول میں اور تَول* میں اور آب داری میں۔ اور*** اُن کی چھوٹ پڑنے سے سارا مکان بُوقَلَموں ہو گیا۔ جب اُس نے ٹکڑا کھایا اور ایک جام دارُو کا پیا اور دَم لیا، حَواس بجا ہوئے، تب میں نے پوچھا (۹): یہ پتھر تجھے کہاں ہاتھ لگے؟ جواب دیا کہ میرا وَطَن وِلایَتِ آذَربایجان ہے۔ لڑکپن میں گھر بار، ماں** باپ

سے جُدا ہوکر بہت سختیاں کھینچیں اور ایک مُدّت تلک مَیں زِندہ دَرگُور تھا اور کئی بار مَلَکُ الْمَوت کے پنجے سے بچا ہوں۔ میں نے کہا: اَے مردِ آدمی! مُفَصَّل کہہ تو معلوم ہو۔ تب وُہ اپنا اَحوال بیان کرنے لگا کہ میرا باپ سَوداگر پیشہ تھا۔ ہمیشہ سفر ہِندُوستان و رُوم و چِین و خَطا و فِرنگ کا کرتا۔ جب مَیں دس بَرس کا ہوا، باپ ہِندُوستان کو چلا، مجھے اپنے ساتھ لے جانے کو چاہا۔ ہر چند والِدہ نے اور خالا، مُمانی، پھوپھی نے کہا کہ ابھی یہ لڑکا ہے، لائق سفر کے نہیں ہُوا؛ والِد نے نہ مانا اور کہا کہ مَیں بوڑھا ہوا؛ اگر یہ میرے رُو بہ رُو تربیت نہ ہوگا، تو یہ حسرت گُور میں لے جاؤں گا۔ مردِ بچّا ہے، اب نہ سیکھے گا تو کب سیکھے گا۔

یہ کہہ کر مجھے خواہ مخواہ ساتھ لیا اور روانہ ہوا۔ خَیر و عافیت سے راہ کٹی۔ جب ہِندُوستان میں پہنچے، کچھ جِنس وہاں بیچی، اور وہاں کی سَوغات لے کر زِیر باد کے مُلک کو گئے۔ یہ بھی سفر بہ خوبی ہوا۔ وہاں سے بھی خرید فروخت کر کے جہاز پر سوار ہوئے کہ جلدی وَطَن میں پہنچیں۔ بعد ایک مہینے کے ایک رُوز آندھی اور طوفان آیا اور مینہہ مُوسلا دھار برسنے لگا۔ سارا زمین و آسمان دُھواں دھار ہوگیا اور پَتوار جہاز کی ٹوٹ گئی۔ مُعَلِّم، ناخُدا سر پیٹنے لگے۔ دس دن تلک ہَوا اور مَوج جِدھر چاہتی تھی، لیے جاتی تھی۔ گیارَہویں رُوز ایک پہاڑ سے ٹکّر کھا کے جہاز پُرزے پُرزے ہوگیا۔ نہ معلوم ہوا کہ باپ اور نوکر چاکر اور اَسباب کہاں گیا۔

میں نے اپنے تَئیں ایک تختے پر دیکھا۔ سہ شبانہ رُوز وُہ پَڑا بے اِختیار چلا گیا، چوتھے دن کنارے پر جا لگا۔ مجھ میں فَقَط جان باقی تھی۔ اُس پر سے

اُتر کر، گھٹنیوں چل کر، بارے کسو نہ کسو طرح زمین پر پہنچا۔ دور سے کھیت نظر آئے اور بہت سے آدمی وہاں جمع تھے، لیکن سب سیاہ فام اور ننگے مادر زاد۔ مجھ سے کچھ بولے، لیکن میں نے اُن کی زُبان مُطلق نہ سمجھی۔ وُہ کھیت چنوں کا تھا؛ وُہ آدمی آگ کا اَلاو جلا کر، بوٹوں[1] کے ہولے کرتے تھے اور کھاتے تھے۔ اور کئی[2] ایک گھر بھی وہاں نظر آئے۔ شاید اُن کی خُوراک[*] یہی تھی اور وَہیں بَستے تھے۔ مجھے بھی اِشارت کرنے لگے کہ تو بھی کھا۔ میں نے بھی ایک مُٹھی اُکھاڑ کر بھونے اور پھانکنے[3] لگا۔ تھوڑا سا پانی پی کر ایک گوشے میں سُو رہا۔ بعد دیر کے جب جاگا، اُن میں سے ایک شخص میرے نزدیک آیا اور راہ دِکھانے لگا۔ میں نے تھوڑے سے چنے اَوَر[4] اُکھیڑ لیے اور اُس راہ پر چلا۔ ایک کَفِ دَست مَیدان تھا، گُویا صحرائے قِیامت کا نمونہ کہا چاہیے؛ وُہی[5] بوٹنٹ کھاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ بعد چار دن کے ایک قِلعہ نظر آیا۔ جب پاس گیا، تو ایک کوٹ دیکھا بہت بَلند، تمام پتّھر کا، اور ہر ایک اَلنگ[6] اُس کی دُو دُو کوس کی، اور دروازہ ایک سنگ کا تَراشا ہوا۔ ایک قُفل بڑا سا جَڑا تھا، لیکن وہاں انسان کا نشان نظر نہ پڑا۔ وہاں سے آگے چلا۔ ایک ٹیلا دیکھا کہ اُس کی خاک سُرمے کے رنگ سِیاہ تھی۔ جب اُس تَل[7] کے پار ہوا، تو ایک شہر نظر پڑا بہت بڑا، گرد شہر پناہ اور جابہ جا بُرج۔ ایک طرف شہر کے دریا تھا بڑے پاٹ کا۔ جاتے جاتے دروازے پر گیا اور بِسمِ اللہ کہ کر قدم اندر رکھا۔ ایک شخص کو دیکھا پُوشاک اَہلِ فرنگ کی پہنے ہوئے کُرسی پر بیٹھا ہے۔ جُوں اُن نے مجھے اَجنَبی مسافر دیکھا اور میرے مُنہ سے بِسمِ اللہ سُنی، پکارا کہ آگے

آؤ۔ میں نے جا کر سلام کیا۔ نہایت مہربانی سے سلام کا جواب دیا۔ تُرت میز پر پاؤ روٹی اور مسکہ اور مرغ کا کباب اور شراب رکھ کر کہا: پیٹ بھر کر کھاؤ۔ میں نے تھوڑا سا کھایا اور پیا اور بے خبر ہو کر سویا۔ جب رات ہو گئی تب آنکھ کھلی۔ ہاتھ منہ دھویا۔ پھر مجھے کھانا کھلایا اور کہا: اَے بیٹا! اپنا احوال کہہ۔ جو کچھ مجھ پر گزرا تھا، سب کہہ سنایا۔ تب بولا کہ یہاں تو کیوں آیا؟ میں نے دِق ہو کر کہا: شاید تو دیوانہ ہے! میں نے بعد مدت کی محنت کے اب بستی کی صورت دیکھی ہے، خدا نے یہاں تلک پہنچایا، اور تو کہتا ہے کیوں آیا۔ کہنے لگا: اب تو آرام کر؛ کل جو کہنا ہو گا، کہوں گا۔

جب صبح ہوئی، بولا: کوٹھری میں پھاوڑا اور چھلنی اور توبڑا ہے، باہر لے آ۔ میں نے دل میں کہا کہ خدا جانے روٹی کھلا کر کیا محنت مجھ سے کروائے گا! لاچار وہ سب نکال کر اس کے روبرو لایا۔ تب اس نے فرمایا کہ اس ٹیلے پر جا اور ایک گز کے موافق گڑھا کھود۔ وہاں سے جو کچھ نکلے، اِس چھلنی میں چھان۔ جو نہ چھن سکے، اسے توبڑے میں بھر کر میرے پاس لا۔ میں وہ سب چیزیں لے کر وہاں گیا اور اتنا ہی کھود کر، چھان چھون کر توبڑے میں ڈالا۔ دیکھا تو سب جواہر رنگ بہ رنگ کے تھے۔ اُن کی جوت سے آنکھیں چوندھیا گئیں۔ اسی طرح تھیلے کو مونہا منہ بھر کر اس عزیز کے پاس لے گیا۔ دیکھ کر بولا کہ جو اس میں بھرا ہے، تو لے اور یہاں سے جا، کہ تیرا رہنا اس شہر میں خوب نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ صاحب نے اپنی جانب میں بڑی مہربانگی کی کہ اِتنا کچھ کنکر پتھر دیا، لیکن میرے کس کام کا! جب بھوکھا ہوں گا، تو نہ اِن کو چبا سکوں گا نہ

پیٹ بھرے گا۔ پس اگر اَور بھی دو، تو میرے کس کام آئیں گے! وُہ مرد ہنسا اور کہنے لگا کہ مجھ کو تجھ پر افسوس آتا ہے کہ تو بھی ہماری مانند مُلکِ عَجَم کا مُتوَطِّن ہے، اِس لیے مَیں منع کرتا ہوں؛ نہیں تو جان۔ اگر خواہ نہ خواہ تیرا یہی قَصد ہے کہ شہر میں جاؤں، تو میری انگوٹھی لیتا جا۔ جب بازار کے چَوک میں جاوے، تو ایک شخص سُفَید ریش(۱) وہاں بیٹھا ہوگا اور اُس کی صورت شَکل مجھ سے بہت مُشابِہ ہے، میرا بڑا بھائی ہے، اُس کو یہ چھاپ دیجو؛ تو وُہ تیری خبرگیری کرے گا۔ اور جو کچھ وُہ کہے، اُسی مُوافِق کام کیجو، نہیں تو مُفت مارا جائے گا۔ اور میرا حُکم یہیں تلک ہے، شہر میں میرا دَخل نہیں۔

مَیں نے وُہ خاتَم اُس سے لی اور سلام کرکر رُخصت ہوا، شہر میں گیا۔ بہت خاصہ شہر دیکھا۔ کوچہ و بازار صاف اور زَن و مرد بے حِجاب آپس میں خرید فروخت کرتے، سب خوش لِباس۔ مَیں سیر کرتا اور تماشا دیکھتا جب چَوک کے چَوراہے میں پہنچا، ایسا اِزدِحام تھا کہ تھالی پھینکیے تو آدمیوں کے سر پر چلی جائے۔ خِلقَت کا یہ ٹھٹ بندھ رہا تھا کہ آدمی کو راہ چلنا مُشکل تھا۔ جب کچھ بھیڑ چھٹی، مَیں بھی دھکم دھکا کرتا ہوا آگے گیا۔ بارے اُس عزیز کو دیکھا کہ ایک چَوکی پر بیٹھا ہے اور ایک جڑاؤ چُماق رُو بہ رُو دَھرا ہے۔ مَیں نے جاکر سلام کیا اور وُہ مُہر دی۔ نَظَرِ غَضَب سے میری طرف دیکھا اور بولا: کیوں تو یہاں آیا اور اپنے تئیں بَلا میں ڈالا؟ مگر میرے بے وُقوف بھائی نے تجھے منع نہ کیا تھا؟ میں نے کہا: اُنھوں نے تو کہا، لیکن میں نے نہ مانا اور تمام کیفیت(۱) اپنی اِبتِدا سے اِنتِہا تک کہ سُنائی۔ وُہ شخص اُٹھا اور مجھے ساتھ

لے کر اپنے گھر کی طرف چلا۔ اُس کا مکان بادشاہوں کا سا دیکھنے میں آیا اور بہت سے نوکر چاکر اُس کے تھے۔ جب خِلوَت میں جا کر بیٹھا، یہ مُلّا ئُمت بُولا کہ اَے فرزند! یہ کیا تو نے حماقت کی کہ اپنے پانو سے گور میں آیا! کوئی بھی اِس کم بَخت طِلِسماتی شہر میں آتا ہے! میں نے کہا: مَیں اپنا اَحوال پیش تر کہہ چُکا ہوں، اب تو قسمت لے آئی؛ لیکن شَفقَت فرما کر یہاں کی راہ و رسم سے مُطَّلَع کیجے، تو معلوم کروں کہ اِس واسطے تم نے اور تمھارے بھائی نے مجھے منع کیا۔ تب وُہ جواں مرد بُولا کہ بادشاہ اور تمام رئیس اِس شہر کے راندِے ہوئے ہیں۔ عَجَب طَرح کا اُن کا رَوِیَّہ اور مذہب ہے۔ یہاں بُت خانے میں ایک بُت ہے کہ شیطان اُس کے پیٹ میں سے نام اور ذات اور دِین ہر کِسو کا بیان کرتا ہے۔ پَس جو کوئی غریب مسافر آتا ہے، بادشاہ کو خبر ہوتی ہے؛ اُسے مَنڈَپ میں لے جاتا ہے اور بُت کو سجدہ کرواتا ہے۔ اگر ڈَنڈَوت کی، تو بہتر؛ نہیں تو بچارے کو دریا میں ڈُبوا دیتا ہے۔ اگر وُہ چاہے کہ دریا سے نکل کر بھاگے؛ تو آلت اور خُصیے اُس کے لَنبے ہو جاتے ہیں، ایسے کہ زمین میں گھسٹتے ہیں، مارے بُوجھ کے وُہ ہرگز چل نہیں سکتا۔ ایسا کچھ طِلِسم اِس شہر میں بنایا ہے۔ مجھ کو تیری جوانی پر رَحم آتا ہے؛ مگر تیری خاطر ایک تدبیر کرتا ہوں کہ بھلا کوئی دن تُو تو جیتا رہے اور اِس عذاب سے بچے۔ میں نے پوچھا: وُہ کیا صورت تجویز کی ہے، اِرشاد ہو۔ کہنے لگا: تجھے کَتخُدا کروں اور وزیر کی لڑکی تیری خاطر بیاہ لاؤں۔ میں نے جواب دیا کہ وزیر اپنی بیٹی مجھ سے مُفلس کو کب دے گا، مگر جب اُن کا دِین قبول کروں؛ سُو یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔

کہنے لگا: اِس شہر کی یہ رَسم ہے کہ جو کوئی اُس بُت کو سجدہ کرے؛ اگر فقیر ہو اور بادشاہ کی بیٹی کو مانگے، تو اُس کی خوشی کی خاطِر حوالے کریں اور اُسے رنجیدہ نہ کریں۔ اور میرا ابھی بادشاہ کے نزدیک اِعتِبار ہے اور عزیز رکھتا ہے، لِہٰذا سب اَرکان اور اَکابِر یہاں کے میری قَدر کرتے ہیں۔ اور درمیان ایک ہفتے کے[۱] دُو دن بُت کدے میں زِیارت کو جاتے ہیں اور عبادت بجا لاتے ہیں، چُناں چِہ کل سب جمع ہو وِیں گے، مَیں تجھے لے جاؤں گا۔

یہ کہ کر، کِھلا پِلا کر سُلا رکھا۔ جب صُبح ہوئی، مجھے ساتھ لے کر بُت خانے کی طرف چلا۔ وہاں جا کر جو دیکھا تو آدمی آتے جاتے ہیں اور پَرَستِش کرتے ہیں۔ بادشاہ اور امیر بُت کے سامھنے، پَنڈَوں[۲] کے پاس، سِر ننگے کیے، ادب سے دو زانو بیٹھے تھے اور ناکَتخُدا لڑکیاں اور لڑکے خوب صورت جیسے حُور و[۳] غِلماں، چاروں طرف صَف باندھے کھڑے تھے۔ تب وُہ عزیز مجھ سے مُخاطِب ہوا کہ اَب مَیں جو کہوں، سُو کر۔ میں نے قُبول کیا کہ جو فرماؤ، سُو بجا لاؤں۔ بُولا کہ پہلے بادشاہ کے ہاتھ پانو کو بُوسہ دے، بعد اُس کے وزیر کا دامن پکڑ۔ میں نے وَیسا ہی کیا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ یہ کون ہے اور کیا کہتا ہے؟ اُس مرد نے کہا: یہ جوان میرے رشتے میں ہے، بادشاہ کی قدم بُوسی کی آرزو میں دور سے آیا ہے، اِس تَوَقُّع پر کہ وزیر اِس کو اپنی غُلامی میں سَربَلند کرے، اگر حُکم بُتِ کلاں کا اور مرضی حُضور کی ہووِے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ ہمارا مذہب اور دِین و آئین قُبول کرے گا تو مُبارَک ہے۔ دُونہیں بُت خانے کا نَقّار خانہ بجنے لگا

اور بھاری خِلعَت مجھے پہنائی اور ایک رسّی سیاہ میرے گلے میں ڈال کر، کھینچتے[۱] ہوئے، بُت کی[۲] سِنگھاسَن کے آگے لے جاکر، سجدہ کرواکر، کھڑا کیا۔

بُت سے آواز نکلی کہ اَے خواجہ زادے! خوب ہوا کہ تو ہماری بَندگی میں آیا، اب ہماری رحمت اور عنایَت کا اُمیدوار رہ۔ یہ سُن کر سب خِلقَت نے سجدہ کیا اور زمین میں لوٹنے لگے اور پکارے: دَھن ہے! کیوں نہ ہو، تم ایسے ہی ٹھاکُر ہو۔ جب شام ہوئی، بادشاہ اور وزیر سوار ہوکر وزیر کے محل[۳] میں داخل ہوئے اور وزیر کی بیٹی کو، اپنے طَور کی رِیت رَسْم کرکے، میرے حوالے کیا اور بہت سا دان دَہیز دیا اور بہت منّت[۴] دار ہوئے کہ بہ مُوجِبِ[۵] حُکُم بڑے بُت کے اِسے تمھاری خدمت میں دیا ہے۔ ایک مکان میں ہم دونوں کو رکھا۔ اُس نازنیں کو جو میں نے دیکھا، تو فی الْواقِع اُس کا عالَم پَری کا ساتھا۔ نکھ سِکھ[*] سے دُرُست۔ جو جو خوبیاں پدمنی[۶] کی سُنی جاتی ہیں، سُو سب اُس میں مَوجود تھیں۔ بہ فَراغتِ تمام میں نے صُحبت کی اور حَظّ[۷] اُٹھایا۔ صُبح کو غُسل کرکے بادشاہ کے مُجرے میں حاضِر[۸] ہوا۔ بادشاہ نے خِلعَت دامادی کی عنایَت کی اور حُکُم فرمایا کہ ہمیشہ دربار میں حاضِر رہا کرے۔ آخر کو بعد چند رُوز کے بادشاہ کی مُصاحبَت میں داخل ہوا۔

بادشاہ میری صُحبت سے نہایَت محظُوظ ہوتے اور اکثر خِلعَت اور اِنعام عنایَت کرتے؛ اگرچہ دُنیا کے مال سے میں غَنی تھا، اِس واسطے کہ میرے قَبیلے کے پاس اِتنا نَقد و جِنس اور جَواہِر تھا کہ جس کی حَد[۹] و نہایَت نہ تھی۔

دُو سال تک بہت عیش و آرام سے گزری۔ اِتّفاقاً وزیرزادی کو پیٹ رہا۔ جب ستوانسا ہوا اور اَن گِنا مہینا گزر کر[1] پورے دن ہوئے، پیڑیں[2] لگیں؛ دائی جنائی آئی تو مُوا لڑکا پیٹ میں سے نکلا۔ اُس کا بِس بچّا کو چڑھا[3]، وُہ بھی مر گئی۔ مَیں مارے غم کے دیوانہ ہوگیا کہ یہ کیا آفت ٹوٹی۔ اُس کے سِرہانے بیٹھا رُوتا تھا، ایک بارگی رُونے کی آواز سارے محلّ میں بلند ہوئی اور چاروں طرف سے عورتیں آنے لگیں۔ جو آتی تھی، ایک دو ہتّڑ میرے سر پر مارتی اور اپنی کُس اور کوُن کو ننگا کرکے، میرے مُنہ کے مُقابِل کھڑی رہتی اور رُونا شروع کرتی۔ اِتنی رنڈیاں اِکٹّھی ہوئیں کہ مَیں اُن کے چوتڑوں میں چھپ گیا۔ نزدیک تھا کہ جان نکل جاوے، اِتنے میں کسوُ نے پیچھے سے گریبان میرا کھینچ کر گھسیٹا۔ دیکھوں تو وُہی مردِ عجمی ہے جس نے مجھے بیاہا تھا۔ کہنے لگا کہ اَحمق! تو کس لیے رُوتا ہے؟ میں نے کہا: اَشے ظالم! یہ تو نے کیا بات کہی! میری بادشاہت لُٹ گئی، آرام خانہ داری کا گیا گزرا؛ تو کہتا ہے کیوں غم کرتا ہے! وُہ عزیز تبسّم کرکے بُولا کہ اب اپنی مَوت کی خاطِر رُو۔ میں نے پہلے ہی تجھے کہا تھا کہ شاید اِس شہر میں تیری اَجل لے آئی ہے، سُو ہی ہُوا۔ اب سِوائے مرنے کے تیری رِہائی نہیں۔ آخر لوگ مجھے پکڑ کر بُت خانے میں لے گئے۔ دیکھا تو بادشاہ اور اُمرا اور چھتّیس فرقہ رعیّت، ہر جا وہاں جمع ہیں اور وزیرزادی کا مال اَموال سب دھرا ہے۔ جو چیز جس کا جی چاہتا ہے، لیتا ہے اور اُس کی قیمت کے روپے دھر دیتا ہے۔

غَرَض سب اَسباب کے نَقد روپئے[1] ہوئے۔ اُن روپیوں[2] کا جَواہر خریدا گیا اور ایک صندوقچے میں بند کیا اور ایک دوسرے صندوق میں نان[3]، حلوا اور گوشت کے کباب اور میوۂ[4] خُشک وتَر اور کھانے کی چیزیں لے کر بھر دیں اور لاش اُس بی بی کی ایک صندوق میں رکھ کر، صندوق آزُوقے[5] کا ایک اُونٹ پر لدوایا[6] اور مجھے سوار کیا اور صندوقچہ جَواہر کا میری بَغَل میں دیا اور سارے باہمَن آگے آگے بَھجَن کرتے اور سَنکھ بجاتے چلے اور پیچھے ایک خِلقت مُبارک[7] باد کہتی ہوئی ساتھ ہو لی۔ اِس طَور سے اُسی دروازے سے کہ مَیں پہلے رُوز آیا تھا، شہر کے باہَر نکلا۔ جُونہیں[8] داروغہ کی نگاہ مجھ پر پڑی، رُونے لگا اور بُولا: اَے کم بَخت[9] اَجَل رَگرِفتہ! میری بات نہ سُنی اور اِس شہر میں جاکر مُفت اپنی جان دی۔ میری تَقصیر نہیں، میں نے منع کیا تھا۔ اُن نے یہ بات کہی، لیکن مَیں تُو ہَکّا بَکّا ہو رہا تھا؛ نہ زُبان یاری دیتی تھی کہ جواب دوں، نہ اَوسان بجا تھے کہ دیکھیے انجام میرا کیا ہوتا ہے۔

آخر اُسی قِلعے کے پاس، جس کا میں نے پہلے رُوز دروازہ بند دیکھا تھا، لے گئے اور بہت سے آدمیوں نے مِل کر قُفل کو کھولا اور تابُوت اور صَندوق کو اندر لے چلے۔ ایک پنڈِت میرے نزدیک آیا اور سمجھانے لگا کہ مانَس ایک دن جَنَم پاتا ہے اور ایک رُوز ناس ہوتا ہے، دُنیا کا یِہی آواگَون ہے۔ اب یِہ تیری اِستری اور پُوت اور دَھن اور چالیس دن کا اَسباب بھوجَن کا مَوجود ہے؛ اِس کو لے اور یہاں رہ، جب تلک بڑا بُت تجھ پر مِہربان ہووے۔ میں نے غُصّے میں چاہا کہ اُس بُت پر اور وہاں کے رہنے

والوں پر اور اِس رِیت رَسم پر لعنت کہوں اور اُس با ہمَن کو دَھول چھکّڑ کروں ؛ وُہی مردِ عَجمی اپنی زُبان میں مانع ہوا کہ خبردار ! ہرگز دَم مت مار۔ اگر کچھ بھی بُولا ، تو اِسی وقت تجھے جَلا دیں گے۔ خَیر ، جو تیری قسمت تھا ، سو ہوا۔ اب خُدا کے کرم سے اُمّید وار رہ ، شاید اللہ تجھے یہاں سے جیتا نکالے۔

آخر سب مجھے تَنِ تنہا چھوڑ کر اُس حِصار سے باہَر نکلے اور دروازہ پھر مُقفّل کر دیا۔ اُس وقت مَیں اپنی تنہائی اور بے بَسی پر بے اِختیار رُویا اور اُس عَورت کی لُوتھ پر لاتیں مارنے لگا کہ اَے مُردار ! اگر تجھے جَنتے ہی مرجانا تھا ، بیاہ کاہے کو کیا تھا اور پِیٹ سے کیُوں ہوئی تھی ؟ مار موڑ کر پھر چُپکا بیٹھا۔ اِس میں دِن چڑھا اور دھوپ گرم ہوئی ، سر کا بھیجا پکنے لگا اور تعفّن کے مارے روح نکلنے لگی۔ جِدھر دیکھتا ہوں ، مُردوں کی ہڈّیاں اور صندوق جَواہِر کے ڈھیر لگے ہیں۔ تب کئی صندوق پُرانے لے کر نیچے اوپر رکھے کہ دن کو دھوپ سے اور رات کو اُوس سے بچاو ہو۔ اب پانی کی تلاش کرنے لگا۔ ایک طرف جھرنا سا دیکھا کہ قِلعے کی دیوار میں پتّھر کا تراشا ہوا ، گھڑے کے مُنہ کے مُوافق ہے۔ بارِے کئی دن اُس پانی اور کھانے سے زندگی ہوئی۔

آخر آزوقہ تمام ہوا۔ مَیں گھبرایا اور خُدا کی جناب میں فریاد کی۔ وُہ ایسا کریم ہے کہ دروازہ کوٹ کا کُھلا اور ایک مُردے کو لائے۔ اُس کے ساتھ ایک پیر مرد آیا۔ جب اُسے بھی چھوڑ کر گئے ، یہ دل میں آیا کہ اِس بوڑھے کو مار کر ، اِس کے کھانے کا صندوق سب کا سب لے لے۔ ایک صندوق کا پایہ ہاتھ میں لے کر اُس کے پاس گیا۔ وُہ بِچارا سر زانو بر دھرے حَیران بیٹھا تھا۔ میں

نے پیچھے سے آکر اُس کے سر میں ایسا مارا کہ سر پھٹ کر، مَغز کا گُودا نکل پڑا اور فی الفور جاں بہ حقِ تسلیم ہوا۔ اُس کا آزوقہ لے کر میں کھانے لگا۔ مُدّت (۳) تئیں یہی میرا کام تھا کہ جو زِندہ، مُردے کے ساتھ آتا، اُسے میں مار ڈالتا اور کھانے کا اَسباب لے کر بہ فَراغت کھاتا۔

بعد کتنی مُدّت کے ایک مرتبہ ایک لڑکی تابوُت کے ہمراہ آئی، نہایت قُبول صورت۔ میرے دل نے نہ چاہا کہ اُسے بھی ماروں۔ اُن نے مجھے دیکھا اور مارے ڈر کے بے ہوش ہوگئی۔ میں اُس کا بھی آزوقہ اُٹھا کر اپنے پاس لے آیا، لیکن اکیلا نہ کھاتا۔ جب بھوُکھ لگتی، کھانا اُس کے نزدیک لے جاتا اور ساتھ مِل کر کھاتا۔ جب اُس عَورت نے دیکھا کہ مجھے یہ شخص نہیں ستاتا، دن بہ دن اُس کی وَحشت کم ہوئی اور رام ہوتی چلی، میرے مکان میں آنے جانے لگی۔ ایک رُوز اُس کا اَحوال پوچھا کہ تُو کون ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ میں بادشاہ کے وَکیلِ مُطلق کی بیٹی ہوں۔ اپنے چچا کے بیٹے سے مَنسُوب ہوئی تھی۔ شبِ عُروُسی (۹) کے دِن اُسے قُولنج ہوا۔ ایسا درد سے تڑپھنے لگا کہ ایک آن کی آن میں مر گیا۔ مجھے اُس کے تابوُت کے ساتھ لاکر یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ تب اُس نے میرا اَحوال پوچھا۔ میں نے بھی تمام وکمال بیان کیا اور کہا: خُدا نے تجھے میری خاطِر یہاں بھیجا ہے۔ وُہ مُسکرا کر چُپکی ہو رہی۔

اِسی طَرح کئی دن میں آپس میں مَحبّت زیادہ ہوگئی۔ میں نے اُسے اَرکان مُسلمانی کے سِکھا کر کَلِمہ پڑھایا اور مُتعہ * کر کر صُحبت کی۔ وُہ بھی حاملہ ہوئی، ایک بیٹا پیدا ہوا۔ قریب تین بَرَس کے اِسی صورت سے گزری (۸)۔ جب لڑکے کا

دُودھ بڑھایا، ایک رُوز بی بی سے کہا کہ یہاں کب تلک رہیں گے اور کس طرح یہاں سے نکلیں گے؟ وُہ بولی: خُدا نکالے تو نکلیں، نہیں تو ایک رُوز یُونہیں مرجائیں گے۔ مجھے اُس کے کہنے پر اور اپنے رہنے پر کمال رِقّت آئی، رُوتے رُوتے سُو گیا۔ ایک شخص کو خواب میں دیکھا کہ کہتا ہے: پرنالے کی راہ سے نکلنا ہے تو نکل۔ مَیں مارے خوشی کے چونک پڑا اور جُورو کو کہا کہ لُوہے کی میخیں اور سیخیں، جو پُرانے صندوقوں میں ہیں، جمع کرکے لے آؤ تو اُس کو کُشادہ کروں۔ غَرَض مَیں اُس مُوری کے مُنہ پر میخ رکھ کر پتھروں سے ایسا ٹھونکتا کہ تھک جاتا۔ ایک بَرَس کی محنت میں وُہ سوُراخ اِتنا بڑا ہوا کہ آدمی نکل سکے۔ بعد اُس کے، مُردوں کی آستینوں میں اچھے اچھے جواہِر چُن کر بھرے اور ساتھ لے کر، اُسی راہ سے ہم تینوں باہَر نکلے۔ خُدا کا شُکر کیا اور بیٹے کو کاندھے پر بِٹھالیا۔ ایک مہینا ہوا ہے کہ سَرِ راہ چھوڑ کر، مارے ڈر کے جنگل، پہاڑوں کی راہ سے چلا آتا ہوں۔ جب گُرسنگی ہوتی ہے، گھاس پات کھاتا ہوں۔ قُوّت بات کہنے کی مجھ میں نہیں۔ یہ میری حقیقت ہے جو تم نے سُنی۔

بادشاہ سلامت! میں نے اُس کی حالت پر ترس کھایا اور حمّام کروا کر اچھا لباس پہنوایا اور اپنا نائب بنایا۔ اور میرے گھر میں مَلِکہ سے کئی لڑکے پیدا ہوئے، لیکن خُردسالی میں مر مر گئے۔ ایک بیٹا پانچ بَرَس کا ہو کر مُوا، اُس کے غم میں مَلِکہ نے بھی وَفات پائی۔ مجھے کمال غم ہوا اور وُہ مُلک، بَغیر اُس کے کاٹنے لگا، دل اُداس ہوگیا، اِرادہ عَجَم کا کیا۔ بادشاہ سے عرض کر کر، خدمت شاہِ بندری کی اُس جوان کو دِلوادی۔ اِس عرصے میں بادشاہ

بھی مر گیا۔ میں اِس وفادار کُتے کو اور سب مال، خزانہ، جواہر ساتھ لے کر نیشاپور میں آرہا، اِس واسطے کہ میرے بھائیوں کے احوال سے کوئی[1] واقف نہ ہووے۔ میں "خواجۂ سگ پرست" مشہور ہوا اور اِس بدنامی میں دُگنا محصول آج تک بادشاہِ ایران کی سرکار میں بھرتا ہوں۔

اِتّفاقاً یہ سوداگر بچہ وہاں گیا۔ اِس کے وسیلے سے جہاں پناہ کا قدم بوس کیا۔ میں نے پوچھا: کیا یہ تمھارا فرزند نہیں؟ خواجہ نے جواب دیا: قبلۂ عالم! یہ میرا بیٹا نہیں، آپ ہی کی[2] رعیّت ہے؛ لیکن اب میرا مالک اور وارث، جو کچھ کہیے، سو یہی ہے۔ یہ سن کر سوداگر بچّے سے میں نے پوچھا کہ تو کس تاجر[3] کا لڑکا ہے اور تیرے [4] ما باپ کہاں رہتے ہیں؟ اُس لڑکے نے زمین چومی[5] اور جان کی امان[6] مانگی اور بولا کہ یہ لونڈی، سرکار کے وزیر کی بیٹی ہے۔ میرا باپ حضور کے عتاب میں بہ سبب اِسی خواجہ کے لعلوں کے پڑا اور حکم یوں ہوا کہ اگر ایک سال تک اُس کی بات کرسی نشیں نہ ہوگی، تو جان سے مارا جاوے گا۔ میں نے سن کر یہ بھیس بنایا اور اپنے تئیں نیشاپور پہنچایا۔ خدا نے خواجہ کو بہ مع[7] کُتے اور لعلوں کے حضور میں حاضر کر دیا، آپ نے تمام احوال سن لیا؛ اُمید وار ہوں کہ میرے بوڑھے باپ کی مخلصی ہو۔

یہ بیان وزیر زادی سے سن کر خواجہ نے ایک آہ کی اور بے اختیار گر پڑا۔ جب گلاب اُس پر چھڑکا گیا، تب ہوش میں آیا اور بولا کہ ہائے کم بختی! اِتنی دور سے، یہ رنج و محنت کھینچ کر، میں اِس توقّع پر آیا تھا کہ اِس سوداگر بچّے کو متبنّیٰ کر کر اپنا فرزند کروں گا اور اپنے مال متاع[8] کا اِس کو

ہِبَہ نامہ لکھ دوں گا، تو میرا نام رہے گا اور سارا عالَم اِسے خواجہ زادہ کہے گا؛ سو میرا خیال خام ہوا اور بِالعَکس کام ہوا۔ اِن نے عورت ہو کر مجھ مردِ پیر کو خراب کیا، مَیں رنڈی کے چَرِتّر میں پڑا۔ اب میری وُہ کہاوت ہوئی: گھر میں رہے نہ تیرتھ گئے، مُونڈ مُنڈا فَضیحت بھئے۔

اَلقِصّہ مجھے اُس کی بے قراری اور نالہ و زاری پر رَحم آیا۔ خواجہ کو نزدیک بُلایا اور کان میں مُژدہ اُس کے وَصل کا سُنایا کہ غمگین مت ہو، اِسی سے تیری شادی کر دیں گے۔ خُدا چاہے تو اَولاد تیری ہوگی اور یہی تیری مالک ہوگی۔ اِس خوش خَبری کے سُننے سے فی الجُملہ اُس کو تسلّی ہوئی۔ تب میں نے کہا کہ وزیر زادی کو محل میں لے جاؤ اور وزیر کو پَنڈِت خانے سے لے آؤ اور حَمّام میں نہلاؤ اور خِلعت سَرفَرازی کی پہناؤ اور جلدی میرے پاس لاؤ۔ جس وقت وزیر آیا، لَبِ فرش تک اُس کا اِستِقبال فرمایا اور اپنا بُزرگ جان کر گلے لگایا اور نئے سِرے سے قلم دان وِزارت کا عنایت فرمایا اور خواجہ کو بھی جاگیر و مَنصَب دیا اور ساعتِ سعید دیکھ کر، وزیر زادی سے نکاح پڑھواکر مَنسوب کیا۔ کئی سال میں دُو بیٹے اور ایک بیٹی اُس کے گھر میں پیدا ہوئے، چُناں چِہ بڑا بیٹا، مَلِکُ التُّجّار ہے اور چھوٹا، ہماری سرکار کا مُختار ہے۔

اَے دَرویشو! میں نے اِس لیے یہ نَقل تمھارے سامھنے کی کہ کل کی رات دُو فقیروں کی سَرگُذَشت میں نے سُنی تھی؛ اب تم دونوں بھی، جو باقی رہے ہو، یہ سمجھو کہ ہم اُسی مکان میں بیٹھے ہیں اور مجھے اپنا خادِم اور اِس گھر کو اپنا تکیہ جانو، بے وَسواس اپنی اپنی سَیر کا اَحوال کہو

اور چندے میرے پاس رہو۔ جب فقیروں نے بادشاہ کی طرف سے
بہت خاطر داری دیکھی، کہنے لگے: خیر، جب تم نے گداؤں سے اُلفت کی،
تو ہم دونوں بھی اپنا ماجرا بیان کرتے ہیں، سُنیے۔

سَیر تیسرے دَرویش کی

تیسرا دَرویش کُوٹ[1] باندھ بیٹھا اور اپنی سَیر کا بیان اِس طَرح سے کرنے لگا:

اَحوال اِس فقیر کا اَے دوستاں! سُنو
یعنے جو مجھ پہ بیتی ہے، وُہ داستاں سُنو
جو کچھ کہ شاہِ عشق نے مجھ سے کیا سُلوک
تفصیل وار کرتا ہوں اُس کا بیاں، سُنو!

کہ یہ کم ترین بادشاہ زادہ عَجَم کا ہے۔ میرے وَلی نعمت وہاں کے بادشاہ تھے اور سِوائے میرے کوئی فرزند نہ رکھتے تھے۔ مَیں جوانی کے عالَم میں مُصاحبوں کے ساتھ چَوپَڑ، گَنجفہ، شَطرنج، تختۂ نَرد کھیلا کرتا، یا سوار ہو کر سَیر و شکار میں مشغول رہتا۔ ایک دن کا یہ ماجرا ہے کہ سواری تیّار کروا کر اور سب یار آشناؤں کو لے کر میدان کی طرف نکلا۔ باز، بَہری، جُرّہ، باشا، سُرخاب اور تِیتروں پر اُڑاتا ہوا دُور نکل گیا۔ عَجَب طَرح کا ایک قطعۂ بہار کا نظر آیا کہ جِدھر نگاہ جاتی تھی، کُوسُوں تلک سبز، اور پھولوں سے لعل[8] زمین نظر آتی تھی۔ یہ سَما[9] دیکھ کر گھوڑوں کی باگیں ڈال دِیاں اور قدم قدم سَیر کرتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ ناگاہ اُس صَحرا میں دیکھا کہ ایک کالا ہرَن، اُس پر زر بفت کی جھُول اور بھنوَر کلی مُرَصّع کی اور گھُونگرو[11] سُونے کے

زر دوزی پٹے میں ٹکے ہوئے گلے میں پڑے[1]، خاطر جمع سے اُس میدان میں (کہ جہاں انسان کا دخل نہیں اور پرندہ پر نہیں مارتا) چرتا پھرتا ہے۔ ہمارے گھوڑوں کے سُم کی آہٹ پاکر چوکنا ہوا اور سر اُٹھا کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلا۔

مجھے اُس کے دیکھنے سے یہ شوق ہوا کہ رفیقوں سے کہا کہ تم یہیں کھڑے رہو، مَیں اُسے جیتا پکڑوں گا۔ خبردار! تم قدم آگے نہ بڑھائیو اور میرے پیچھے نہ آئیو۔ اور گھوڑا میری رانوں تلے ایسا پرند[2] تھا کہ بارہا ہرنوں کے اوپر دوڑا کر، اُن کی کرچھالوں کو بھلا کر، ہاتھوں سے پکڑ پکڑ لیے تھے؛ اُس کے عقب دوڑایا۔ وہ، دیکھ کر چھلانگیں بھرنے لگا اور ہوا ہوا۔ اور گھوڑا بھی باد[3] سے باتیں کرتا تھا، لیکن اُس کی گرد کو نہ پہنچا۔ وہ رہوار بھی پسینے پسینے ہوگیا اور میری بھی جیب[4] مارے پیاس کے چٹخنے لگی، پر کچھ بس نہ چلا۔ شام ہونے لگی اور مَیں کیا جانوں کہاں سے کہاں نکل آیا۔ لاچار ہو کر اُسے بھلاوا دیا اور ترکش میں سے تیر نکال کر اور قربان سے کمان سنبھال کر، چلّے میں جوڑ کر، کشش کان تلک لا کر، ران کو اُس کی تاک، اَللہُ اَکبَر کہہ کر مارا۔ بارے پہلا ہی تیر اُس کے پانو میں ترازو ہوا۔ تب لنگڑاتا ہوا پہاڑ کے دامن کی سمت چلا۔ فقیر بھی گھوڑے پر سے اُتر پڑا اور پاپیادہ اُس کے پیچھے لگا۔ اُس نے کوہ کا ارادہ کیا اور میں نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ کئی اُتار چڑھاو کے بعد ایک گنبذ[5] نظر آیا۔ جب پاس پہنچا، ایک باغچہ[6] اور ایک چشمہ دیکھا۔ وہ ہرن تو نظروں سے چھلاوا ہوگیا؛ مَیں نہایت تھکا تھا، ہاتھ پانو دھونے لگا۔

ایک بارگی آواز رونے کی اُس بُرج کے اندر سے میرے کان میں آئی، جیسے کوئی کہتا ہے کہ اَے بچّے! جس نے تجھے تیر مارا، میری آہ کا تیر اُس کے کلیجے میں لگیو! وُہ اپنی جوانی سے پَھل نہ پاوِے اور خُدا اُس کو میرا سا دُکھیا بناوِے! مَیں یہ سُن کر وہاں گیا۔ دیکھا تو ایک بزرگ ریشِ سفید، اچھی پوشاک پہنے ایک مسند پر بیٹھا ہے اور ہِرن آگے لیٹا ہے، اُس کی جانگ سے یہ تیر کھینچتا ہے اور بَد دُعا دیتا ہے۔ میں نے سلام کیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حضرت سلامت! یہ تقصیر نادانستہ اِس غُلام سے ہوئی، مَیں یہ نہ جانتا تھا، خُدا کے واسطے مُعاف کرو۔ بولا کہ بے زبان کو تو نے ستایا ہے؛ اگر اَن جان یہ حرکت تجھ سے ہوئی، اللہ مُعاف کرے گا۔ مَیں پاس جا بیٹھا اور تیر نکالنے میں شریک ہوا۔ بڑی دِقّت سے تیر کو نکالا اور زخم میں مرہم بھر کر چھوڑ دیا۔ پھر ہاتھ دُھو دھا کر؛ اُس پیر مرد نے کچھ حاضری (۵)، جو اُس وقت مَوجود تھی، مجھے کِھلائی۔ میں نے کھا پی کر ایک چارپائی پر لمبی (۶) تانی۔

ماندگی کے سبب خوب پیٹ بھر کر سویا۔ اُس نیند میں آواز نوحہ و زاری کی کان میں آئی۔ آنکھیں مَل کر جو دیکھتا ہوں، تو اُس مکان میں نہ وُہ بوڑھا ہے نہ کوئی اَور ہے، اکیلا مَیں پلنگ پر لیٹا ہوں اور وُہ دالان خالی پڑا ہے۔ چاروں طرف بھیانک ہو کر دیکھنے لگا۔ ایک کونے میں پردہ پڑا نظر آیا۔ وہاں جا کر اُسے اُٹھایا۔ دیکھا تو ایک تخت بچھا ہے اور اُس پر ایک پری زاد عورت، برس چودہ ایک کی، مہتاب کی سی صورت اور زُلفیں دونوں طرف چھوٹیں ہوئیں، ہنستا چہرہ، فرنگی* لباس پہنے ہوئے

عَجَب اَدا سے دیکھتی ہے اور بیٹھی ہے اور وُہ بُزُرگ، اپنا سر اُس کے پانو پر دھرے بے اِختیار رُو رہا ہے اور ہُوش حَواس کھو رہا ہے۔

مَیں اُس پیر مرد کا یہ اَحوال اور اُس نازنیں کا حُسن و جمال دیکھ کر مُرجھا گیا اور مُردے کی طَرَح بے جان ہو کر گر پڑا۔ وُہ مردِ بُزُرگ یہ میرا حال دیکھ کر، شیشہ گُلاب کا لے آیا اور مجھ پر چھڑکنے لگا۔ جب مَیں جیتا اُٹھ کر، اُس معشوق کے مُقابِل جا کر سلام کیا؛ اُس نے ہرگز نہ ہاتھ اُٹھایا اور نہ ہُونٹھ ہِلایا۔ میں نے کہا: اَے گُل بدن! اِتنا غُرور کرنا اور جواب سلام کا نہ دینا کس مذہب میں دُرُست ہے!

کم بُولنا اَدا ہے ہر چند، پَر نہ اِتنا
مُنّد جائے چشمِ عاشق، تو بھی وُہ مُنہ نہ کھولے (۲)

واسطے اُس خُدا کے جس نے تجھے بنایا ہے، کچھ تُو مُنہ سے بُول۔ ہم بھی اِتّفاقاً یہاں آنکلے ہیں، مہمان کی خاطِر ضُرور ہے۔ میں نے بَہتیری باتیں بنائیں، لیکن کچھ کام نہ آئیں۔ وُہ چُپکی (۳)، بُت کی طَرَح بیٹھی سُنا کی۔ تب میں نے بھی آگے بڑھ کر ہاتھ، پانو پر چلایا۔ جب پانو کو چھیڑا، تو سخت معلوم ہوا۔ آخر یہ دریافت کیا کہ پتھّر سے اِس لعل کو تراشا ہے اور آذر (۴) نے اِس بُت کو بنایا ہے۔ تب اُس پیر مردِ (۵) بُت پَرَست سے پوچھا کہ میں نے تیرے ہِرن کی ٹانگ میں کھپرا مارا، تو نے اِس عشق کی (۶) ناوَک سے میرا کلیجا (۷) چھید کر وار پار کیا، تیری دُعا قبول ہوئی؛ اب اِس کی کیفیت مُفصّل بیان کر کہ یہ طِلِسم کیوں بنایا ہے اور تو نے بستی کو چھوڑ کر جنگل پہاڑ کیوں بسایا (۸) ہے؟

تجھ پر جو کچھ بِیتا ہے، مجھ سے کہہ:

جب اُس کا بہت پیچھا لیا، تب اُس نے جواب دِیا کہ اِس بات نے مجھے تو خراب کیا، کیا تو بھی سُن کر ہلاک ہُوا چاہتا ہے؟ میں نے کہا: لو اَب بہت مکر چکر[1] کیا، مطلب کی بات کہو، نہیں تو مار ڈالوں گا۔ مجھے نہایت دَرپے دیکھ کر بولا: اَے جوان! حق تعالیٰ[1] ہر ایک انسان کو عشق کی آنچ سے محفوظ رکھے۔ دیکھ تو، اِس عشق نے کیا کیا آفتیں برپا کی ہیں! عشق ہی کے مارے عورت خاوند کے ساتھ سَتی ہوتی ہے اور اپنی جان کھوتی ہے، اور فرہاد و مجنوں کا قصہ سب کو معلوم ہے۔ تو اُس کے سُننے[2] سے کیا پھل پاوے گا! ناحق[3] گھر بار، دولتِ دُنیا چھوڑ چھاڑ کر نکل جاوے گا! میں نے جواب دیا: بس اَب اپنی دوستی تہ کر رکھو، اِس وقت مجھے اپنا دُشمن سمجھو۔ اگر جان عزیز ہے، تو صاف کہو۔ لاچار ہو کر، آنسو بھر لایا اور کہنے لگا کہ مجھ خانہ خراب کی یہ حقیقت ہے کہ بندے کا نام نُعمان[4] سیّاح ہے۔ مَیں بڑا سوداگر تھا۔ اِس سِن میں، تجارت کے سبب ہفت اِقلیم کی سَیر کی اور سب بادشاہوں کی خِدمت میں رَسائی ہوئی۔

ایک بار یہ خیال جی میں آیا کہ چاروں دانگ مُلک تو پھرا، لیکن جزیرۂ فرنگ کی طرف نہ گیا اور وہاں کے بادشاہ کو اور رعیت و سپاہ کو نہ دیکھا اور رسم و راہ وہاں کی کچھ نہ دریافت ہوئی؛ ایک دفعہ[5] وہاں بھی چلا چاہیے۔ رفیقوں اور شفیقوں سے صلاح لے کر ارادہ مُصمَّم کیا اور تحفہ، ہدایا[6] جہاں تہاں کا، جو وہاں کے لائق تھا، لیا اور ایک قافلہ

سوداگروں کا اِکٹھا کر کر، جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ ہَوا جو مُوافِق پائی، کئی مہینوں میں اُس مُلک میں جا داخِل ہوا۔ شہر میں ڈیرا کیا۔ عجب شہر دیکھا کہ کوئی شہر اُس شہر کی خوبی کو نہیں پہنچتا۔ ہر ایک بازار و کوچے میں پُختہ سڑکیں بنی ہوئیں اور چھڑکاو کیا ہوا۔ صفائی ایسی کہ ایک تِنکا کہیں پڑا نظر نہ آیا، کوڑے کا تو کیا ذِکر ہے۔ اور عمارتیں رنگ بہ رنگ کی، اور رات کو رستوں میں دو رَستہ(۲) قدم بہ قدم روشنی۔ اور شہر کے باہر باغات کہ جن میں عجائب گُل بوٹے* اور میوے نظر آئے کہ شاید سوائے بہشت کے کہیں اَور نہ ہوں گے۔ جو وہاں کی تعریف کروں، سُو بجا ہے۔

غَرَض سوداگروں کے آنے کا چرچا ہوا۔ ایک خواجہ سرا مُعتبَر سوار ہو کر اور کئی خدمت گار ساتھ لے کر قافِلے میں آیا اور بیوپاریوں* سے پوچھا کہ تمھارا سردار کون سا ہے؟ سبھوں نے میری طرف اِشارت کی۔ وُہ محلّی(۳) میرے مکان میں آیا۔ مَیں تعظیم بجا لایا، باہَم سلامٌ علیک(۴) ہوئی۔ اُس کو سُوزنی(۵) پر بِٹھایا، تکیے کی تَواضُع کی؛ بعد اُس کے میں نے پوچھا کہ صاحِب کے تشریف لانے کا کیا باعِث ہے، فرمائیے؟ جواب دیا کہ شہ زادی نے سُنا ہے کہ سوداگر آئے ہیں اور بہت جِنس لائے ہیں؛ لہٰذا مجھ کو حُکم کیا کہ جا کر اُن کو حضور میں لے آؤ۔ پس تم، جو کچھ اَسباب لائق بادشاہوں کی سرکار کے ہو، ساتھ لے کر چلو اور سعادت آستانہ بُوسی کی حاصل کرو۔ میں نے جواب دیا کہ آج تُو ماندگی(۶) کے باعِث قاصِر ہوں، کل جان و مال سے حاضِر ہوں۔ جو کچھ اِس عاجِز کے پاس موجود ہے، نذر گُزرانوں گا۔ جو پسند آوے، مال سرکار کا ہے۔

یہ وعدہ کرکر اور عطر پان دے کر خواجہ کو رُخصت کیا۔ اور سب سوداگروں کو اپنے پاس بُلا کر، جو جو تُحفہ جس کے پاس تھا، لے لے کر جمع کیا اور جو میرے گھر میں تھا، وُہ بھی لیا اور صُبح کے وقت دروازے پر بادشاہی محل[۲] کے حاضر ہوا۔

باری[۳] داروں نے میری خبر عرض کی۔ حُکُم ہوا کہ حُضور میں لاؤ۔ وُہی خواجہ سرا نکلا اور میرا ہاتھ ہاتھ میں لے کر، دوستی کی راہ سے باتیں کرتا ہوا لے چلا۔ پہلے خواص[۴] پُرِشے سے ہوکر ایک مکانِ عالی شان میں لے گیا۔ اَے عزیز! تو باوَر نہ کرے گا، یہ عالَم نظر آیا گویا پَر کاٹ کر پریوں کو چھوڑ دیا ہے۔ جس طرف دیکھتا تھا، نگاہ گڑ جاتی تھی، پانو زمین سے اُکھڑے جاتے تھے۔ بہ زور اپنے تئیں سنبھالتا ہوا رُو بہ رُو پہنچا۔ جُونہیں بادشاہ زادی پَر[۵] نظر پڑی، غَش کی نوبت ہوئی اور ہاتھ پانو میں رَعشہ ہو گیا۔ بہ ہر صورت سلام کیا۔ دونوں طرف دَستِ راست اور دَستِ چپ صَف بہ صَف نازنینانِ پری چہرہ دَست بَستہ کھڑی تھیں۔ مَیں جو کچھ قِسم[۷] جواہر اور پارچۂ پوشاکی اور تُحفے[۸] اپنے ساتھ لے گیا تھا؛ سب کی کِشتیاں حُضور میں چُنیں گئیں۔ اَز بس کہ سب جِنس لائق پسند کے تھی؛ خوش ہو کر خانساماں کے حوالے ہوئی[۹] اور فرمایا کہ قیمت اِس کی، بہ موجِب فَرد کے، کل دی جائے گی۔ مَیں تسلیمات بجا لایا اور دل میں خوش ہوا کہ اِس بہانے سے بھلا کل بھی آنا ہوگا۔ جب رُخصت ہو کر باہر آیا، تو سودائی کی طرح کہتا کچھ تھا اور مُنہ سے کچھ نکلتا تھا۔ اُسی طرح سرا میں آیا، لیکن حَواس[۱۰] بجا نہ تھے۔

سب آشنا، دوست پوچھنے لگے کہ تمھاری کیا حالت ہے؟ میں نے کہا: اِتنی آمد[1] و رفت سے گرمی دِماغ میں چڑھ گئی ہے۔

غَرض وُہ رات تلملاتے[2] کاٹی۔ فَجر کو پھر جاکر حاضِر ہوا اور اُسی خواجہ[3] کے ساتھ پھر محل[4] میں پہنچا۔ وُہی عالَم جو کل دیکھا تھا، دیکھا۔ بادشاہ زادی نے مجھے دیکھا اور ہر ایک کو اپنے اپنے کام پر رُخصت کیا۔ جب بَرچھا ہوا، خِلوَت میں اُٹھ گئیں اور مجھے طَلَب کیا۔ جب مَیں وہاں گیا، بیٹھنے کا حُکم کیا۔ مَیں آداب بجا لاکر بیٹھا۔ فرمایا کہ یہاں جو تو آیا اور یہ اَسباب لایا، اِس میں مُنافَع کتنا منظور ہے؟ میں نے عرض کی کہ آپ کے قدم دیکھنے کی بڑی خواہِش تھی، سو خُدا نے مُیَسَّر کی، اب میں نے سب کچھ بھر پایا اور دونوں جہان کی سَعادت حاصِل ہوئی۔ اور قیمت جو کچھ فِہرِست میں ہے، نِصف کی خَرید ہے اور نِصف نفع* ہے۔ فرمایا: نہیں، جو قیمت تو نے لکھی[5] ہے، وُہ عِنایَت ہو گی، بلکہ اَور بھی اِنعام دیا جائے گا، بہ شرطے کہ ایک کام تجھ سے ہو سکے تو حُکم کروں۔

میں نے کہا کہ غُلام کا جان و مال اگر سَرکار کے کام آوے، تو مَیں اپنے طالِعوں کی خوبی سمجھوں اور آنکھوں سے کروں۔ یہ سُن کر قلم دان یاد فرمایا۔ ایک شُقّہ لکھا[6] اور موتیوں[7] کے دُنبیان میں رَکھ کر، ایک رُومال شبنم کا اُوپر لپیٹ کر میرے حوالے کیا اور ایک اَنگوٹھی نِشان کے واسطے اُنگلی سے اُتار، دی اور کہا کہ اُس طرف کو ایک بڑا باغ ہے، دِل کُشا اُس کا نام ہے؛ وہاں تو جاکر، ایک شخص کیخُسرو[9] نام داروغہ ہے، اُس کے ہاتھ

میں یہ اَنگُشتری دیجو اور ہماری طرف سے دُعا کہیو اور اِس رُقعے کا جواب مانگیو، لیکن جلد آئیو؛ اگر کھانا وہاں کھائیو، تو پانی یہاں پیجو۔ اِس کام کا اِنعام تجھے ایسا دوں گی کہ تو دیکھے گا۔

مَیں رُخصت ہوا اور پوچھتا پوچھتا چلا۔ قریب دُو کُوس کے جب گیا، وُہ باغ نظر پڑا۔ جب پاس پہنچا، ایک عزیز مُسَلَّح مجھ کو پکڑ کے دروازے میں باغ کے لے گیا۔ دیکھوں تو ایک جوان شیر کی سی صورت، سونے کی کُرسی پر، زِرہِ(۲) داؤدی پہنے، چار آئینہ باندھے، فولادی خُود سر پر دَھرے نہایت شان(۳) شوکت سے بیٹھا ہے اور پان سَے جوان تیّار ڈھال، تلوار ہاتھ میں لیے اور ترکَش(۴)، کمان باندھے، مُستَعِد پَرا باندھے کھڑے ہیں۔ میں نے سلام کیا۔ مجھے نزدیک بُلایا۔ میں نے وُہ خاتم(۶) دی اور خوشامد کی باتیں کر کر، وُہ رومال دِکھایا اور رُقعے کے بھی لانے کا اَحوال کہا۔ اُس نے سُنتے ہی اُنگلی دانتوں سے کاٹی اور سر دُھن کر بولا کہ شاید تیری اَجَل تجھ کو لے آئی ہے! خیر، باغ کے اندر جا۔ سَرو کے درخت میں ایک آہنی پنجرہ لٹکتا ہے، اُس میں ایک جوان قید ہے؛ اُس کو یہ خط دے کر، جواب لے کر جلدی پھر آ۔ مَیں شتاب باغ میں گُھسا۔ باغ کیا تھا، گویا جیتے جی بہشت میں گیا۔ ایک ایک چمن رنگ بہ رنگ کا پھول رہا تھا اور فوّارے چھوٹ رہے تھے، جانور چہچہے مار رہے تھے۔ مَیں سیدھا چلا گیا اور اُس درخت میں وُہ قَفَس دیکھا۔ اُس میں ایک جوانِ(۱۱) حَسین نظر آیا۔ میں نے ادب سے سر جھکایا اور سلام کیا اور وُہ خریطہ(۱۲)، سَر بہ مُہر پنجرے کی تیلیوں کی

راہ سے دِیا۔ وُہ عزیز رُقعہ کھول کر پڑھنے لگا اور مجھ سے مُشتاق وار احوال مَلکہ کا پوچھنے لگا۔

ابھی باتیں تمام نہ ہوئیں تھیں کہ ایک فوج زنگیوں کی نموُد ہوئی اور چاروں طرف سے مجھ پر آ ٹوٹی اور بے تحاشا (۲) برچھی و تلوار مارنے لگی۔ ایک آدمی نہتّھے کی بِساط کیا، ایک دَم میں چوُر زخمی کر دیا۔ مجھے کچھ اپنی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ پھر جو ہوش آیا، اپنے تئیں چارپائی پر پایا کہ دُو پیادے اُٹھائے لیے جاتے ہیں اور آپس میں بتیاتے ہیں۔ ایک نے کہا: اِس مُردے کی لوتھ کو میدان میں پھینک دو؛ کُتّے، کوّے کھا جائیں گے۔ دوسرا بولا: اگر بادشاہ تحقیق کرے اور یہ خبر پہنچے، تو جیتا گڑوا دے اور بال بچّوں کو کولھو میں پِڑوا دے (۵)۔ کیا ہمیں اپنی جان بھاری پڑی ہے جو ایسی نامعقول حرکت کریں۔

میں نے یہ گُفتگو سُن کر، دونوں یاجوج ماجوج سے کہا کہ واسطے خُدا کے مجھ پر رَحم کرو، ابھی مجھ میں ایک رمَق جان باقی ہے؛ جب مر جاؤں گا، جو تمھارا جی چاہے گا سُو کیجو۔ مُردہ بدستِ زندہ۔ لیکن یہ تو کہو مجھ پر یہ کیا حقیقت بیتی، مجھے کیوں مارا اور تم کون ہو؟ بھلا اِتنا تو کہہ سُناؤ! تب اُنھوں نے رَحم کھا کر کہا کہ وُہ جوان جو قفس میں بند ہے، اِس بادشاہ کا بھتیجا ہے اور پہلے اِس کا باپ تختِ نشیں تھا۔ رِحلت کے وقت یہ وَصیّت اپنے بھائی کو کی کہ ابھی میرا بیٹا، جو وارِث اِس سلطنت کا ہے، لڑکا اور بے شعور (۷) ہے؛ کاروبار بادشاہت کا خیر خواہی اور ہوشیاری سے تم کیا کیجو۔

جب یہ بالغ ہو، اپنی بیٹی سے شادی اِس کی کر دیجو اور مختار تمام مُلک اور خزانے کا کیجو۔

یہ کہہ کر اُنھوں نے وَفات پائی اور سلطنت کی نوبت چھوٹے بھائی پر آئی۔ اُس نے وَصِیَّت پر عمَل نہ کیا؛ بلکہ دیوانہ اور سودائی مشہور کر کے پنجرے میں ڈال دیا۔ اور چوکی گاڑھی چاروں طرف باغ کے رکھی ہے کہ پرندہ پَر نہیں مار سکتا۔ اور کئی (۳) مرتبے زہرِ ہَلاہِل دیا ہے؛ لیکن زندگی زبردست ہے، اثر نہیں کیا۔ اب وُہ شہ زادی اور یہ شہ زادہ، دونوں عاشق معشوق بن رہے ہیں؛ وُہ گھر میں تلپھے ہے اور یہ قفس (۴) میں تڑپھے ہے۔ تیرے ہاتھ شوق کا نامہ اُس نے بھیجا؛ یہ خبر ہرکاروں نے بجِنس بادشاہ کو پہنچائی، حبشیوں کا دستہ متعیّن ہوا۔ تیرا یہ احوال کیا اور اُس جوانِ (۵) قیدی کے قتل کی وزیر سے تدبیر پوچھی۔ اُس نمک حرام نے مَلِکہ کو راضی کیا ہے کہ اُس بے گُناہ کو بادشاہ کے حُضور اپنے ہاتھ سے شہ زادی مار ڈالے۔

میں نے کہا: چلو، مرتے مرتے یہ تماشا بھی دیکھ لیں۔ آخر راضی ہو کر، وُہ دونوں اور مَیں زخمی، چُپکے ایک گوشے میں جا کر کھڑے ہوئے۔ دیکھا تو تخت پر بادشاہ بیٹھا ہے اور مَلِکہ کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہے اور شہ زادے کو پنجرے سے باہر نکال کر رُو بہ رُو کھڑا کیا۔ مَلِکہ جلّاد بن کر، شمشیرِ (۶) برہنہ (۷) لیے ہوئے اپنے عاشق کے قتل کرنے کو آئی۔ جب نزدیک پہنچی، تلوار پھینک دی اور گلے میں چمٹ گئی۔ تب وُہ عاشق بولا کہ ایسے مرنے پر مَیں راضی ہوں۔ یہاں بھی تیری آرزو ہے، وہاں بھی تیری تمنّا

رہے گی۔ مَلِکہ بُولی کہ اِس بہانے سے مَیں تیرے دیکھنے کو آئی تھی۔ بادشاہ[۱] یہ حرکت دیکھ کر سخت بَرہَم ہوا اور وزیر کو ڈانٹا کہ تو یہ تماشا مجھے دِکھلانے کو لایا تھا! مَحَلّی[۲] مَلِکہ کو جُدا کر کے محل[۳] میں لے گئے، اور وزیر نے خفا ہو کر تلوار اُٹھائی اور بادشاہ زادے کے اوپر دَوڑا، کہ ایک ہی وار میں کام[۴] اُس بچارے کا تمام کرے۔ جُوں چاہتا ہے کہ تیغا چلاوِے، غَیب سے ایک تیر[۵] ناگہانی اُس کی پیشانی پر بیٹھا کہ دوسار ہو گیا اور وُہ گر پڑا۔ بادشاہ یہ وارِدات دیکھ کر محل[۶] میں گُھس گئے۔ جوان کو پھر قَفَس[۷] میں بند کر کر باغ میں لے گئے۔

مَیں بھی وہاں سے نکلا۔ راہ میں سے ایک آدمی مجھے بُلا کر مَلِکہ کے حُضور[۸] لے گیا۔ مجھے گھائل دیکھ کر، ایک جَرّاح[۹] کو بُلوایا اور نہایت تقیُّد[۱۰] سے فرمایا کہ اِس جوان کو جلد چنگا کر کے[۱۱] غُسلِ شِفا کا دِے؛ یہی تیرا مُجرا ہے۔ اِس کے اوپر جتنی محنت تو کرے گا، ویسا ہی اِنعام اور سَرفرازی پاوِے گا۔ غَرَض وُہ جَرّاح[۱۱]، بہ مُوجِب اِرشادِ[۱۲] مَلِکہ کے، تگ ودَو کر کے، ایک چِلّے میں نہلا دُھلا مجھے حُضور میں لے گیا۔ مَلِکہ نے پوچھا کہ اب تو کچھ کسَر باقی نہیں رہی؟ میں نے کہا کہ آپ کی تَوَجُّہ سے اب ہَٹّا کَٹّا ہوں۔ تب مَلِکہ نے ایک خِلعَت اور بہت سے روپَے[۱۳]، جو فرمائے تھے بلکہ اُس سے بھی دو چَند عطا کیے اور رُخصت کیا۔

میں نے وہاں سے سب رفیق اور نوکر چاکروں کو لے کر کُوچ کیا۔ جب اِس مَقام پر پہنچا، سب کو کہا: تم اپنے وَطَن کو جاؤ۔ اور میں نے اِس پہاڑ پر یہ مکان اور اُس کی صورت بنا کر، اپنا رہنا مُقرر کیا اور نوکروں

اور غلاموں کو، موافق ہر ایک کی قدر کے، روپئے دے کر آزاد کیا اور یہ کہ دیا کہ جب تلک مَیں جیتا رہوں، میرے قوت[1] کی خبر گیری تمھیں ضرور ہے، آگے مختار ہو۔ اب وُہی اپنی نمک حلالی سے میرے کھانے کی خبر لیتے ہیں، اور مَیں بہ خاطرِ جمع[2] اِس بُت کی پرستش کرتا ہوں۔ جب تلک جیتا ہوں، میرا یہی کام ہے۔ یہ میری سرگذشت ہے جو تو نے سُنی۔

یا فُقرا[3]! میں نے بہ مجرّدِ سُننے[4] اِس قصّے کے، کفنی گلے میں ڈالی اور فقیروں کا لباس کیا اور اشتیاق[5] میں فرنگ کے مُلک کے دیکھنے کے، روانہ ہوا۔ کتنے ایک عرصے میں جنگل[6]، پہاڑوں کی سیر کرتا ہوا، مجنوں اور فرہاد کی صورت بن گیا۔ آخر میرے شوق نے اُس شہر تلک پہنچایا۔ گلی[7] کوچے میں باولا سا پھرنے لگا۔ اکثر ملکہ کے محل[8] کے آس پاس رہا کرتا، لیکن کوئی ڈھب ایسا نہ ہوتا جو وہاں تلک رسائی ہو۔ عجب حیرانی تھی کہ جس واسطے یہ محنت کشی کر کر گیا، وہ مطلب ہاتھ نہ آیا۔ ایک دن بازار میں کھڑا تھا کہ ایک بارگی آدمی بھاگنے لگے اور دُکان[9] دار دُکانیں بند کر کے چلے گئے۔ یا وہ رونق تھی، یا سنسان[10] ہوگیا۔ ایک طرف سے ایک جوان رستم کا سا کلّہ جبڑا[11]، شیر کی مانند گونجتا اور تلوار دو دستی جھاڑتا ہوا، زرہ بکتر گلے میں اور ٹوپ جھلم کا سر پر اور طمنچے کی جوڑی کمر میں، کیفی کی طرح بکتا جھکتا نظر آیا اور اُس کے پیچھے دو غُلام، بنات کی پوشاک پہنے، ایک تابوت مخملِ کاشانی سے مڑھا ہوا سر پر لیے چلے آتے ہیں۔

میں نے یہ تماشا دیکھ کر ساتھ چلنے کا قصد کیا۔ جو کوئی آدمی میری نظر

پڑتا، مجھے منع کرتا؛ لیکن مَیں کب سُنتا ہوں۔ رَفتہ رَفتہ وُہ جواں مرد
ایک عالی شان مکان میں چلا، مَیں بھی ساتھ ہوا۔ اُس نے پھرتے ہی چاہا کہ
ایک ہاتھ مارے اور مجھے دُو ٹکڑے کرے؛ میں نے اُسے قَسَم دی کہ مَیں بھی
یہی چاہتا ہوں، میں نے اپنا خون مُعاف کِیا؛ کِسُو طَرَح مجھے اِس زِندگی
کے عذاب سے چھُڑا دے، کہ نہایَت بہ تنگ آیا ہوں۔ مَیں جان بوجھ کر
تیرے سامھنے آیا ہوں، دِیر مت کر۔ مجھے مرنے پر ثابِت قَدَم دیکھ کر، خُدا
نے اُس کے دل میں رَحم ڈالا اور غُصّہ بھی ٹھنڈا ہوا؛ بہت تَوَجُّہ اور مہربانی
سے پوچھا کہ تؤ کون ہے اور کیئوں زِندگی سے بیزار ہوا ہے؟

میں نے کہا: ذرا بیٹھیے تو کہوں؛ میرا قصّہ بہت دُور دَراز ہے۔ اور
عشق کے پنجے میں گرِفتار ہوں، اِس سبب لاچار ہوں۔ یہ سُن کر، اُس
نے اپنی کمر کھولی اور ہاتھ مُنہ دھو دھا کر، کچھ ناشتا کیا، مجھے بھی باعِث
ہُوا۔ جب فَراغَت کر کے بیٹھا، بُولا: کہ، تجھ پر کیا گزری؟ میں نے سب
وارِدات اُس پیر مرد کی اور مَلِکہ کی اور اپنے وہاں جانے کی کہہ سُنائی۔
پہلے، سُن کر رُویا اور یہ کہا کہ اِس کم بَخت نے کس کس کا گھر گھالا! لیکن بھلا
تیرا عِلاج میرے ہاتھ میں ہے؛ اَغلَب ہے کہ اِس عاصی کے سبب سے
تؤ اپنی مُراد کو پہنچے۔ اور تؤ اندیشہ نہ کر اور خاطِر جمع رکھ۔ حَجّام کو فرمایا کہ
اِس کی حَجامت کر کے حمّام کروا دے۔ ایک جوڑا کپڑا اُس کے غُلام
نے لا کر پہنایا۔ تب مجھ سے کہنے لگا کہ یہ تابؤت جو تو نے دیکھا، اُسی شہزادہ
مرحوم کا ہے جو قفس میں مُقَیَّد تھا۔ اُس کو دوسرے وزیر نے آخر مکر سے

مارا۔ اُس کی تُو نجات ہوئی کہ مظلوم مارا گیا۔ مَیں اُس کا کُوکا ہوں۔ میں نے بھی اُس وزیر کو بہ ضربِ شمشیر مارا اور بادشاہ کے مارنے کا اِرادہ کیا۔ بادشاہ گڑگڑایا اور سوگند کھانے لگا کہ مَیں بے گُناہ ہوں۔ میں نے اُسے نامَرد جان کر چھوڑ دیا۔ جب سے میرا کام یہی ہے کہ ہر مہینے کی نوچندی جُمعرات کو مَیں اِس تابوُت کو اِسی طَرح شہر میں لیئے پھرتا ہوں اور اُس کا ماتم کرتا ہوں.

اُس کی زَبانی یہ اَحوال سُننے سے مجھے تسلّی ہوئی کہ اگر یہ چاہے گا تو میرا مَقصد بَر آوے گا۔ خُدا نے بڑا اِحسان کیا جو ایسے جُنونی کو مجھ پر مہربان کیا۔ سچ ہے: خُدا مہربان ہو تو کُل مہربان۔ جب شام ہوئی اور آفتاب غرُوب ہوا، اُس جوان نے تابوُت کو نکالا اور ایک غُلام کے عِوَض، وُہ تابوُت میرے سر پر دَھرا اور اپنے ساتھ لے کر چلا۔ فرمانے لگا کہ مَلکہ کے نزدیک جاتا ہوں، تیری سُفارِش تا بہ مَقدُور کروں گا؛ تو ہرگز دَم نہ مارِیو، چُپکا بَیٹھا سُنا کیجو۔ میں نے کہا: جو کچھ صاحِب فرماتے ہیں، سُو ہی کروں گا؛ خُدا تم کو سلامت رکھے جو میرے اَحوال پر تَرس کھاتے ہو۔ اُس جوان نے قَصد بادشاہی باغ کا کیا۔ جب اندر داخل ہوا؛ ایک چبوُترہ سنگِ مَرمَر کا، ہشت پہلو باغ کے صَحن میں تھا اور اُس پر ایک نَم گیرا سُفَیدہ بادلے کا، موتیوں کی جھالر لگی ہوئی، اَلماس کے اِستادوں پر کھڑا تھا اور ایک مسندِ مُغرَّق بچھی تھی، گاؤتکیہ اور بَغلی تکیے زَربَفت کے لگے ہوئے؛ وُہ تابوُت وہاں رکھوایا اور ہم دونوں کو فرمایا کہ اُس درخت کے پاس جا کر بَیٹھو۔

بعد ایک ساعت کے مَشعَل کی روشنی نظر آئی۔ مَلِکہ آپ، کئی خواصیں[۱] پَس و پیش اِہتمام کرتی ہوئیں، تشریف لائیں؛ لیکن اُداسی اور خَفگی چہرے پر ظاہر تھی، آ کے مسند پر بیٹھیں۔ یہ گوکا اَدَب سے دَست بَستہ کھڑا رہا۔ پھر اَدَب سے، دُور فرش کے کِنارے مُوَدَّب[۲] بیٹھا، فاتحہ پڑھیں[۳] اور کچھ باتیں کرنے[۴] لگا۔ مَیں کان لگائے سُن رہا تھا۔ آخر اُس جوان نے کہا کہ مَلِکۂ جہاں[۵] سلامت! مُلکِ عَجَم کا شہزادہ آپ کی خوبیاں اور محبوبیاں غائبانہ سُن کر، اپنی سلطنت کو برباد دے[۶]، فقیر بَن[۷]، مانند اِبراہیم اَدہَم[۸] کے تباہ ہو[۹]، اور بڑی محنت کھینچ کر یہاں تلک آ پہنچا ہے۔ سائیں! تیرے کار نے چھوڑا شہرِ بَلخ[۱۰]۔ اور اِس شہر میں[۱۱] بہت دِنوں سے حیران پریشان پھرتا ہے۔ آخر وُہ قصدِ مَرنے کا کر کے میرے ساتھ لگ[۱۲] چلا۔ میں نے تلوار سے ڈرایا، اُس نے گردن آگے دھر دی اور قسم دی کہ اب مَیں یہی چاہتا ہوں، دیر مت کر۔ غَرَض تمھارے عشق میں ثابت ہے۔ میں نے خوب آزمایا، سب طَرح پورا پایا؛ اِس سبب سے اُس کا مذکور مَیں درمیان لایا۔ اگر حُضور سے اُس کے اَحوال پر، مُسافِر جان کر، توَجُّہ ہو تو خُدا ترسی اور حق[۱۳] شناسی سے دُور نہیں۔

یہ ذِکر مَلِکہ نے سُن کر فرمایا: کہاں ہے؟ اگر شہزادہ ہے تو کیا مضائقہ! رُو بہ رُو آوے۔ وُہ گوکا وہاں سے اُٹھ کر آیا اور مجھے ساتھ لے کر گیا۔ مَیں مَلِکہ کے دیکھنے سے نہایت شاد ہوا، لیکن[۱۴] عقل و ہوش برباد ہوئے، عالَم سُکُوت کا ہو گیا؛ یہ ہواو[۱۵] نہ پڑا کہ کچھ کہوں۔ ایک دَم میں مَلِکہ سِدھاری اور

کوکا اپنے مکان کو چلا۔ گھر آکر بولا کہ میں نے تیری سب حقیقت اوّل سے آخر تک مَلکہ کو کہہ سُنائی اور سفارش بھی کی؛ اب تو ہمیشہ رات کو بلاناغہ جایا کر اور عیش، خوشی منایا کر۔ مَیں اُس کے قدم پر گر پڑا، اُس نے گلے لگا لیا۔ تمام دن گھڑیاں گنتا رہا کہ کب سانجھ ہو، جو مَیں جاؤں۔ جب رات ہوئی، مَیں اُس جوان سے رُخصت ہو کر چلا اور پائیں باغ میں، مَلکہ کے چبوترے پر تکیہ لگا کر جا بیٹھا۔

بعد ایک گھڑی کے مَلکہ تنِ تنہا ایک خوّاص کو ساتھ لے کر، آہستہ آہستہ آکر مسند پر بیٹھیں۔ خوش طالعی سے یہ دِن میسّر ہوا، میں نے قدم بوس کیا۔ اُنھوں نے سر میرا اُٹھا لیا اور گلے سے لگا لیا اور بولیں کہ اِس فُرصت کو غنیمت جان اور میرا کہا مان؛ مجھے یہاں سے لے نکل، کِسُو اور مُلک چل۔ میں نے کہا: چلیے۔ یہ کہہ کر ہم دونوں باغ کے باہر تو ہوئے، پَر حیرت سے اور خوشی سے ہاتھ پانو بھول گئے اور راہ بھول گئے اور ایک طرف کو چلے جاتے تھے، پَر کچھ ٹھکانا نہیں پاتے تھے۔ مَلکہ برہم ہو کر بولی کہ اب مَیں تھک گئی، تیرا مکان کہاں ہے؟ جلد چل کر پہنچ، نہیں تو کیا کِیا چاہتا ہے! میرے پانو میں پھپھولے پڑ گئے ہیں، رستے میں کہیں بیٹھ جاؤں گی۔ میں نے کہا کہ میرے غُلام کی حویلی نزدیک ہے، اب آپہنچے، خاطر جمع رکھو اور قدم اُٹھاؤ۔ جھوٹھ تو بولا، پَر دِل میں حیران تھا کہ کہاں لے جاؤں! عین راہ پر ایک دروازہ مُقفّل نظر پڑا۔ جلدی سے قُفل کو توڑ کر، مکان کے بھیتر گئے۔ اچھی حویلی، فرش بچھا ہوا، شراب کے شیشے بھرے قرینے سے

طاق میں دَھرے اور باورچی خانے میں نان، کباب تیار تھے۔ ماندگی[1] کمال ہورہی تھی، ایک ایک گلابی شراب پُرتگالی کی اُس گزک کے ساتھ لی اور ساری رات باہم خوشی کی۔ جب اِس چین سے صبح ہوئی، شہر میں غُل مچا کہ شہ زادی غائب ہوئی۔ مُحلّہ مُحلّہ، کوچہ کوچہ[2] مُنادی پھرنے لگی اور کُٹنیاں اور ہرکارے چھوٹے کہ جہاں سے ہاتھ آوے، پیدا کریں۔ اور سب دروازوں پر شہر کے بادشاہی غُلاموں کی چوکی آ بیٹھی۔ گُذربانوں کو حُکم ہوا کہ بغیر پروانگی[3] چیونٹی باہر شہر کے نہ نکل سکے۔ جو کوئی سُراغ مَلِکہ کا لاوے گا، ہزار اَشرفی اور خِلعت اِنعام پاوے گا۔ تمام شہر میں کُٹنیاں پھرنے اور گھر گھر میں گُھسنے لگیں۔

مجھے جو کم بختی لگی، دروازہ بند نہ کیا۔ ایک بُڑھیا شیطان کی خالا، اُس کا خُدا کرے مُنھ کالا، ہاتھ میں تسبیح لٹکائے، بُرقع اوڑھے؛ دروازہ کُھلا پاکر بِندھڑک چلی آئی اور سامھنے مَلِکہ کے کھڑی ہوکر، ہاتھ اُٹھا کر دُعا دینے لگی کہ اِلٰہی! تیری نتھ[4]، چوڑی سُہاگ کی سلامت رہے اور کماؤ کی پگڑی قائم رہے! میں غریب رَنڈیا[5]، فقیرنی ہوں؛ ایک بیٹی میری ہے کہ وہ دوجی سے، پورے دِنوں، دردِ زِہ میں مرتی ہے اور مجھ کو اِتنی وُسعت نہیں کہ آدھی کا تیل چراغ میں جلاؤں، کھانے پینے کو توشہ کہاں سے لاؤں! اگر مرگئی، تو گور کفن[9] کیئوں کر کروں گی! اور جنی، تو دائی[10] جنائی کو کیا دوں گی! اور جچّا کو ستھوارا[11]، اَچھوانی کہاں سے پلاؤں گی! آج دو دِن ہوئے ہیں کہ بھوکھی[12] پیاسی پڑی ہے۔ اَے صاحب زادی! اپنی خیر کچھ ٹُکڑا[13] پارچہ

دِلا، تو اُس کو پانی پینے کا آدھار ہو۔

مَلکہ نے تَرَس کھاکر، اپنے نزدیک بُلاکر، چار نان اور کباب اور ایک اَنگوٹھی چھنگلیا سے اُتار کر حوالے کی کہ اِس کو بیچ باٹنج کر گہنا پاتا بنا دیجو اور خاطِر جمع سے گزران کیجو اور کبھو آیا کیجو، تیرا گھر ہے۔ اُس نے اپنے دل کا مُدّعا، جس کی تلاش میں آئی تھی، بِجِنْس پایا؛ خوشی سے دُعائیں دیتی اور بَلائیں لیتی دَفع ہوئی۔ ڈیوڑھی میں نان، کباب پھینک دِیے، مگر اَنگوٹھی کو مُٹھی میں لے لیا، کہ پتا مَلکہ کے ہاتھ کا میرے ہاتھ آیا۔ خُدا اُس آفت سے جو بچایا چاہے، اُس مکان کا مالک جوان مردِ سپاہی، تازی گھوڑے پر چڑھا ہوا، نیزہ ہاتھ میں لیے، شِکار بَند سے ایک ہرن لٹکائے آپہنچا۔ اپنی حَوِیلی کا تالا ٹوٹا اور کِواڑ کُھلے پائے، اُس دَلّالہ کو نکلتے دیکھا؛ مارے غُصّے کے ایک ہاتھ سے اُس کے جھونٹے پکڑ کر لٹکا لیا اور گھر میں آیا۔ اُس کے دونوں پانو میں رَسّی باندھ کر، ایک درخت کی ٹَہنی میں لٹکایا۔ سر تلے، پانو اوپر کیے؛ ایک دَم میں تڑپھ تڑپھ کر مر گئی۔ اُس مرد کی صورت دیکھ کر یہ ہیبت غالب ہوئی کہ ہَوائیاں مُنْہ پر اُڑنے لگیں اور مارے ڈر کے کلیجا کانپنے لگا۔ اُس عزیز نے ہم دونوں کو بَدحَواس دیکھ کر تسلّی دی کہ بڑی نادانی تم نے کی! ایسا کام کیا اور دروازہ کُھلا دِیا!

مَلکہ نے مُسکرا کر فرمایا کہ شہ زادہ، اپنے غُلام کی حَوِیلی کہہ کر مجھے لے آیا اور مجھ کو پُھسلایا۔ اُس نے اِلتماس کیا کہ شہ زادے نے بیانِ واقعی کہا۔ جتنی خَلقُ اللہ ہے، بادشاہوں کی لَونڈی غُلام ہیں۔ اُنھیں کی بَرکت

اور فیض سے سب کی پَرورِش اور نباہ ہے۔ یہ غُلام، بے دام و درم زرخرید تمھارا ہے؛ لیکن بھید چھپانا عَقْل کا مُقتَضا ہے۔ اَے شاہ زادے! تمھارا اور مَلِکہ کا اِس غریب خانے میں تَوَجُّہ فرمانا اور تشریف لانا، میری سَعادَت دونوں جہان کی ہے، اور اپنے فِدوی کو سَرفَراز کیا۔ مَیں نِثار ہونے کو تیّار ہوں، کِسُو صورت میں جان مال سے دَریغ نہ کروں گا، آپ شَوق سے آرام فرمائیے، اب کوڑی بھر خطرہ نہیں۔ یہ مُردار کُٹنی اگر سلامت جاتی، تو آفت لاتی۔ اب جب تلک مِزاجِ شریف چاہے، بیٹھے رہیے اور جو کچھ دَرکار ہو، اِس خانہ زاد کو کہیے؛ سب حاضر کرے گا۔ اور بادشاہ تُو کیا چیز ہے، تمھاری خبر فرِشتے کو بھی نہ ہوگی۔ اُس جواں مرد نے ایسی ایسی باتیں تسلّی کی کہیں کہ ٹک خاطِر جمع ہوئی، تب میں نے کہا: شاباش! تم بڑے مرد ہو! اِس مُرَوَّت کا عِوَض ہم سے بھی جب ہو سکے گا، تب ظُہور میں آوے گا۔ تمھارا نام کیا ہے؟ اُس نے کہا: غُلام کا اِسْم بہزاد خاں ہے۔ غَرَض چھ مہینے تک جتنی شرطِ خدمت کی تھی، بہ جان و دِل بجا لایا، خوب آرام سے گُزری۔

ایک دن مجھے اپنا مُلک اور ماں باپ یاد آئے، اِس لیے نہایَت مُتَفَکِّر بیٹھا تھا۔ میرا چہرہ مَلِین دیکھ کر، بہزاد خاں رُو بہ رُو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اِس فِدوی سے اگر کچھ تقصیر چَرَن بَرداری میں واقع ہوئی ہو، تو اِرشاد ہو۔ میں نے کہا: اَز بَرائے خُدا یہ کیا مذکور ہے! تم نے ایسا سُلوک کیا کہ اِس شہر میں ایسے آرام سے رہے جیسے اپنی ماں کے پیٹ میں کوئی رہتا ہے۔ نہیں تو یہ ایسی حرکت ہم سے ہوئی تھی کہ تِنکا تِنکا ہمارا دُشمن تھا۔ ایسا

دوست ہمارا کون تھا کہ ذرا[۱] دَم لیتے۔ خُدا تمھیں خوش رکھے، بڑے مرد ہو۔ تب اُس نے کہا: اگر یہاں سے دِل، بَرداشتہ[۲] ہوا ہو تو جہاں حُکم ہو، وہاں خیر و عافیت سے پہنچا دوں۔ فقیر بُولا کہ اگر اپنے وَطَن تک پہنچوں، تو والدَین کو دیکھوں۔ میری تو یہ صورت ہوئی، خُدا جانے اُن کی کیا حالت ہوئی ہوگی! مَیں جس واسطے جَلا وَطَن ہوا تھا، میری تو آرزو بَر آئی؛ اب اُن کی بھی قدم بُوسی واجب ہے۔ میری خبر اُن کو کچھ نہیں کہ مُوا، یا جیتا ہے، اُن کے دل پر کیا قَلَق گزَرتا ہوگا! وُہ جواں مرد بُولا کہ بہت مُبارک ہے، چلیے۔ یہ کہہ کے، ایک راس گھوڑا تُرکی، سَو کوس چلنے والا اور ایک گھوڑی جَلد، جس کے پَر نہیں کٹے تھے لیکن شایستہ، مَلکہ کی خاطِر لایا اور ہم دونوں کو سوار کروایا۔ پھر زِرَہ بَکتَر[۳] پہِن، سِلاح باندھ، اُوپچی بَن، اپنے مَرکَب پر چڑھ بیٹھا اور کہنے لگا: غُلام آگے ہو لیتا ہے، صاحِب خاطِر جمع سے گھوڑے دَبائے ہوئے چلے آویں۔

جب شہر کے دروازے پر آیا، ایک نعرہ مارا اور تَبَر سے قُفل کو توڑا اور نگہبانوں کو ڈانٹ ڈَپَٹ کر للکارا کہ بُرچُودو[۴]! اپنے خاوِند کو جاکر کہو کہ بہزاد خاں، مَلکۂ مہرنگار اور شہزادۂ کام گار کو، جو تمھارا داماد ہے، ہانکے پکارے لیے جاتا ہے؛ اگر مَردُمی کا کچھ نَشہ[۵] ہے، تو باہَر نکلو اور مَلکہ کو چھین لُو، یہ نہ کہیو کہ چُپ چاپ لے گیا؛ نہیں تو قلعے میں بیٹھے آرام[۶] کیا کرو۔ یہ خبر بادشاہ کو جلد جا پہنچی۔ وزیر اور میر بَخشی کو حُکم ہوا: اُن تینوں بدذات مُفسِدوں کو باندھ کر لاؤ، یا اُن کے سر کاٹ کر حُضور میں پہنچاؤ۔ ایک دَم کے بعد غَٹ[۷] فَوج کا نمُود ہُوا اور تمام زمین و آسمان گَرد[۸] باد ہو گیا۔ بہزاد خاں نے

مَلکہ کو اور اِس فقیر کو ایک دَر میں پُل کے، کہ بارہ پُلے (۱) اور جَون پور کے پُل (۲) کے برابر تھا، کھڑا کیا اور آپ گھوڑے کو ٹُنگیا کر (۳)، اُس فوج کی طرف پِھرا اور شیر کی مانند گُونج کر، مَرکَب کو ڈَپٹ کر فَوج کے درمیان گُھسا۔ تمام لشکر کائی سا پھٹ گیا اور یہ، دونوں سرداروں تلک جا پہنچا۔ دونوں کے سر کاٹ لیے۔ جب سردار مارے گئے، لشکر تِتَّر بِتَّر (۵) ہوگیا۔ وُہ کہاوت ہے: سر سے سرواہ (۶)۔ جب بیل پھوٹی، رائی رائی ہوگئی۔ وُونہیں آپ بادشاہ کتنی فَوج بَکتَر پُوشوں کی ساتھ لے کر کُمک کو آئے۔ اُن کی بھی لڑائی اُس یکّہ (۷) جوان نے مار دی، شِکَستِ فاش کھائی، بادشاہ پَس پا ہوئے۔ سچ ہے: فتح دادِ اِلٰہی ہے؛ لیکن بِہزاد خاں نے ایسی جواں مردی کی کہ شاید رُستم سے بھی نہ ہوسکتی۔

جب بِہزاد خاں نے دیکھا کہ مَطلَع صاف ہُوا، اب کون باقی رہا ہے جو ہمارا پیچھا کرے گا؛ بے وَسواس ہوکر اور خاطِر جمع کر، جہاں ہم کھڑے تھے، آیا اور مَلکہ کو اور مجھ کو ساتھ لے کر چلا۔ سفر کی عُمر کوتاہ ہوتی ہے، تھوڑے عرصے میں اپنے مُلک کی سَرحد میں جا پہنچے۔ ایک عرضی صحیح سلامت آنے کی بادشاہ کے حُضور میں، جو قبلہ گاہ مجھ فقیر کے تھے، لکھ کر روانہ کی۔ جہاں پناہ پڑھ کر شاد ہوئے، دوگانہ شُکر کا (۹) ادا کیا، جیسے سُوکھے دھان میں پانی پڑا۔ خوش ہوکر سب امیروں کو جِلَو میں لے کر، اِس عاجز کے اِستقبال کی خاطِر لَبِ دریا آکر کھڑے ہوئے اور نواڑوں کے واسطے میرِ بَحر (۱۰) کو حُکم ہوا۔ میں نے دوسرے کنارے پر سواری بادشاہ کی کھڑی دیکھی، قَدَم بُوسی کی آرزو میں گھوڑے کو

دریا میں ڈال دیا۔ ہیلہ[1] مار کر حضور میں حاضر ہوا۔ مجھے مارے اِشتیاق کے کلیجے سے لگا لیا۔

اب ایک اور آفتِ ناگہانی پیش آئی کہ جس گھوڑے پر مَیں سوار تھا، شاید وُہ بچّہ اُسی مادِیان کا تھا جس پر مَلِکہ سوار تھی، یا جِنسِیّت کے باعث؛ میرے مَرکَب کو دیکھ کر، گھوڑی نے بھی جلدی کر کر، اپنے تئیں مَلِکہ سمیت میرے پیچھے دریا میں گرایا اور پیرنے لگی۔ مَلِکہ نے گھبرا کے باگ کھینچی؛ وُہ مُنہ کی نرم تھی، اُلَٹ گئی۔ مَلِکہ[2] غوطے کھا کر، بہ مَع گھوڑی دریا میں ڈوب[3] گئی کہ پھر اُن دونوں کا نشان نظر نہ آیا۔ بہزاد خاں نے یہ حالت دیکھ کر، اپنے تئیں گھوڑے سمیت مَلِکہ کی مدد کی خاطر دریا میں پہنچایا۔ وُہ بھی اُس بھنوَر میں آگیا، پھر نکل نہ سکا۔ بہتیرے ہاتھ پانو مارے؛ کچھ بس نہ چلا، ڈوب[4] گیا۔ جہاں پناہ نے یہ وارِدات دیکھ کر، مَہا جال منگوا کر پھنکوایا اور مَلّاحوں اور غوطہ خُوروں کو فرمایا۔ اُنھوں نے سارا دریا چھان مارا، تھاہ کی مِٹّی لے لے آئے، پَر وِشّے دونوں ہاتھ نہ آئے۔ یا فُقَرا! یہ حادِثہ ایسا ہوا کہ مَیں سَودائی اور مجنُونی ہو گیا اور فقیر بن کر یہی کہتا پھرتا تھا: اِن نَینُوں[5] کا یہی بِسیکھ[*]؛ وُہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھ۔ اگر مَلِکہ کہیں غائب ہو جاتی یا مر جاتی، تو دل کو تسلّی آتی، پھر تلاش کو نکلتا یا صَبر کرتا؛ لیکن جب نظروں کے رُو بہ رُو غَرق ہو گئی، تو کچھ بَس نہ چلا۔ آخر جی میں یہی لَہر آئی کہ دریا[6] میں ڈوب جاؤں، شاید اپنے محبوب کو مر کر پاؤں۔

ایک رُوز رات کو اُسی دریا میں پیٹھا[7] اور ڈوبنے کا اِرادہ کر کر، گلے

تک پانی میں گیا۔ چاہتا ہوں کہ آگے پانو رکھوں اور غُوطہ کھاؤں؛ وُہی سوارِ بُرقَع پُوش[۱]، جنھوں نے تم کو بَشارَت دی ہے، آپہنچے۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دِلاسا دِیا کہ خاطِر جمع رکھ، مَلِکہ اور بہزاد خاں جیتے ہیں، تو اپنی جان ناحق[۲] کیئوں کھوتا ہے! دُنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ خُدا کی درگاہ سے مایوس مت ہو۔ اگر جیتا رہے گا، تو تیری مُلاقات اُن دونوں سے ایک نہ ایک رُوز ہو رہے گی۔ اب تو رُوم کی طرف جا۔ اَور بھی دُو[۳] دَرویشِ دِل رِیش وہاں گئے ہیں۔ اُن سے تو جب ملے گا، اپنی مُراد کو پہنچے گا۔

یا فُقَرا! بہ مُوجِبِ حُکم اپنے ہادی کے میں بھی خدمتِ[۴] شریف میں آکر حاضِر ہوا ہوں، اُمّیدِ قَوی[۵] ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے مطلب کو پہنچے۔ اِس ٹُکڑ گدا کا یہ اَحوال تھا، جو تمام کمال[۶] کہ سُنایا۔

چوتھے درویش کی سیر[1]

چوتھا فقیر اپنی سیر کی حقیقت رو رو کر اس طرح دُہرانے لگا :

قصّہ ہماری بے سروپائی کا اب سُنو ٹک اپنا دھیان رکھ کے مرا حال سب سُنو
کس واسطے مَیں آیا ہوں یہاں تک، تباہ ہو سارا بیان کرتا ہوں اِس کا سبب، سُنو

یا مُرشدَ اللہ! ذرا مُتوجّہ ہو۔ یہ فقیر، جو اِس حالت میں گرفتار ہے، چین کے بادشاہ کا بیٹا ہے۔ ناز و نعمت سے پَرورِش پائی اور بہ خوبی تربیت ہوا۔ زمانے کے بھلے بُرے سے کچھ واقف نہ تھا، جانتا تھا کہ یونہیں ہمیشہ نبھے گی۔ عین بے فکری میں یہ حادثہ رُوبہ کار ہوا کہ قبلۂ عالم، جو والِد اِس یتیم کے تھے، اُنھوں نے رِحلت فرمائی۔ جاں کَندَنی کے وقت اپنے چھوٹے بھائی کو (جو میرے چچا ہیں) بُلایا اور فرمایا کہ ہم نے تو سب مال مُلک چھوڑ کر ارادہ کوچ کا کیا؛ لیکن یہ وصیّت میری تم بجا لائیو اور بزرگی کو کام فرمائیو: جب تلک شہ زادہ، جو مالک اِس تخت و چھتر کا ہے، جوان ہو اور شعور سنبھالے اور اپنا گھر دیکھے بھالے، تم اِس کی نیابت کیجو اور سپاہ و رعیّت کو خراب نہ ہونے دیجو۔ جب وُہ بالغ ہو، اُس کو سب کچھ سمجھا بُجھا کر تخت حوالے کرنا۔ اور روشن اختر جو تمھاری بیٹی ہے، اُس سے شادی کر کے، تم سلطنت سے کِنارہ پکڑنا۔ اِس سُلوک سے بادشاہت ہمارے خاندان میں قائم رہے گی، کچھ خَلل نہ آوے گا۔ یہ کہہ کر، آپ تو جاں بہ حق تسلیم ہوئے، چچا بادشاہ ہوا

اور بَندوبَست مُلک کا کرنے لگا۔ مجھے حُکم کیا کہ زَنانے مَحَل میں رہا کرے۔ جب تک جوان نہ ہو، باہَر نہ نکلے۔

یہ فقیر چَودہ بَرَس کی عُمر تک بیگمات[٢] اور خَواصوں میں پَلا کِیا اور رکھیلا کُودا کیا۔ چچا کی بیٹی سے شادی کی خبر سُن کر شاد تھا اور اِس اُمّید پر بے فِکر رہتا اور دل میں کہتا کہ اب کوئی دن میں بادشاہت بھی ہاتھ لگے گی اور کَتخُدائی بھی ہو گی ؛ دُنیا بہ اُمّید قائم ہے۔ ایک حَبشی مُبارَک نام، کہ والِدِ مرحوم کی خدمت میں تَربیَت[۵] ہوا تھا اور اُس کا بڑا اِعتِبار تھا اور صاحِبِ شُعوُر اور نَمک حلال تھا ؛ مَیں اکثر اُس کے نَزدیک جا بیٹھتا۔ وُہ بھی مجھے بہت پیار کرتا اور میری جوانی دیکھ کر خوش ہوتا اور کہتا کہ اَلحَمدُ لِلّٰہ! اَے شاہ زادے! اب تم جوان ہوئے، اِنشاءَ اللّٰہ تعالیٰ عَن قریب تمھارا عَمو[٦] ظِلِّ سُبحانی کی نصیحت پر عَمَل کرے گا، اپنی بیٹی اور تمھارے والِد کا تخت تمھیں دے گا۔

ایک رُوز یہ اِتّفاق ہوا کہ ایک اَدنا[٧] سَہیلی نے بے گُناہ میرے تئیں ایسا طمانچہ[*] کھینچ کر مارا کہ میرے گال پر پانچوں اُنگلیوں کا نشان اُکھڑ[٩] آیا۔ مَیں رُوتا ہوا مُبارَک کے پاس گیا۔ اُن نے مجھے گلے[١٠] لگا لیا اور آنسو آستین سے پُونچھے اور کہا کہ چلو آج تمھیں بادشاہ پاس لے چلوں ؛ شاید دیکھ کر مِہربان ہو اور لائق سمجھ کر، تمھارا حَق[١١] تمھیں دے۔ اُسی وَقت چچا کے حُضور میں لے گیا۔ چچا نے دربار میں نہایَت شَفقَت کی اور پوچھا کہ کیُوں دِل گیر ہو، اور آج یہاں کیُوں کر آئے؟ مُبارَک بُولا کہ[١٢] کچھ عرض کرنے آئے ہیں۔ یہ سُن کر

خود بہ خود کہنے لگا کہ اب میاں کا بیاہ کر دیتے ہیں۔ مبارک نے کہا: بہت مبارک ہے۔ وُہ نہیں نجومی اور رمّالوں کو رُو بہ رُو طلب کیا اور اوپری دِل سے پوچھا کہ اِس سال کون سا مہینا اور کون سا دِن اور گھڑی مہورت مبارک ہے، کہ سرانجام شادی کا کروں۔ اُنھوں نے مرضی پاکر، گِن گِنا کر عرض کی کہ قبلۂ عالم! یہ بَرس سارا نحس ہے، کسی چاند میں کوئی تاریخ سعد نہیں ٹھہرتی۔ اگر یہ سال تمام بہ خیر و عافیت کٹے، تو آیندہ* کارِ خیر کے لیے بہتر ہے۔

بادشاہ نے مبارک کی طرف دیکھا اور کہا: شاہ زادے کو محل[1] میں لے جا؛ خُدا چاہے تو اِس سال کے گزرنے سے، اِس کی امانت اِس کے حوالے کر دوں گا؛ خاطر جمع رکھے اور پڑھے لکھے۔ مبارک نے سلام کیا اور مجھے ساتھ لیا، محل[2] میں پہنچا دیا۔ دو تین دن کے بعد میں مبارک کے پاس گیا، مجھے دیکھتے ہی رونے لگا۔ میں حیران ہوا اور پوچھا کہ دادا! خیر تو ہے؟ تمھارے رونے کا کیا باعث ہے؟ تب وہ خیر خواہ (کہ مجھے دل و جان سے چاہتا تھا) بولا کہ میں اُس روز تمھیں اُس ظالم کے پاس لے گیا؛ کاشکے اگر یہ جانتا تو نہ لے جاتا۔ میں نے گھبرا کر کہا: میرے جانے میں کیا ایسی قباحت ہوئی، کہو تو صحیح*! تب اُس نے کہا کہ سب امیر وزیر، ارکانِ دولت چھوٹے بڑے تمھارے باپ کے وقت کے تمھیں دیکھ کر خوش ہوئے اور خُدا کا شکر کرنے لگے کہ اب ہمارا صاحب زادہ جوان ہوا اور سلطنت کے لائق ہوا؛ اب کوئی دن میں حق[3] حق دار کو ملے گا، تب ہماری قدر دانی کرے گا اور خانہ زاد[4] موروثیوں کی قدر سمجھے گا۔ یہ خبر اُس بے ایمان کو پہنچی، اُس کی چھاتی پر سانپ پھر گیا، مجھے خلوت میں

بُلا کر کہا: اَے مُبارَک! اب ایسا کام کر کہ شہ زادے کو کِسُو فریب[*] سے مار ڈال اوٗر[۱] اُس کا خطرہ میرے جی سے نکال، جو میری خاطر جمع ہو۔ تب سے مَیں بے حَواس[۲] ہو رہا ہوں کہ تیرا چچا تیری جان کا دشمن ہوا۔ جُونہیں مُبارَک سے یہ خبرِ نامُبارَک میں نے سُنی، بَغیر مارے مر گیا اور جان کے ڈر سے اُس کے پانو پر گر پڑا، کہ واسطے خُدا کے! مَیں سلطنت سے گُزرا، کِسُو طرح میرا جی بچے! اُس غُلامِ باوَفا نے میرا سر اُٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور جواب دیا کہ کچھ خطرہ نہیں، ایک[۳] تدبیر مجھے سوجھی ہے؛ اگر راست آئی، تو کچھ پرواہ[۴] نہیں۔ زندگی ہے تو سب کچھ ہے۔ اَغلَب ہے کہ اِس فِکر سے تیری جان بھی بچے اور اپنے مطلب سے کام یاب ہو۔

یہ بھروسا دے کر، مجھے ساتھ لے کر؛ اُس جگہ جہاں بادشاہِ مَغفور، یعنے والد اِس فقیر کے سوتے بیٹھتے تھے، گیا اور میری بہت خاطر جمع کی۔ وہاں ایک کُرسی بچھی تھی۔ ایک طرف مجھے کہا اور ایک طرف آپ پکڑ کر صَندَلی کو سَرکایا اور کُرسی کے تلے کا فرش اُٹھایا اور زمین کو کھودنے لگا۔ ایک بارگی ایک کھڑکی نمود ہوئی کہ زنجیر اور قُفل اُس[۶] میں لگا ہے۔ مجھے بُلایا۔ مَیں اپنے دل میں مُقرّر یہ سمجھا[۸] کہ میرے ذَبح[۷] کرنے اور گاڑ دینے کو یہ گڑھا اِس[۸] نے کھودا ہے، مَوت آنکھوں کے آگے پھر گئی؛ لاچار چُپکے چُپکے کَلِمہ[۹] پڑھتا ہوا نزدیک گیا۔ دیکھتا ہوں تو اُس دَریچے کے اندر عمارت ہے اور چار مکان ہیں۔ ہر ایک دالان میں دس دس خُمیں[۱۰]، سونے کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی لٹکتی ہیں اور ہر ایک گولی کے مُنہ پر ایک سونے کی اینٹ اور ایک بندر جڑاؤ کا بنا ہوا

بیٹھا ہے۔ اُنتالیس گُوریاں چاروں مکان میں گِنیں۔ اور ایک خُم کو دیکھا کہ مُونہا مُونہ (۲) اَشرفیاں بھری ہیں، اُس پر نہ مَیمُوں ہے نہ خِشت ہے۔ اور ایک حَوض جَواہِر سے لَبالَب بھرا ہوا دیکھا۔ میں نے مُبارَک سے پوچھا کہ اَے دادا! یہ کیا طِلِسم ہے اور کس کا مکان ہے اور یہ کس کام کے ہیں؟ بُولا کہ یہ بُوزنے جو دیکھتے ہو، اِن کا یہ ماجرا ہے کہ تمھارے باپ نے جوانی کے وقت سے مَلِکِ صادِق (جو بادشاہ جنوں (۳) کا ہے) اُس کے ساتھ دُوستی اور آمد و رَفت پَیدا کی تھی (۴)؛ چُناں چہ ہر سال میں ایک دَفعہ کئی طَرح کی تُحفہ خوش بوئیں اور اِس مُلک کی سَوغاتیں لے جاتے اور ایک مہینے کے قریب اُس کی خدمت میں رہتے۔ جب رُخصت ہوتے، تو مَلِکِ صادِق ایک بندر زُمرّد کا دیتا۔ ہمارا بادشاہ اُسے لاکر اِس تہ خانے میں رکھتا۔ اِس بات سے سِوائے میرے کوئی دوسرا مُطَّلَع نہ تھا۔

ایک مرتبہ غُلام نے عرض کی کہ جہاں پناہ لاکھوں روپَے (۵) کے تُحفے لے جاتے ہیں اور وہاں سے ایک بُوزنہ (*) پتھّر کا مُردہ آپ لے آتے ہیں، اِس کا آخر فائدہ کیا ہے؟ جواب (۶) میری اِس بات کا مُسکرا کر فرمایا: خبردار! کہیں ظاہر نہ کیجو، خبر شرط ہے! یہ ایک مَیمُونِ (۷) بے جان، جو تُو دیکھتا ہے، ہر ایک کے ہزار دِیوِ (۸) زبردست تابِع اور فرماں بَردار ہیں؛ لیکن جب تلک میرے پاس چالیسوں بندر پورے جمع نہ ہووِیں، تب تک یہ سب نِکمّے ہیں، کچھ کام نہ آدیں گے۔ سو ایک بندر کی کمی تھی کہ اُسی بَرس بادشاہ نے وَفات پائی۔ اِتنی محنت کچھ نیک (*) نہ لگی، اُس کا فائدہ ظاہر نہ ہوا۔ اَے

شاہ زادے! تیری یہ حالت بے کسی کی دیکھ کر مجھے یاد آیا اور یہ جی میں ٹھہرایا کسو طرح تجھ کو مَلِکِ[1] صادِق کے پاس لے چلوں اور تیرے چچا کا ظلم بیان کروں۔ غالب ہے کہ وہ، دوستی تمھارے باپ کی یاد کر کر، ایک توزنہ جو باقی ہے، تجھے دے۔ تب اُن کی مدد سے تیرا مُلک تیرے ہاتھ آوے اور چین، ماچین[2] کی سلطنت تو بہ خاطر[3] جمع کرے، اور بالفعل اِس حرکت سے تیری جان بچتی ہے۔ اگر اَور کچھ نہ ہوا، تو اِس ظالم کے ہاتھ سے، سوائے اِس تدبیر کے اور کوئی صورت مُخلِصی کی نظر نہیں آتی۔ میں نے اُس کی زبانی یہ سب کیفیت[7] سُن کر کہا کہ دادا جان! اب تو میری جان کا مختار ہے، جو میرے حق[9] میں بھلا ہو، سو کر۔ میری تسلّی کر کے؛ آپ عطر اور بخور اور جو کچھ وہاں کے لے جانے کی خاطر مناسب جانا، خرید کرنے بازار میں گیا۔

*

دوسرے دن میرے اُس کافر چچا کے پاس (جو بجائے اَبوجہل کے تھا) گیا اور کہا: جہاں پناہ! شہ زادے کے مار ڈالنے کی ایک صورت میں نے دل میں ٹھہرائی ہے؛ اگر حکم ہو تو عرض کروں۔ وہ کم بخت خوش ہو کر بولا: وہ کیا تدبیر ہے؟ تب مُبارک نے کہا کہ اِس کے مار ڈالنے میں سب طرح آپ کی بدنامی ہے، مگر میں اِسے باہر جنگل میں لے جا کر ٹھکانے لگاؤں اور گاڑ داب کر چلا آؤں، ہرگز کوئی محرم نہ ہوگا کہ کیا ہوا۔ یہ بندش مُبارک سے سُن کر بولا کہ بہت مُبارک، میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ سلامت نہ رہے۔ اِس کا دَغدغہ میرے دل میں ہے؛ اگر مجھے اِس فکر سے تو چھڑاوے گا، تو اِس خدمت کے[11] عوض بہت کچھ پاوے گا۔ جہاں تیرا جی چاہے،

نے جاکر کھپا[۲] دے اور مجھے یہ خوش خبری لادے[۳]۔

مُبارک نے بادشاہ کی طرف سے اپنی دِل جمعی[۴] کر کے، مجھے ساتھ لیا اور دِشّے تحفے لے کر، آدھی رات کو شہر سے کوچ کیا اور اُتر کی سمت چلا۔ ایک مہینے تلک بہم چلا گیا[۶]۔ ایک رُوز رات کو چلے جاتے تھے جو مُبارک بُولا کہ شُکر خُدا کا، اب منزلِ مقصود کو پہنچے۔ میں نے سُن کر کہا کہ دادا! یہ تو نے کیا کہا؟ کہنے لگا: اَے شہ زادے! جنُوں کا لشکر کیا نہیں دیکھتا؟ میں نے کہا: مجھے تیرے سِوا اَور کچھ نظر نہیں آتا۔ مُبارک نے ایک سُرمے دانی نکال کر، سُلیمانی سُرمے کی سَلائیاں میری دونوں آنکھوں میں پھیر دیں؛ وُونہیں جنُوں کی خِلقت اور لشکر کے تنبو قنات نظر آنے لگے؛ لیکن سب خوش رُو اور خوش لِباس۔ مُبارک کو پہچان کر، ہر ایک آشنائی کی راہ سے گلے[۱۰] ملتا اور مزاخیں[۱۱] کرتا۔

آخر جاتے جاتے بادشاہی سَراچوں کے نزدیک گئے اور بارگاہ میں داخل ہوئے۔ دیکھتا ہوں تو روشنی قرینے سے روشن ہے اور صندلیاں طرح بہ طرح کی دو رُویہ بچھی ہیں اور عالِم، فاضِل، دَرویش اور امیر، وزیر، میر بخشی، دیوان اُن پر بیٹھے ہیں۔ اور یساول، گُرز بَردار[۱۲]، اَحدی*، چیلے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ اور درمیان میں ایک تختِ مُرصّع کا بچھا ہے، اُس پر مَلِکِ صادِق، تاج اور چارقُب موتیوں کی پہنے ہوئے، مسند پر تکیے لگائے، بڑی شان شوکت[۱۳] سے بیٹھا ہے۔ میں نے نزدیک جاکر سلام کیا۔ مہربانگی سے بیٹھنے کا حُکم کیا[۱۴]۔ پھر[۱۵] کھانے کا چرچا ہوا۔ بعد فراغت

کے دسترخوان بڑھایا گیا، تب مبارک کی طرف متوجہ ہوکر احوال میرا پوچھا۔ مبارک نے کہا کہ اب اِن کے باپ کی جگہ پر چچا اِن کا بادشاہت کرتا ہے اور اِن کا دشمنِ جانی ہوا ہے؛ اِس لیے مَیں انھیں وہاں سے لے بھاگ کر، آپ کی خدمت میں لایا ہوں، کہ یتیم ہیں اور سلطنت اِن کا حق ہے؛ لیکن بغیر مربّی کسو سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ حضور کی دست گیری کے باعث اِس مظلوم کی پرورش ہوتی ہے۔ اِن کے باپ کی خدمت کا حق یاد کر کے، اِن کی مدد فرمائیے اور وہ چالیسواں بندر عنایت کیجیے، جو چالیسوں پورے ہوں اور یہ اپنے حق کو پہنچ کر، تمھارے جان و مال کو دعا دیں۔ سِوائے صاحب کی پناہ کے، کوئی اِن کا ٹھکانا نظر نہیں آتا۔

یہ تمام کیفیت سن کر، ملک صادق نے تامّل کر کے کہا کہ واقعی حقوقِ خدمت اور دوستی بادشاہِ مغفور کے ہمارے اوپر بہت تھے اور یہ بچارا تباہ ہوکر، اپنی سلطنتِ موروثی چھوڑ کر، جان بچانے کے واسطے یہاں تلک آیا ہے اور ہمارے دامنِ دولت میں پناہ لی ہے؛ تا مقدور کسو طرح ہم سے کمی نہ ہوگی اور درگذر نہ کروں گا۔ لیکن ایک کام ہمارا ہے؛ اگر وہ اِس سے ہو سکا اور خیانت نہ کی اور بہ خوبی انجام دیا اور اِس اِمتحان میں پورا اُترا؛ تو مَیں قول قرار کرتا ہوں کہ زیادہ بادشاہ سے سلوک کروں گا اور جو یہ چاہے گا، سو دوں گا۔ مَیں نے ہاتھ باندھ کر اِلتماس کیا کہ اِس فدوی سے تا بہ مقدور جو خدمت سرکار کی ہو سکے گی، بہ سر و چشم بجا لاؤں گا اور اُس کو

بہ خوبی و دیانت داری اور ہوشیاری سے کرے گا اور اپنی سعادت دونوں جہان کی سمجھے گا۔ فرمایا کہ تو ابھی لڑکا ہے، اِس واسطے بار بار تاکید کرتا ہوں۔ مبادا خیانت کرے اور آفت میں پڑے۔ میں نے کہا: خدا، بادشاہ کے اِقبال سے آسان کرے گا اور میں حتی المقدور کوشش کروں گا اور امانت حضور تک لے آؤں گا۔

یہ سن کر، ملکِ صادق نے مجھ کو قریب بلایا اور ایک کاغذ، دستگی سے نکال کر، میرے تئیں دِکھلایا اور کہا: یہ جس شخص کی شبیہ ہے؛ اُسے، جہاں سے جانے، تلاش کر کے میری خاطر پیدا کر کے لا۔ اور جس گھڑی تو اُس کا نام و نشان پاوے اور سامھنے جاوے، میری طرف سے بہت اِشتیاق ظاہر کیجو۔ اگر یہ خدمت تجھ سے سرانجام ہوئی؛ تو جتنی توقّع تجھے منظور ہے، اُس سے زیادہ غور پرداخت کی جائے گی۔ وَاِلّا نہ، جیسا کرے گا، ویسا پاوے گا۔

میں نے اُس کاغذ کو جو دیکھا، ایک تصویر نظر پڑی کہ غش سا آنے لگا۔ بہ زور، مارے ڈر کے اپنے تئیں سنبھالا اور کہا: بہت خوب، مَیں رخصت ہوتا ہوں؛ اگر خدا کو میرا بھلا کرنا ہے، تو بہ موجِب حکمِ حضور کے مجھ سے عمل میں آوے گا۔ یہ کہہ کر، مبارک کو ہمراہ لے کر، جنگل کی راہ لی۔ گانو گانو، بستی بستی، شہر شہر، ملک ملک پھرنے لگا اور ہر ایک سے اُس کا نام و نشان تحقیق کرنے۔ کِسو نے نہ کہا کہ ہاں مَیں جانتا ہوں، یا کسی سے مذکور سنا ہے۔ سات برس تک اُسی عالم میں حیرانی و پریشانی سہتا ہوا،

ایک نگر میں وارد ہوا۔ عمارتِ(۱) عالی اور آباد، لیکن وہاں کا ہر ایک مُتنفّس اِسمِ اَعظم پڑھتا تھا اور خُدا کی عِبادت، بندگی کرتا تھا۔

ایک اَندھا ہندوستانی فقیر بھیک مانگتا نظر آیا، لیکن کِسو نے ایک کوڑی یا ایک نِوالہ نہ دیا۔ مجھے تعجّب آیا اور اُس کے اوپر رَحم کھایا؛ جیب(۲) میں سے ایک اَشرفی نکال کر اُس کے ہاتھ(۳) دی۔ وُہ لے کر بُولا کہ اَے داتا! خُدا تیرا بھلا کرے، تُو شاید مُسافِر ہے، اِس شہر کا باشندہ نہیں۔ میں نے کہا: فی الواقع سات بَرس سے مَیں تباہ ہُوا ہوں۔ جس کام کو نکلا ہوں، اُس کا سُراغ نہیں مِلتا، آج اِس بلدے(۴) میں آ پہنچا ہوں۔ وُہ بوڑھا دُعائیں دے کر چلا، مَیں اُس کے پیچھے لگ لیا۔ باہر شہر کے ایک مکانِ(۵) عالی شان نظر آیا؛ وُہ اُس کے اندر گیا، مَیں بھی چلا۔ دیکھا تو جا بہ جا عمارت گر پڑی ہے اور بے مَرَمّت ہو رہی ہے۔

میں نے دل میں کہا کہ یہ محل(۶) لائق بادشاہوں کے ہے۔ جس وقت تیّاری اِس کی ہوگی، کیا ہی مکانِ(۷) دِل چسپ بنا ہوگا! اور اب تُو ویرانی سے کیا صورت بَن رہی ہے! پَر معلوم نہیں کہ اُجاڑ کیُوں پڑا ہے اور یہ نابینا اِس محلؔ میں کیُوں بَستا ہے! وُہ کُور لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا جاتا تھا کہ ایک آواز آئی، جیسے کوئی کہتا ہے کہ اَے باپ! خَیر تُو ہے، آج سویرے کیُوں پھِرے آتے ہو؟ پِیر مرد نے سُن کر جواب دیا کہ بیٹی! خُدا نے ایک جوان مُسافِر کو میرے اَحوال پر مہربان کیا، اُس نے ایک مُہر مجھ کو دی۔ بہت دِنوں سے پیٹ بھر کر اچھّا کھانا نہ کھایا تھا؛ سو گوشت، مَصالحؔ*، گھی، تیل،

آٹا، نون مول لیا۔ اور تیری خاطر کپڑا، جو ضرور تھا، خرید کیا۔ اب اِس کو
قطع کر اور سی کر پہن۔ اور کھانا پکا، تو کھا پی کے اُس سخی کے حق میں دعا دیں۔
اگرچہ مطلب اُس کے دل کا معلوم نہیں، پر خدا دانا بینا ہے، ہم بے کسوں
کی دعا قبول کرے۔

میں نے یہ احوال اُس کی فاقہ کشی کا جو سنا، بے اختیار جی میں آیا
کہ بیس اشرفیاں اور اُس کو دوں؛ لیکن آواز کی طرف دھیان جو گیا، تو
ایک عورت دیکھی کہ ٹھیک وہ تصویر اُسی معشوق کی تھی۔ تصویر کو نکال کر مقابل
کیا، سر مو تفاوت نہ دیکھا۔ ایک نعرہ دل سے نکلا اور بے ہوش ہوا۔
مبارک میرے تئیں بغل میں لے کر بیٹھا اور پنکھا کرنے لگا۔ مجھ میں ذرا سا
ہوش آیا۔ اُسی کی طرف تاک رہا تھا، جو مبارک نے پوچھا کہ تم کو کیا ہو گیا؟
ابھی منہ سے جواب نہیں نکلا، وہ نازنین بولی کہ اے جوان! خدا سے ڈر
اور بیگانے ستر پر نگاہ مت کر، حیا اور شرم سب کو ضرور ہے۔ اِس لیاقت
سے گفتگو کی کہ میں اُس کی صورت اور سیرت پر محو ہو گیا۔ مبارک میری خاطر داری
بہت سی کرنے لگا، لیکن دل کی حالت کی اُس کو کیا خبر تھی۔ لاچار ہو کر میں
پکارا کہ اے خدا کے بندو اور اِس مکان کے رہنے والو! میں غریب مسافر
ہوں؛ اگر اپنے پاس مجھے بلاؤ اور رہنے کو جگہ دو، تو بڑی بات ہے۔
اُس اندھے نے نزدیک بلایا اور آواز پہچان کر گلے لگایا اور جہاں وہ
گل بدن بیٹھی تھی، اُس مکان میں لے گیا۔ وہ ایک کونے میں چھپ گئی۔
اُس بوڑھے نے مجھ سے پوچھا کہ اپنا ماجرا کہہ، کہ کیوں گھر بار چھوڑ کر اکیلا

پڑا پھرتا ہے اور تجھے کس کی تلاش ہے ؟ میں نے مَلکِ صادِق کا نام نہ لیا اور وہاں کا کچھ ذِکر مذکوُر نہ کیا، اِس طَور سے کہا کہ یہ بے کَس، شہ زادہ چین و ماچین کا ہے، چُناں چِہ میرے وَلی نعمت ہنوز بادشاہ ہیں۔ ایک سَوداگر سے لاکھوں روپئے دے کر یہ تصویر مُول لی تھی۔ اِس کے دیکھنے سے سب ہوش آرام جاتا رہا اور فقیر کا بھیس کر کر تمام دُنیا چھان ماری۔ اب یہاں میرا مطلب مِلا ہے، سُو تمھارا اِختیار ہے۔

یہ سُن کر اندھے نے ایک آہ ماری اور بُولا: اَے عزیز! میری لڑکی بڑی مصیبت میں گرِفتار ہے۔ کِسو بَشَر کی مجال نہیں کہ اِس سے نِکاح کرے اور پَھل پاوِے۔ میں نے کہا: اُمّید وار ہوں کہ مُفَصَّل بیان کرو۔ تب اُس مردِ عَجَمی نے اپنا ماجرا اِس طَور سے ظاہر کِیا کہ سُن اَے بادشاہ زادے! مَیں رئیس اور اَکابِر اِس کم بَخت شہر کا ہوں۔ میرے بُزُرگ نام آور اور عالی خاندان تھے۔ حق تعالیٰ نے یہ بیٹی مجھے عِنایَت کی۔ جب بالغ ہوئی، تو اِس کی خوب صورتی اور نَزاکت اور سلیقے کا شُور ہوا اور سارے مُلک میں مشہور ہوا کہ فُلانے کے گھر میں ایسی لڑکی ہے کہ اُس کے حُسن کے مُقابِل حور، پری شرمندہ ہے؛ انسان کا تو کیا مُنہ ہے کہ بَرابَری کرے۔ یہ تعریف اِس شہر کے شہزادے نے سُنی۔ غائبانہ، بَغَیر دیکھے بھالے عاشق ہوا۔ کھانا پینا چھوڑ دیا، اَٹھوائی کھٹوائی لے کر پڑا۔

آخر بادشاہ کو یہ بات معلوم ہوئی۔ میرے تئیں رات کو خِلوَت میں بُلایا اور یہ مذکوُر درمیان میں لایا اور مجھے باتوں میں پھُسلایا، حتّیٰ کہ نِسبت ناتا

کرنے میں راضی کیا۔ مَیں بھی سمجھا کہ جب بیٹی گھر میں پیدا ہوئی، تو کِسُو نہ کِسُو سے بیاہا ہی چاہیے؛ پس اِس سے کیا بہتر ہے کہ بادشاہ زادے سے منسوب کردوں، اِس میں بادشاہ بھی منّت دار ہوتا ہے۔ مَیں قبول کرکے رُخصت ہوا۔ اُسی دن سے دونوں طرف تیاری بیاہ کی ہونے لگی۔ ایک رُوز اچھی ساعت میں قاضی، مُفتی، عالم، فاضل، اکابر سب جمع ہوئے؛ نکاح باندھا گیا اور مَہر مُعیّن ہوا۔ دُلہن کو بڑی دھوم دھام سے لے گئے، سب رَسم رُسومات کرکے فارغ ہوئے۔ نوشہ نے رات کو جب قصدِ جماع کا کیا، اُس مکان میں ایک شورغُل ایسا ہوا کہ جو باہر لوگ چوکی میں تھے، حیران ہوئے۔ دروازہ کوٹھری کا کھول کر چاہا دیکھیں کہ یہ کیا آفت ہے؛ اندر سے ایسا بند تھا کہ کواڑ کھول نہ سکے۔ ایک دم میں وہ رُونے کی آواز بھی کم ہوئی۔ پَٹ کی چول اُکھاڑ کر دیکھا، تو دولہا سرکٹا ہوا پڑا تڑپھتا ہے اور دُلہن کے مُنہ سے کف چلا جاتا ہے اور اُسی مٹّی، لہو میں لتھڑی ہوئی بے حواس پڑی لوٹتی ہے۔

یہ قیامت دیکھ کر سب کے ہوش جاتے رہے۔ ایسی خوشی میں یہ غم ظاہر ہوا۔ بادشاہ کو خبر پہنچی، سر پیٹتا ہوا دَوڑا۔ تمام اَرکان سلطنت کے جمع ہوئے، پر کِسُو کی عقل کام نہیں کرتی کہ اِس اَحوال کو دریافت کرے۔ نہایت کو، بادشاہ نے اُس قلق کی حالت میں حُکم کیا کہ اِس کم بخت، بھونڈ پیری دُلہن کا بھی سر کاٹ ڈالو۔ یہ بات بادشاہ کی زبان سے جوں نہیں نکلی، پھر ویسا ہی ہنگامہ برپا ہوا۔ بادشاہ ڈرا اور اپنی جان کے خطرے سے نکل

بھاگا اور فرمایا کہ اسے[۱] محل[۲] سے باہر نکال دو۔ خواصوں[۳] نے اِس لڑکی کو میرے گھر میں پہنچا دیا۔ یہ چرچا دُنیا میں مشہور ہوا۔ جِن نے سُنا، حَیران ہوا۔ اور شہ زادے کے مارے جانے کے سبب سے، خود بادشاہ اور جتنے باشندے اِس شہر کے ہیں، میرے[۴] دُشمنِ جانی ہوئے۔

جب ماتَم داری سے فَراغَت ہوئی اور چہلُم ہو چکا، بادشاہ نے اَرکانِ دَولت سے صَلاح پوچھی کہ اب کیا کیا چاہیے۔ سبھوں نے کہا: اَور تو کچھ ہو نہیں سکتا، پَر ظاہِر میں دل کی تسلّی اور صَبر کے واسطے، اُس لڑکی کو اُس کے باپ سَمیت مَروا ڈالیے اور گھر بار ضَبط[۵] کر لیجیے۔ جب میری یہ سزا مُقرّر کی، کوتوال کو حُکم ہوا۔ اُس نے آکر چاروں طرف سے میری حَویلی کو گھیر لیا اور نرسنگا[۶] دروازے پر بجایا اور چاہا کہ اندر گُھسیں اور بادشاہ کا حُکم بجا لاویں؛ غَیب سے اینٹ پتھر ایسے برسنے لگے کہ تمام فوج تاب نہ لا سکی؛ اپنا سر، مُنہ بچا کر جِدھر تِدھر[۸] بھاگی۔ اور ایک آوازِ مُہیب بادشاہ نے محل[۹] میں اپنے کانوں[۱۰] سُنی کہ کیوں کم بَختی آئی ہے! کیا شیطان لگا ہے؟ بھلا چاہتا ہے تو اُس نازنیں کے اَحوال کا مُتعَرِض نہ ہو؛ نہیں تو جو کچھ تیرے بیٹے نے اُس سے شادی کر کر دیکھا، تو بھی[۱۱] اُس کی دُشمنی سے دیکھے گا۔ اب اگر اُن کو ستاوے گا، تو مزا[۱۲] پاوے گا۔

بادشاہ کو مارے دَہشَت کے تَپ چڑھی[۱۳]، وونہیں حُکم کیا کہ اِن بدبختوں سے کوئی مُزاحِم نہ ہو؛ کچھ کہو نہ سُنو، حَویلی میں پڑا رہنے دو، زور ظُلم[۱۴] اِن پر نہ کرو۔ اُس دِن سے عامِل، باد بتاس جان کر، دُعا تعویذ[۱۵] اور سیانے، جنتر منتر کرتے ہیں۔

اور سب باشندے اِس شہر کے اِسمِ اَعظَم اور قرآنِ مجید پڑھتے ہیں۔ مُدّت سے یہ تماشا ہو رہا ہے، لیکن اب تک کچھ اِسرار* معلوم نہیں ہوتا اور مجھے بھی ہرگز اِطّلاع نہیں؛ مگر اِس لڑکی سے ایک بار پوچھا کہ تم نے اپنی آنکھوں سے کیا دیکھا تھا؟ یہ بولی کہ اَور تو کچھ مَیں نہیں جانتی، لیکن یہ نظر آیا کہ جس وقت میرے خاوند نے قصدِ مُباشَرت کا کیا؛ جھٹ پٹ کر ایک تخت مُرَصَّع کا نکلا، اُس پر ایک جوانؔ خوب صورت شاہانہ لباس پہنے بیٹھا تھا اور ساتھ بہت سے آدمی اِہتمام کرتے ہوئے اُس مکان میں آئے اور شہ زادے کے قتل کے مُستَعِد ہوئے۔ وُہ شخص سردار میرے نزدیک آیا اور بولا: کیوں جانی! اب ہم سے کہاں بھاگو گی! اُن کی صورتیں آدمی کی سی تھیں، لیکن پانو بکریوں کے سے نظر آئے۔ میرا کلیجا دھڑکنے لگا اور خوف سے غَش میں آگئی۔ پھر مجھے کچھ سُدھ نہیں کہ آخر کیا ہوا۔ تب سے میرا یہ اَحوال ہے کہ اِس پھوٹے مکان میں ہم دونوں جی پڑے رہتے ہیں۔ بادشاہ کے غُصّے کے باعث اپنے رفیق سب جُدا ہو گئے۔ اور مَیں گدائی کرنے جو نکلتا ہوں، تو کوئی کوڑی نہیں دیتا، بلکہ دُکان* پر کھڑے رہنے کے رَوادار نہیں۔ اِس کم بخت لڑکی کے بدن پر لتّا نہیں کہ سَتر چھپاوے، اور کھانے کو مُیَسَّر نہیں جو پیٹ بھر کھاوے۔ خُدا سے یہ چاہتا ہوں کہ موت ہماری آوے، یا زمین پھاٹے اور یہ ناشُدَنی سماوے۔ اِس جینے سے مرنا بھلا ہے۔ خُدا نے شاید ہمارے ہی واسطے تجھے بھیجا ہے، جو تو نے رَحم کھا کر ایک مُہر دی۔ کھانا بھی مزے دار پکا کر کھایا اور بیٹی کی خاطر کپڑا بھی بنایا۔ خُدا کی درگاہ میں شُکر کیا اور تجھے دُعا دی۔

اگر اِس پر آسیب جِنؒ یا پَری کا نہ ہوتا، تو تیری خدمت میں لونڈی کی جگہ دیتا اور اپنی سَعادت جانتا۔ یہ اَحوال اِس عاجز کا ہے۔ تُو اِس کے دَرپَے مت ہو اور اِس قَصد سے درگُزر۔

یہ سب ماجرا سُن کر، میں نے بہت مِنّت و زاری کی کہ مجھے اپنی فَرزندی میں قُبول کر؛ جو میری قسمت میں بَدا ہوگا، سُو ہوگا۔ وُہ پیرِ مرد ہرگز راضی نہ ہوا۔ شام جب ہوئی، اُس سے رُخصت ہوکر سَرا میں آیا۔ مُبارَک نے کہا: تُو شہ زادے مُبارَک ہو! خُدا نے اَسباب تُو دُرُست کیا ہے۔ بارِے یہ محنت اَکارَت نہ گئی۔ میں نے کہا: آج کتنی خوشامد کی، پَر وُہ اندھا بے ایمان راضی نہیں ہوتا! خُدا جانے دیوے گا یا نہیں! پَر میرے دل کی یہ حالت تھی کہ رات کاٹنی مُشکل ہوئی، کہ کب صُبح ہو تو پھر جاکر حاضِر ہوں۔ کبھو یہ خیال آتا تھا: اگر وُہ مِہربان ہو اور قُبول کرے، تو مُبارَک، مَلِکِ صادِق کی خاطِر لے جائے گا۔ پھر کہتا: بھلا ہاتھ تُو آوے، مُبارَک کو مَنا دَنا کر مَیں عَیش کروں گا۔ پھر جی میں یہ خطرہ آتا کہ اگر مُبارَک بھی قُبول کرے، تو جِنُوںؒ کے ہاتھ سے وُہیؒ نَوبت میری ہوگی، جو بادشاہ زادے کی ہوئی۔ اور اِس شہر کا بادشاہ کب چاہے گا کہ اُس کا بیٹا مارا جائے، اور دوسرا خوشی منائے۔

تمام رات نیند اُچاٹ ہوگئی اور اِسی منصوبے کے اُدھیڑ بُن میں کٹی۔ جب رُوز(۴) روشن ہوا، مَیں چلا۔ چَوک میں سے اچھے اچھے تھان پُوشاکی اور گوٹا کناری اور میوہ(۵) خُشک و تَر خرید کرکے، اُس بُزُرگ کی خدمت میں حاضِر ہوا۔

نہایت خوش ہوکر بولا کہ سب کو اپنی جان سے زیادہ کچھ عزیز نہیں ؛ پَر اگر میری جان بھی تیرے کام آوے، تو دریغ نہ کروں اور اپنی بیٹی ابھی تیرے حوالے کروں؛ لیکن یہی خوف آتا ہے کہ اِس حرکت سے تیری جان کو خطرہ نہ ہو، کہ یہ داغ لعنت کا میرے اوپر تا قیامت رہے۔ میں نے کہا : اب اِس بستی میں بے کس واقع ہوں، اور تم میرے دین دُنیا کے باپ ہو۔ مَیں اِس آرزو میں مُدّت سے کیا کیا تباہی اور پَریشانی کھینچتا ہوا اور کیسے کیسے صدمے اُٹھاتا ہوا یہاں تک آیا اور مطلب کا بھی سُراغ پایا، خُدا نے تمھیں بھی مہربان کیا جو بیاہ دینے پر رضامند ہوئے؛ لیکن میرے واسطے آگا پیچھا کرتے ہو۔ ذرا مُنصِف ہوکر غور فرماؤ تو، عشق کی تلوار سے سر بچانا اور اپنی جان کو چھپانا کس مذہب میں دُرست ہے ! ہرچہ بادا باد ! میں نے سب طرح اپنے تئیں برباد دیا ہے، معشوق کے وِصال کو مَیں زندگی سمجھتا ہوں، اپنے مرنے جینے کی مجھے کچھ پرواہ نہیں؛ بلکہ اگر نا اُمّید ہوں گا، تو بِن اَجَل مرجاؤں گا اور تمھارا قیامت میں دامن گیر ہوں گا۔

غَرَض اِس گُفت وشَنید اور ہاں ناںہ میں قریب ایک مہینے کے خَوف و رِجا میں گزرا۔ ہر رُوز اُس بُزرگ کی خدمت میں دَوڑا جاتا اور خوشامد برآمد کیا کرتا۔ اتّفاقاً وُہ بوڑھا کاہِلہ ہوا۔ مَیں اُس کی بیمار داری میں حاضر رہا۔ ہمیشہ قارُورَہ حکیم پاس لے جاتا۔ جو نُسخہ لکھ دیتا، اُسی ترکیب سے بنا کر پِلاتا۔ اور شُوربا اور غِذا اپنے ہاتھ سے پکا کر کوئی نِوالہ کھلایا۔ ایک دن مہربان ہوکر کہنے لگا : اَے جوان ! تو بڑا ضدّی ہے۔ میں نے ہرچند ساری قباحتیں

کہ سُنائیں، اور منع کرتا ہوں کہ اِس کام سے باز آ، جی ہے تو جہان ہے؛ بہ رَر خواہ مَخواہ کُنوئیں میں گِرا چاہتا ہے۔ اچھا آج اپنی لڑکی سے تیرا مذکوُر کروں گا، دیکھوں وُہ کیا کہتی ہے۔ یا فقیرَ اللہ! یہ خوش خبری سُن کر مَیں ایسا پھوُلا کہ کپڑوں میں نہ سَمایا، آداب بجالایا اور کہا کہ اَب آپ نے میرے جینے کی فِکر کی۔ رُخصت ہوکر مکان پر آیا اور تمام شب مُبارَک سے یہی ذِکر مَذکوُر رہا۔ کہاں کی نِیند اور کہاں کی بھوُکھ! صُبح کو نوُر کے وقت پھر جاکر مَوجود ہوا، سلام کیا۔ فرمانے لگا کہ تُو اپنی بیٹی ہم نے تم کو دی، خُدا مُبارَک کرے! تم دونوں کو خُدا کی حِفظ و اَمان میں سَونپا! جب تلک میرے دَم میں دَم ہے، میری آنکھوں کے سامھنے رہو۔ جب میری آنکھ مُند جائے گی؛ جو تمھارے جی میں آوے گا سُو کیجو، مُختار ہو۔

کِتنے دِن پیچھے وُہ مردِ بُزرگ جاں بہ حَق تسلیم ہُوا، رُو پیٹ کر تَجہیز و تکفین کیا۔ بعد تیجے کے، اُس نازنِیں کو، مُبارَک ڈوُلی کرکر کارواں سَرا میں لے آیا اور مجھ سے کہا کہ یہ اَمانت مَلِکِ صادِق کی ہے، خبردار! خیانت نہ کیجو اور یہ محنت مَشقَّت برباد نہ دیجو! میں نے کہا: اَے کاکا! مَلِکِ صادِق یہاں کہاں ہے! دل نہیں مانتا، مَیں کیونکر صَبر کروں! جو کچھ ہو سُو ہو، جیوں یا مَروں، اَب تو عَیش کرلوں۔ مُبارَک نے دِق ہوکر ڈانٹا کہ لڑکپن نہ کرو، ابھی ایک دَم میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے! مَلِکِ صادق کو دوُر جانتے ہو، جو اُس کا فرمانا نہیں مانتے ہو! اُس نے چلتے وقت پہلے ہی اُونچ نِیچ سب سمجھا دی ہے۔ اگر اُس کے کہنے پر رہوگے اور صحیح سلامت اِس کو

وہاں تک لے چلوگے؛ تو وُہ بھی بادشاہ ہے، شاید تمھاری محنت پر توجّہ کر کے تمھیں کو بخش دے، تو کیا اچھی بات ہووے۔ پیت کی پیت رہے اور میت کا میت ہاتھ لگے۔

بارے اُس کے ڈرانے اور سمجھانے سے میں حیران ہو کر چُپکا ہو رہا۔ دو سانڈنیاں خرید کیں اور کجاووں(۲) پر سوار ہو کر، مَلِکِ صادِق کے مُلک کی راہ لی۔ چلتے چلتے ایک میدان میں آواز غُل شور کی آنے لگی۔ مبارک نے کہا: شُکر خُدا کا، ہماری محنت نیک(۳) لگی، یہ لشکرِ جنوں کا آ پہنچا۔ بارے مبارک نے اُن سے مِل جُل کر پوچھا کہ کہاں کا ارادہ کیا ہے؟ وُہ بولے کہ بادشاہ نے تمھارے اِستقبال کے واسطے ہمیں تعینات(۵) کیا ہے، اب تمھارے فرماں بَردار ہیں؛ اگر کہو تو ایک دَم میں رُو بہ رُو لے چلیں۔ مبارک نے کہا: دیکھو کس کس محنتوں سے خُدا نے بادشاہ کے حُضور میں ہمیں سُرخ رُو کیا، اب جلدی کیا ضرور ہے۔ اگر خُدا نہ خواستہ کچھ خَلَل ہو جاوے، تو ہماری محنت اَکارت ہو اور جہاں پناہ کی غَضَبی(۷) میں پڑیں۔ سبھوں نے کہا کہ اِس کے تم مُختار ہو؛ جس طَرح جی چاہے، چلو۔ اگرچہ سب طَرح کا آرام تھا، پر رات دِن چلنے سے کام تھا۔

جب نزدیک جا پہنچے؛ مَیں، مبارک کو سوتا دیکھ کر، اُس نازنیں کے قدموں پر سر رکھ کر، اپنے دل کی بے قراری اور مَلِکِ صادِق کے سبب سے لاچاری نہایت مِنّت و زاری سے کہنے لگا کہ جس رُوز سے تمھاری تصویر دیکھی ہے، خواب و خُورِش اور آرام میں نے اپنے اوپر حرام کیا ہے۔ اب جو خُدا نے یہ دن دِکھایا،

تو مخض بے گانہ ہو رہا ہوں۔ فرمانے لگی کہ میرا ابھی دل تمھاری طرف مائل ہے، کہ تم نے میری خاطر کیا کیا ہرج مرج اُٹھایا اور کس کس مشقتوں سے لے آئے ہو۔ خدا کو یاد کرو، اور مجھے بھول نہ جائیو؛ دیکھو تو پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کہ کر، ایسی بے اختیار ڈاڑھ مار کر روئی کہ ہچکی لگ گئی۔ اِدھر میرا یہ حال، اُدھر اُس کا وہ احوال؛ اِس میں مبارک کی نیند ٹوٹ گئی۔ وہ ہم دونوں مشتاقوں کا رونا دیکھ کر، رونے لگا اور بولا: خاطر جمع رکھو، ایک روغن میرے پاس ہے، اِس گل بدن کے بدن میں مل دوں گا؛ اُس کی بو سے ملکِ صادق کا جی ہٹ جائے گا، غالب ہے کہ تمھیں کو بخش دے۔

مبارک سے یہ تدبیر سُن کر دل کو ڈھارس ہو گئی، اُس کے گلے سے لگ کر لاڈ کیا اور کہا: اَے دادا! اب تو میرے باپ کی جگہ ہے، تیرے باعث میری جان بچی؛ اب بھی ایسا کام کر جس میں میری زندگانی ہو، نہیں تو اِس غم میں مر جاؤں گا۔ اُس نے ڈھیر سی تسلی دی۔ جب روز روشن ہوا، آواز جنوں کی معلوم ہونے لگی۔ دیکھا تو کئی خواص ملکِ صادق کے آئے ہیں اور دو سرِ پا و بھاری ہمارے لیے لائے ہیں اور ایک چوڈول، موتیوں کی توڑ پڑی ہوئی اُن کے ساتھ ہے۔ مبارک نے اُس نازنین کو وہ تیل مل دیا اور پوشاک پہنا، بناؤ کروا کر ملکِ صادق کے پاس لے چلا۔ بادشاہ نے دیکھ کر، مجھے بہت سرفراز کیا اور عزت و حرمت سے بٹھایا اور فرمانے لگا کہ تجھ سے میں ایسا سلوک کروں گا کہ کسو نے آج تک کسو سے نہ کیا ہو گا۔ بادشاہت تو تیرے باپ کی موجود ہے، علاوہ اب تو میرے بیٹے کی جگہ ہوا۔

بے توجّہ کی باتیں کر رہا تھا، اِتنے میں وُہ نازنین بھی رُو بہ رُو آئی۔ اُس روغن کی بُو سے یک بہ یک دِماغ پراگندہ(۱) ہوا اور حال بے حال ہوگیا۔ تاب اُس باس کی نہ لاسکا، اُٹھ کر باہر چلا گیا اور ہم دونوں کو بُلوایا اور مبارک کی طرف مُتوجّہ ہوکر فرمایا کہ کیُوں جی! خوب شرط بجا لائے! میں نے خبر دار کر دیا تھا کہ اگر خیانت کروگے، تو خفگی میں پڑوگے؛ یہ بُو کیسی ہے؟ اب دیکھو تمھارا کیا حال کرتا ہوں۔ بہت جِز بِز ہوا۔ مبارک نے مارے ڈر کے اپنا اِزار بند کھول کر دِکھا دیا کہ بادشاہ سلامت! جب حضور کے حُکم سے اِس کام کے ہم مُتعیّن ہوئے تھے؛ غُلام نے پہلے ہی اپنی عَلامت کاٹ کر، ڈِبیا میں بند کر کے، سَر بہ مُہر سرکار کے خزانچی کے سُپرد کر دی تھی اور مرہم سُلیمانی لگا کر روانہ ہوا تھا۔

مُبارک(۲) سے یہ جواب سُن کر، میری طرف آنکھیں نکال کے گھورا اور کہنے لگا: تو یہ تیرا کام ہے! اور طَیش میں آکر، مُنہ سے بُرا بھلا بکنے لگا۔ اُس وقت اُس کے بَت کہاو سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ شاید جان سے مجھے مروا ڈالے گا۔ جب میں نے اُس کے بشرے سے یہ دریافت کیا؛ اپنے جی سے ہاتھ دھو کر اور جان کھو کر، سَرِ(۴) غلاف مبارک کی کمر سے کھینچ کر مَلِکِ صادق کی توند میں ماری۔ چھری کے لگتے ہی نِہُڑا(۵) اور جھُومنے لگا۔ میں نے حیران ہو کر جانا کہ مُقرّر مر گیا۔ پھر اپنے دل میں خیال کیا کہ زخم تو ایسا کاری نہیں لگا، یہ کیا سبب ہوا! مَیں کھڑا دیکھتا تھا کہ وُہ زمین پر لوٹ لاٹ، گیند کی صورت بن کر آسمان کی طرف اُڑ چلا۔ ایسا بلند ہوا کہ آخر نظروں سے غائب ہوگیا۔ پھر ایک

پَل کے بعد، بجلی کی طَرح کڑکتا اور غُصّے میں کچھ بے معنی بَکتا ہوا نیچے آیا اور مجھے ایک لات ماری، کہ مَیں تیورا کر چاروں شانے چِت گر پڑا اور جی ڈوب گیا۔ خُدا جانے کتنی دیر میں ہُوش آیا۔ آنکھیں کھُول کر جو دیکھا، تو ایک ایسے جنگل میں پڑا ہوں کہ جہاں سِوائے کیکر(۱) اور ٹینٹی(۲) اور جھڑبیری(۳) کے درختوں کے کچھ اَور نظر نہیں آتا۔ اب اُس گھڑی عَقل کچھ کام نہیں کرتی کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ نااُمّیدی سے ایک آہ بھر کر ایک طرف کی راہ لی۔ اگر کہیں کوئی آدمی کی صورت نظر پڑتی، تو مَلِکِ صادِق کا نام پوچھتا۔ وُہ دیوانہ جان کر جواب دیتا کہ ہم نے تُو اُس کا نام بھی نہیں سُنا۔

ایک رُوز پہاڑ پر جا کر میں نے بھی(۴) اِرادہ کیا کہ اپنے تئیں گرا کر ضائع کروں۔ جُوں مُستَعِد(۵) گرنے کا ہوا، وُہی(۶) سوار صاحبِ ذُوالفقار(۷)، بُرقَع پُوش آپہنچا اور بُولا کہ کیوں تو اپنی جان کھوتا ہے! آدمی پر دُکھ درد سب ہوتا ہے۔ اب تیرے بُرے دِن گئے اور بھلے دِن آئے۔ جلد رُوم کو جا۔ تین شخص ایسے ہی آگے گئے ہیں، اُن سے مُلاقات کر اور وہاں کے سُلطان سے مِل۔ تم پانچوں کا مطلب ایک ہی جگہ ملے گا۔ اِس فقیر کی سَیر کا یہ ماجرا ہے جو عرض کیا۔ بارے بَشارت سے اپنے مَولا مُشکل کُشا کی(۸) مُرشِدوں کی حضُوری(۹) میں آپہنچا ہوں، اور بادشاہِ ظِلُّ اللہ کی بھی مُلازمت(۱۰) حاصل ہوئی؛ چاہیے کہ اب سب کی خاطِر جمع ہو۔

یِہ(۱۱) باتیں چار دَرویش اور بادشاہ آزاد بخت میں ہو رہی تھیں کہ اِتنے میں ایک مَحلّی(۱۲) بادشاہ کے محل(۱۳) میں سے دَوڑا ہوا آیا اور مُبارک باد کی تسلیمیں

بادشاہ کے حضور بجالایا اور عرض کی کہ اِس وقت شاہ زادہ پیدا ہوا کہ آفتاب و مہتاب اُس کے حُسن کے رُو بہ رُو شرمندہ ہیں۔ بادشاہ نے مُتعجّب ہو کر پوچھا کہ ظاہِر میں تو کِسو کو حَمَل* نہ تھا، یہ آفتاب کس کے بُرج حَمَل سے نمُود ہُوا؟ اُس نے اِلتماس کیا کہ ماہ رُو خواص[۱]، جو بہت دِنوں سے غَضَبِ بادشاہی میں پڑی تھی، بے کَسوں کی مانند ایک کونے میں رہتی تھی اور مارے ڈر کے اُس کے نزدیک کوئی نہ جاتا، نہ اَحوال پوچھتا تھا؛ اُس پر یہ فَضلِ اِلٰہی ہوا کہ چاند سا بیٹا اُس کے پیٹ سے پیدا ہوا۔

بادشاہ کو ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ شاید شادی[۲] مَرگ ہو جائے۔ چاروں فقیر نے بھی دُعا دی کہ بھلا بابا! تیرا گھر آباد رہے اور اُس کا قدم مُبارک ہو! تیرے سایے کے تلے بوڑھا بڑا ہو! بادشاہ نے کہا: یہ تمھارے قدم کی بَرَکت ہے؛ وَاِلاّ نہ، اپنے[۳] تو سان[۴] گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ اِجازت ہو تو جا کر دیکھوں۔ دَرویشوں نے کہا: بِسمِ اللہ، سِدھارِیے۔ بادشاہ محل[۵] میں تشریف لے گئے۔ شہ زادے کو گود میں لیا اور شُکر پَروَردگار کی جناب میں کیا، کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ وُونہیں چھاتی سے لگائے ہوئے لا کر فقیروں کے قدموں پر ڈالا۔ دَرویشوں نے دُعائیں پڑھ کر جھاڑ پھونک دیا۔ بادشاہ نے جَشن کی تیاری کی۔ دُوہری* نوبتیں جھڑنے[۶] لگیں۔ خزانے کا مُنہ کھول دیا۔ داد و دِہش سے ایک کوڑی کے مُحتاج کو لکھ پتی کر دیا۔ اَرکانِ دَولت جتنے تھے، سب کو دو چَند[۷] جاگیر و مَنصَب کے فرمان ہو گئے۔ جتنا لشکر تھا، اُنھیں پانچ بَرس کی طَلَب اِنعام ہوئی۔ مَشائخ اور اَکابِر[۸] کو

مددِ مَعاش[1] اور آلتمغا* عنایت ہُوا۔ بے نَواؤں کے مٹکے[2] اور ٹکڑ گداؤں کے چھلّے اَشرفی اور روپیوں کی کھچڑی سے بھر دیے۔ اور تین بَرَس کا خزانہ رَعیّت کو مُعاف کِیا؛ کہ جو کچھ بُوویں جوتیں، دونوں حصّے اپنے گھروں میں اُٹھا لے جائیں۔ تمام شہر میں، ہزاری بزاری کے گھروں میں، جہاں دیکھو وہاں تھئی تھئی ناچ ہو رہا ہے۔ مارے خوشی کے ہر ایک اَدنا[3] اعلا بادشاہِ وقت بَن بیٹھا۔

عَین شادی میں ایک بارگی اَندرُونِ مَحَل سے رُونے پیٹنے کا غُل اُٹھا۔ خَواصیں اور تُرکنیاں اور اُردا بیگنیاں اور مَحلّی، خوجے سر میں خاک ڈالتے ہوئے باہر نکل آئے اور بادشاہ سے کہا کہ جس وقت شہ زادے کو نہلا دُھلا کر دائی کی گود میں دِیا، ایک اَبر کا ٹکڑا آیا اور دائی کو گھیر لیا؛ بعد ایک دَم کے دیکھیں تو اَنگا بے ہوش پڑی ہے اور شہ زادہ غائب ہو گیا۔ یہ کیا قیامت ٹوٹی! بادشاہ یہ تعجّبات سُن کر حیران ہو رہا اور تمام مُلک میں واویلا پڑ گئی۔ دو دِن تلک کسو کے گھر ہانڈی نہ چڑھی۔ شہ زادے کا غم کھاتے اور اپنا لہو پیتے تھے۔ غَرَض زندگانی سے لاچار تھے، جو اِس طرح جیتے تھے۔

جب تیسرا دِن ہُوا، وُہی بادل پھر آیا اور ایک پنگھوڑا* جڑاؤ، موتیوں کی توڑ پڑی ہوئی لایا۔ اُسے محل میں رکھ کر آپ ہَوا ہُوا۔ لوگوں نے شہ زادے کو اُس میں اَنگوٹھا چوستے ہوئے پایا۔ بادشاہ بیگم نے جلدی، بَلائیں لے کر، ہاتھوں میں اُٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔ دیکھا تو کُرتا* آبِ رَواں کا،

مُوتیوں کا دَرداَمن ٹکا ہُوا [1] گلے میں ہے، اور اُس پر شَلُو کا تمامی کا پہنایا ہے، اور ہاتھ پانو [2] میں کھڑوے مُرَصَّع کے اور گلے میں ہَیکل نورَتَن کی پڑی ہے اور جھُنجھُنا، چُسنی، چَٹّے بَٹّے جَڑاؤ دَھرے ہیں۔ سب مارے خوشی کے واری پھیری ہونے لگیں اور دُعائیں دینے لگیں کہ تیری ما کا پیٹ ٹھنڈا رہے اور تو بُوڑھا آڑھا ہو۔

بادشاہ نے ایک بڑا محل نیا تعمیر کرواکر اور فرش بچھوا، اُس میں دَروِیشوں کو رکھا۔ جب سلطنت کے کام سے فَراغت ہوتی، تب آ بیٹھتے اور سب طَرح سے خدمت اور خبر گیری کرتے۔ لیکن ہر چاند کی نَوچَندی جُمیرات کو وُہی پارۂ اَبر آتا اور شہ زادے کو لے جاتا۔ بعد دُو دِن کے، تُحفہ کھلَونے اور سَوغاتیں ہر ایک مُلک کی اور ہر ایک قِسم کی شہ زادے کے ساتھ لے آتا، جن کے دیکھنے سے عقل اِنسان کی حَیران ہو جاتی۔ اِسی قاعدے سے بادشاہ زادے نے خَیرِیّت سے ساتویں [10] بَرَس میں پانو دِیا۔ عَین سال گرہ کے رُوز بادشاہ آزاد بخت نے فقیروں سے کہا کہ سائیں اَللہ! کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ شہ زادے کو کون لے جاتا ہے اور پھر دے جاتا ہے! بڑا تعجب ہے! دیکھیے انجام اِس کا کیا ہوتا ہے! دَروِیشوں نے کہا: ایک کام کرو، ایک شُقّہ، شَوقیہ [12] اِس مضمون کا لکھ کر شہ زادے کے گہوارے میں رکھ دو، کہ تمھاری مِہربانگی اور مَحبّت دیکھ کر اپنا بھی دل مُشتاق مُلاقات کا ہوا ہے؛ اگر دُوستی کی راہ سے اپنے اَحوال کی اِطّلاع دیجیے، تو خاطِر جمع [13] ہو اور حَیرانی بالکل [15] دفع ہو۔ بادشاہ نے مُوافِق صَلاح دَروِیشوں کے، اَفشانی کاغذ پر ایک رُقعہ [16] اِسی عبارت کا

تَرقیم کیا اور مَہدِ زرّیں میں رکھ دیا۔

شہ زادہ بہ مُوجب قاعِدۂ قدیم کے غائب ہوا۔ جب شام ہوئی، آزاد بخت دَرویشوں کے بستروں پر آکر بیٹھے اور کلمہ کلام ہونے لگا، ایک کاغذ لپٹا ہوا بادشاہ کے پاس آپڑا۔ کھول کر پڑھا تو جواب اُسی شُقّے کا تھا۔ یہی دو سطریں لکھی تھیں کہ ہمیں بھی اپنا مُشتاق جانیے۔ سواری کے لیے تخت جاتا ہے؛ اِس وقت اگر تشریف لائیے تو بہتر ہے، باہم مُلاقات ہو۔ سب اَسباب عَیش وطَرب کا مُہیّا ہے، صاحب ہی کی جگہ خالی ہے۔

بادشاہ آزاد بخت دَرویشوں کو ہمراہ لے کر تخت پر بیٹھے۔ وہ تخت، حضرت سُلیمان کے تخت کی مانند ہوا پر چلا۔ رَفتہ رَفتہ ایسے مکان پر جا اُترے کہ عمارتِ⑨ عالی شان اور تیّاری کا سامان نظر آتا ہے، لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں کوئی ہے یا نہیں۔ اِتنے میں کسُو نے ایک ایک سَلائی سُلیمانی سُرمے کی اُن پانچوں کی آنکھوں میں پھیر دی۔ دُو دُو بوندیں آنسو کی ٹپک پڑیں۔ پریوں کا اکھاڑا دیکھا کہ اِستقبال کی خاطر، گُلاب پاشیں لیے ہوئے اور رنگ بہ رنگ کے جوڑے پہنے ہوئے کھڑا ہے۔ آزاد بخت آگے چلے، تو دو رُویہ ہزاروں پری زاد مُؤدّب⑩ کھڑے ہیں۔ اور صَدر میں ایک تخت زُمرّد کا دَھرا ہے، اُس پر مَلکِ شہبال*، شاہ رُخ کا بیٹا، تکیے لگائے بڑے تزک سے بیٹھا ہے۔ اور ایک پری زاد لڑکی رُو بہ رُو بیٹھی شہ زادۂ بختیار* کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ اور دونوں بَغَل میں کُرسیاں اور صَندَلیاں قَرینے سے بِچھی ہیں، اُن پر عُمدہ پری زاد بیٹھے ہیں۔ مَلکِ شہبال، بادشاہ کو دیکھتے ہی،

سَرو قد اُٹھا اور تخت سے اُتر کر بغل گیر ہوا اور ہاتھ میں ہاتھ پکڑے اپنے برابر تخت پر لاکر بٹھایا اور بڑے تپاک اور گرم جوشی سے باہم گفتگو ہونے لگی۔ تمام رُوز ہنسی خوشی کھانے اور میوے اور خوش بوؤں کی ضیافت رہی اور راگ رنگ سُنا کیے۔

دوسرے دِن جب پھر دونوں بادشاہ جمع ہوئے، شہبال نے بادشاہ سے دَرویشوں کے ساتھ لانے کی کیفیت پوچھی۔ بادشاہ نے چاروں بے نواؤں کا ماجرا، جو سُنا تھا، مُفَصَّل بیان کیا اور سفارش کی اور مدد چاہی، کہ انھوں نے اِتنی محنت اور مصیبت کھینچی ہے، اب صاحب کی توَجُّہ سے اگر اپنے اپنے مقصد کو پہنچیں تو ثوابِ عظیم ہے اور یہ مُخلص بھی تمام عُمر شُکر گُزار رہے گا۔ آپ کی نظرِ توَجُّہ سے اِن سب کا بیڑا پار ہوتا ہے۔ مَلکِ شہبال نے سُن کر کہا: بہ سَرو چشم، مَیں تمھارے فرمانے سے قاصِر نہیں۔ یہ کہ کر، نگاہِ گرم سے دِیوؤں اور پریوں کی طرف دیکھا اور بڑے بڑے جِنّ، جو جہاں سردار تھے، اُن کو نامے لکھے کہ اِس فرمان کو دیکھتے ہی اپنے تئیں حضورِ پُرنور میں حاضر کرو۔ اگر کسی کے آنے میں توَقُّف ہوگا، تو اپنی سزا پاوے گا اور پکڑا ہوا آوے گا۔ اور آدم زاد، خواہ عورت خواہ مرد، جس کے پاس ہو، اُسے اپنے ساتھ لیے آوے۔ اگر کوئی پوشیدہ کر رکھے گا اور ثانئ الحال ظاہر ہوگا، تو اُس کا زن و بچّہ کولھو میں پیڑا جائے گا اور اُس کا نام نشان باقی نہ رہے گا۔

یہ حُکم نامہ لے کر دِیو چاروں طرف مُتعَیّن ہوئے۔ یہاں دونوں

بادشاہوں میں صُحبت گرم ہوئی اور باتیں اِختلاط کی ہونے لگیں۔ اُس میں مَلِکِ شَہبال، دَرویشوں سے مُخاطِب ہو کر بُولا کہ اپنے تئیں بھی بڑی آرزو لڑکے ہونے کی تھی اور دِل میں یہ عَہد کیا تھا کہ اگر خُدا بیٹا دے یا بیٹی؛ تو اُس کی شادی، بَنی آدم کے بادشاہ کے یہاں جو لڑکا پیدا ہو گا، اُس سے کروں گا۔ اِس نِیّت[1] کرنے کے بعد[2] معلوم ہوا کہ بادشاہ بیگم پیٹ سے ہیں۔ بارے دِن اور گھڑیاں اور مہینے گنتے گنتے، پورے دِن ہوئے اور یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ مُوافق وعدے کے، تلاش کرنے کے واسطے عالَمِ جِنّیات[3] کو میں نے حُکم کِیا[4]: چار دانگِ[5] دُنیا میں جُستجُو کرو؛ جس بادشاہ یا شَہنشاہ کے یہاں فرزند پیدا ہوا ہو، اُس کو بِجِنسِہٖ اِحتِیاط سے[6] جلد اُٹھا کر لے آؤ۔ وُہ ہیں[7] بہ مُوجِب فرمان کے پری زاد چاروں سَمت پَراگندہ ہوئے۔ بعد دیر کے اِس شہ زادے کو میرے پاس لائے۔

میں نے شُکر خُدا کا کیا اور[8] اپنی گود میں لے لیا۔ اپنی بیٹی سے زیادہ اِس کی مَحبّت میرے دل میں پیدا ہوئی۔ جی نہیں چاہتا کہ ایک دَم نظروں سے جُدا کروں؛ لیکن اِس خاطِر بھیج دیتا ہوں کہ اگر اِس کے ما باپ نہ دیکھیں گے، تو اُن کا کیا اَحوال ہو گا؛ لِہٰذا ہر مہینے میں ایک بار مَنگا لیتا ہوں۔ کئی دِن اپنے نزدیک رکھ کر پھر بھیج دیتا ہوں۔ اِنشاءَاللہ تعالیٰ، اب ہمارے تمھارے مُلاقات ہوئی، اِس کی کَتخُدائی کر دیتا ہوں۔ مَوت حَیات سب کو لگی پڑی ہے؛ بَھلا جیتے جی اِن کا سہرا دیکھ لیں۔

بادشاہ آزاد بخت یہ[9] باتیں مَلِکِ شَہبال کی سُن کر اور اُس کی

خوبیاں دیکھ کر، نہایت محظوظ ہوئے اور بولے: پہلے ہم کو شہ زادے کے غائب ہوجانے اور پھر آنے سے عجب عجب طرح کے خطرے دِل میں آتے تھے، لیکن اب صاحب کی گفتگو سے تسلی ہوئی۔ یہ بیٹا اب تمھارا ہے؛ جس میں تمھاری خوشی ہو، سو کیجے۔ غرض دونوں بادشاہوں کی صحبت مانند شکر، شیر کے رہتی اور عیش کرتے۔ دس پانچ دِن کے عرصے میں بڑے بڑے بادشاہ گلستانِ اِرم کے اور کوہستان کے اور جزیروں کے، جن کی طلب کی خاطر لوگ تعینات ہوئے تھے، سب آکر حضور میں حاضر ہوئے۔ پہلے مَلِکِ صادق سے فرمایا کہ تیرے پاس جو آدم زاد ہے، حاضر کر۔ اُس نے نپٹ غم غصہ کھاکر، لاچار اُس گُل عِذار کو حاضر کیا۔ اور وِلایتِ عُمان کے بادشاہ سے شہ زادی جِنّ کی (جس کے واسطے شہ زادہ مُلکِ نیم روز کا گاؤ سوار ہوکر سودائی بنا تھا) مانگی۔ اُس نے بھی بہت سی عُذر مَعذِرَت کر کے حاضر کی۔ جب بادشاہِ فرنگ کی بیٹی اور بہزاد خاں کو طلب کیا، سب مُنکرِ پاک ہوئے اور حضرت سُلیمان کی قسم کھانے لگے۔ آخر دریاے قُلزُم کے بادشاہ سے جب پوچھنے کی نوبت آئی، تو وہ سر نیچا کر کے چُپ ہو رہا۔ مَلِکِ شہپال نے اُس کی خاطر کی اور قسم دی اور اُمّید وار سرفرازی کا کیا، اور کچھ دھونس دھڑکا بھی دیا؛ تب وہ بھی ہاتھ جوڑ کر عرض کرنے لگا کہ بادشاہ سلامت! حقیقت یہ ہے کہ جب بادشاہ اپنے بیٹے کے اِستقبال کی خاطر دریا پر آیا اور شہ زادے نے مارے جلدی کے گھوڑا دریا میں ڈالا؛ اِتّفاقاً میں اُس روز سیر و شکار کی خاطر نکلا تھا، اُس جگہ میرا گزر ہوا۔ سواری

کھڑی کر کے یہ تماشا دیکھ رہا تھا، اِس میں شہ زادی کو بھی گھوڑی دریا میں لے گئی۔ میری نگاہ جو اُس پر پڑی، دل بے اختیار ہوا۔ پری زادوں کو حکم کیا کہ شہ زادی کو بہ مع گھوڑی لے آؤ۔ اُس کے پیچھے بہزاد خاں نے گھوڑا پھینکا۔ جب وُہ بھی غوطے کھانے لگا؛ اُس کی دلاوری اور مردانگی پسند آئی، اُس کو بھی ہاتھوں ہاتھ پکڑ لیا۔ اُن دونوں کو لے کر میں نے سواری پھیری۔ سو وِسّے دونوں صحیح سلامت میرے پاس موجود ہیں۔

یہ احوال کہہ کر، دونوں کو رُو بہ رُو بُلایا۔ اور سُلطانِ شام کی شہ زادی کی تلاش بہت کی اور سبھوں سے بہ سختی و مُلایمت اِستفسار کیا؛ لیکن کِسو نے حامی نہ بھری اور نہ نام و نشان بتایا۔ تب مَلِکِ شہبال نے فرمایا کہ کوئی بادشاہ یا سردار غیر حاضر بھی ہے، یا سب آ چُکے؟ جنوں نے عرض کی کہ جہاں پناہ! سب حضور میں آئے ہیں، مگر ایک مُسلسل جادو، جس نے کوہِ قاف کے پردے میں ایک قلعہ جادو کے علم سے بنایا ہے، وُہ اپنے غرور سے نہیں آیا ہے اور ہم غلاموں کو طاقت نہیں جو بہ زور اُس کو پکڑ لاویں۔ وُہ بڑا قلب مکان ہے اور وُہ خود بھی بڑا شیطان ہے۔

یہ سُن کر، مَلِکِ شہبال کو تیش آیا اور لڑاکی فوج جنوں اور عفریتوں اور پری زادوں کی تعینات کی اور فرمایا کہ اگر راستی میں اُس شہ زادی کو ساتھ لے کر حاضر ہو، فبِہا؛ وَ اِلّا نہ، اُس کو زیر و زبر کر کے، مشکیں باندھ کر لے آؤ اور اُس کے گڑھ اور مُلک کو نیست نابود کر کے، گدھے کا ہل پھروا دو۔ وُو نہیں حکم ہوتے ہی، ایسی کتنی فوج روانہ ہوئی کہ ایک آدھ دن کے عرصے میں

وَیسے جُوش خرُوش والے سَرکَش کو حلقہ بہ گوش کرکے پکڑ لائے اور حضور میں دَست بَستہ کھڑا کیا۔ مَلکِ شہبال نے ہر چند سَرزَنش کرکر پوچھا، لیکن اُس مَغرور نے سِوائے ناںہ کے، ہاں نہ کی۔ نہایت کو، غُصّے ہوکر فرمایا کہ اِس مَردُود کے بَند بَند جُدا کرو اور کھال کھینچ کر بُھس بھرو۔ اور پری زاد کے لشکر کو تعیّن[۲] کیا کہ کوہِ قاف میں جاکر، ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر پیدا کرو۔ وُہ لشکرِ مُتَعَیّنَہ شہ زادی کو بھی تلاش کرکے لے آیا اور حضور میں پہنچایا۔ اُن سب اَسیروں نے اور چاروں فقیروں نے مَلکِ شہبال کا حُکم اور اِنصاف دیکھ کر دُعائیں دیں اور شاد ہوئے۔ بادشاہ آزاد بخت بھی بہت خوش ہوا۔ تب مَلکِ شہبال نے فرمایا کہ مَردوں کو دیوانِ خاص میں اور عورتوں کو بادشاہی محل[۳] میں داخل کرو۔ اور شہر میں آئینہ بندی کا حُکم کرو، اور شادی کی تیاری جلدی ہو۔

گویا حُکم کی دیر تھی۔ ایک رُوز نیک ساعت اور مُبارَک مہورت دیکھ کر، شہ زادہٗ بَختیار کا عَقد اپنی بیٹی روشن اختر سے باندھا، اور خواجہ زادہٗ یمن کو دِمشق کی شہ زادی سے بیاہا[۷]، اور مُلکِ فارس کے شہ زادے کا نکاح بَصرے کی شہ زادی سے کردیا، اور عَجَم کے بادشاہ زادے کو فرنگ کی مَلِکہ سے مَنسُوب کیا، اور نیم رُوز کے بادشاہ کی بیٹی کو بہزاد خاں کو دیا، اور شہ زادہٗ نیم رُوز کو جِن کی شہ زادی حوالے کی، اور چین کے شہ زادے کو اُس پیر مردِ عَجمی کی بیٹی سے (جو مَلِکِ صادِق کے قبضے میں تھی) کَتخُدا کیا۔ ہر ایک نامُراد بہ دَولت[۱۰] مَلِکِ شہبال کی[۱۱]، اپنے اپنے مقصد اور مُراد کو پہنچا۔ بعد اِس کے چالیس دِن

تلک جَشن فرمایا اور عَیش وعشرت میں رات دِن مَشغول رہے۔

آخر مَلِکِ شہبال نے ہر ایک بادشاہ زادے کو تحفے اور سوغاتیں اور مال اَسباب دے دے کر، اپنے اپنے وَطَن کو رُخصت کیا۔ سب بہ خوشی و خاطِر جَمعی روانہ ہوئے اور بہ خَیر و عافیّت جا پہنچے اور بادشاہت کرنے لگے؛ مگر ایک بہزاد خاں اور خواجہ زادہ یَمَن کا، اپنی خوشی سے، بادشاہ آزاد بخت کی رِفاقت میں رہے۔ آخر یَمَن کے خواجہ زادے کو خانساماں اور بہزاد خاں کو میر بَخشی شہ زادۂ صاحِبِ اِقبال یعنے بَختیار کی فَوج کا کیا۔ جب تلک جیتے رہے، عَیش کرتے رہے۔

اِلٰہی! جس طَرح یہ چاروں دَرویش اور پانچواں بادشاہ آزاد بخت اپنی مُراد کو پہنچے، اِسی طَرح ہر ایک نامُراد کا مقصدِ دِلی اپنے کَرَم اور فَضل سے بَرلا، بہ طُفَیل پَنجتَنِ پاک، دُوازدَہ اِمام، بہ چہاردَہ معصوم عَلَیہِمُ الصَّلوٰۃ وَالسَّلام کے۔ آمین یا اِلٰہ العالَمین۔

جب یہ کتاب فَضلِ اِلٰہی سے اِختِتام کو پہنچی، جی میں آیا کہ اِس کا نام بھی ایسا رکھوں کہ اُسی میں تاریخ نکلے۔ جب حساب کیا، تو بارہ سَو پندرہ ہِجری کے آخرِ سال میں کہنا شُروع کیا تھا۔ باعث عَدَمِ فُرصت کے بارہ سَو سترہ سَنہ کی اِبتِدا میں انجام ہوئی۔ اِس فِکر میں تھا کہ دِل نے کہا "باغ و بہار" اچھا نام ہے، کہ ہَم نام و ہَم تاریخ اِس میں نکلتی ہے؛ تب میں نے یہی نام رکھا۔ جو کوئی اِس کو پڑھے گا، گُویا باغ کی سَیر کرے گا۔

بلکہ باغ کو آفتِ خزاں کی بھی ہے، اور اِس کو نہیں؛ یہ ہمیشہ سر سبز رہے گا۔

مُرتّب ہوا جب یہ باغ و بہار
تھے سنہ بارہ سَو سترہ دَرشُمار (۲)

کرو سیراب اِس کی تم رات دِن
کہ ہے نام و تاریخ "باغ و بہار"

خزاں کا نہیں اِس میں آسیب کچھ
ہمیشہ تَر و تازہ ہے یہ بہار

مرے خونِ دل سے یہ سیراب ہے
اور لختِ جگر کے ہیں سب بَرگ و بار (۴)

مجھے بھول جاویں گے سب بعدِ مَرگ
رہے گا مگر یہ سخن (۵) یادگار

اِسے جو پڑھے، یاد مجھ کو کرے
یہی قاریوں سے مرا ہے قَرار

خطا گر کہیں ہو، تو رکھیو مُعاف
کہ پھولوں میں پوشیدہ رہتا ہے خار

ہے اِنساں مُرکّب زِ سَہو و خَطا
یہ چوکے گا، ہر چند ہو ہُوشیار

میں اِس کے سِوا چاہتا کچھ نہیں
یہی ہے دُعا میری اَے کِردگار

تری یاد میں مَیں رہوں دَم بہ دَم
کٹے اِس طَرح میرا لَیل و نَہار

نہ پُرسِش کی سختی ہو مجھ پر کبھو
نہ شبِ گُور کی اور نہ رُوزِ شُمار

تو کَونَین میں لُطف پر لُطف رکھ
خُدایا! بہ حقِّ رَسولِ کِبار

تمام شُد (۶)

رشید حسن خاں شاہ جہاں پور میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں فوجی ملازمت خاندانی روایت بن چکی تھی۔ تعلیمی اسناد کے مطابق اُن کی تاریخ ولادت ۱۰ر جنوری ۱۹۳۰ء ہے۔ اُن کے والد امیر حسن خاں کٹّر قوم پرست تھے۔ تحریکِ عدم تعاون کے زمانے میں اُنھوں نے سرکاری ملازمت سے سبک دوشی حاصل کرلی تھی اور اُس کے بعد سے سرکاری ملازمت کو مسلمانوں کے لیے ناجائز سمجھتے رہے۔ رشید حسن خاں نے سب سے پہلے درسِ نظامی کی تعلیم مدرسۂ بحرالعلوم شاہ جہاں پور میں حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء تک وہ فیلڈ ورکر کی حیثیت سے مقامی ٹریڈ یونین سے منسلک رہے۔ ۱۹۵۹ء کے وسط تک اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول شاہ جہاں پور میں اُردو فارسی کے اُستاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اُس کے بعد دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہوگئے۔

ادبی تحقیق، لغت، املا، قواعدِ زبان، قواعدِ شاعری، عروض اور تدوین اُن کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ اُن کی کتاب 'اُردو املا' اپنے موضوع پر سب سے مفصّل اور بہت وقیع تصنیف ہے۔ تلفّظ اور قواعدِ شاعری سے متعلق اُن کی مشہور کتاب 'زبان اور قواعد' ہے، جو دو بار شائع ہوچکی ہے۔ اُن کا ایک تاریخی کام مقدمہ 'کلامِ ناسخ' ہے، جس میں پہلی بار یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ناسخ سے تحریکِ اصلاحِ زبان کا انتساب درست نہیں۔ جن قواعد کو ناسخ سے منسوب کیا گیا ہے، اُن کے وضع کرنے والے دراصل رشک [تلمیذِ ناسخ] تھے۔

اُن کی دوسری تصانیف میں اُردو کیسے لکھیں، تلاش و تعبیر [تنقیدی مضامین کا مجموعہ] اور ادبی تحقیق خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ تحقیق میں وہ قاضی عبدالودود کی روایت کے پیرو تھے اور تدوین میں مولانا عرشی کو اپنا معنوی اُستاد مانتے تھے۔ وہ ہمارے زمانے کے سب سے زیادہ حق گو اور بے باک محقق تھے، جن کے تبصروں نے احتساب کی روایت کو تسلسل بخشا ہے اور زندہ رکھا ہے۔

اُن کو بہت سے اعزازات سے نوازا گیا تھا، جن میں دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ [۱۹۷۷ء] اور غالب ایوارڈ [۱۹۷۹ء] شامل ہیں۔ وہ انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ، مجلّہ 'غالب نامہ' کی مجلسِ ادارت اور ترقی اُردو بورڈ کی املا کمیٹی کے رُکن تھے۔ رشید حسن خاں صاحب آج ہمارے درمیان نہیں ہیں ۲۶ر فروری ۲۰۰۶ء کو وہ خدا کو پیارے ہوگئے۔

ISBN : 81-7160-040-9